زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

اُردو سہ ماہی

ثـالـث

کتابی سلسلہ.....۲

جلد- ۱ شمارہ -۲

جنوری ۲۰۱۴ء تا مارچ ۲۰۱۴ء

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91-9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.in

www.salismagazine.com

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے تاج آفسیٹ پریس سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۱۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۲۵/روپے)

سالانہ : .....۴۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۵۰۰/روپئے)

خصوصی تعاون : .....دس ہزار روپئے یا ۲۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	ساٹھ (۶۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پینتس (۳۵) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پینتش (۳۵) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو (۱۰۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	دس (۱۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
قطر:	:	ایک سو (۱۰۰) ریال
کویت	:	بیس (۲۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار (۲۰۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتہ پر رقم بھیجی جاسکتی ہے۔
TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Union Bank of India
Munger Branch
A/c No. 389002010003800
IFSC Code-UBIN0538906

◄◄ ● ►►

فہرست

	اداریہ	اداریہ	۵
	مہمان اداریہ	شفیق احمد شفیق	۷
	حمد	سعید رحمانی	۱۱
	نعت پاک	عزیز فیصل	۱۲
تنقید/خصوصی مطالعہ	اردو شعراء کے انتقادی زاویئے	ڈاکٹر منظر اعجاز	۱۳
	'مکان' طاقت سے نجات کا تخلیقی منشور	نسیم سید	۲۰
	ناول، بین الاقوامی تاریخ.....	یونس خان	۲۷
	افسانوی ادب	ابوفہد	۳۱
	متن اور تجربہ	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۳۹
افسانے	ڈھکنے	اقبال حسن خاں	۴۱
	تین انچ کا سورما	قاضی طاہر حیدر	۴۹
	آٹھواں سمندر	قرب عباس	۵۹
	افواہ	ابرار مجیب	۶۴
	بے درماں	سلمیٰ جیلانی	۷۱
	بوڑھا اور سمندر	طلعت زہرا	۷۶
	موت کا دوسرا رقص	زین سالک	۸۰
	برزخ	ثناء غوری	۸۶
	گڑ کی ڈلی	امین بھایانی	۹۱
	کھیل	فرحین جمال	۹۶
	انجام کار	نوشابہ خاتون	۱۰۱
خاکہ	رسیلے کٹیلے.....احمد عمر شریف	ممتاز رفیق	۱۰۵
ناول کا ایک باب	جسے میر کہتے ہیں صاحبو!	حبیب حق	۱۱۱
ناولٹ	شریف زادی	م۔ص۔ایمن	۱۲۴
غزلیں	سید انور جاوید ہاشمی/سجاد ہاشمی/افتخار حیدر/عزیز نبیل /طارق متین/راشد طراز/عارف شفیق/فہیم جوگا پوری/ ظفر صدیقی/فوزیہ اختر		۱۵۰
غزلیں، کشمیر سے	رفیق راز/نذیر آزاد/علمدار عدم		۱۵۸
نظمیں	صبا اکرام/ثروت زہرا/پرویز شہریار/ایس۔ایم۔عباس/نوشی قیصر		۱۶۷
دوھے	دوہے	پرویز اختر	۱۷۴
انٹرویو	راشد اشرف	فرزانہ اعجاز	۱۷۶
رپورٹ	'ثالث' کی رسم اجرا	ادارہ	۱۸۵
ثالث پر تبصرے	حقانی القاسمی/سلمیٰ جیلانی/علی حیدر ملک/ڈاکٹر افشاں ملک/ رضی شہاب		۱۸۶
تبصرے	بنجر زمین/حمید شاہد، نئی پرانی کتابیں، پیغام آفاقی، بقلم خود/اقبال حسن آزاد، یو۔ڈیم۔سالا/امتیاز پراچہ، لیمی نیڈ گرل/اقبال حسن آزاد، ہم تماشا/اقبال حسن آزاد، روشنائی/اقبال حسن آزاد		۲۰۲
مکتوبات	شفیع مشہدی/ڈاکٹر قمر جہاں/پیغام آفاقی/صا اکرام/ حسن جمال/احمد سہیل/فہیم جوگا پوری/ارشد محمود ہاشمی/ صغیر رحمانی/سلیم انصاری/عارف شفیق/ایس۔ایم۔عباس/ عمر احمد بنگش/سعید رحمانی/نعیم بیگ/ محمد نعیم دیپالپور/ عبد الوہاب قاسمی/مسعود حساس/ مشتاق احمد نوری/ پرویز اختر/دیپک بدکی/فوزیہ اختر/ڈاکٹر محمد حُسین		۲۱۱
وفیات	معراج فیض آبادی/بلراج کومل/راجندر یادو/ظفر عدیم/ شکیب ایاز		۲۲۳

اعزازی کاپی مانگ کر ہمیں شرمندہ نہ کریں، شکریہ!

اداریہ

ہر قوم کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کو ختم کرنا ہے تو اس کی زبان کو ختم کردو، قوم اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ دشمنان اردو کئی دہائیوں سے اس شیریں اور بے بدل زبان کو ختم کرنے کی سازشیں کئے چلے جا رہے ہیں اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ چند ناعاقبت اندیش لوگ، جن کی مادری زبان اردو ہے، وہ بھی دانستہ اور نادانستہ طور پر انھی عناصر کا ساتھ دے رہے ہیں اور اردو کی بیخ کنی کئے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں اردو کا کوئی رسالہ نکالنا جان جوکھم کا کام ہے۔ لیکن فرہاد صفت عاشقان ادب نفع و نقصان کی پرواہ کئے بغیر اس کار عظیم میں لگے ہوئے ہیں۔ گزشتہ صدی میں اردو کے کئی رسائل نکلے اور بند ہو گئے، مگر چند رسائل ابھی تک پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ پچھلے چند برسوں میں آسمان ادب پر کئی نئے رسالے طلوع ہوئے ہیں اور ان کا رنگ و آہنگ اور تیور دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ رسائل بہت دور تک جائیں گے۔ لیکن اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہم اردو کے رسائل خرید کر پڑھیں۔ اردو سماج میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ:

مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اور ساری برائی کی جڑ یہی سوچ ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ:

''جو قوم سستی کتابیں خریدنے میں شرم اور مہنگے جوتے خریدنے میں فخر محسوس کرے اسے کتابوں سے زیادہ 'جوتوں' کی ضرورت ہے۔''

اگر آپ کو واقعی رسالے پڑھنے کا شوق ہے تو آپ اسے خرید کر پڑھیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ روزانہ' سینکڑوں بلکہ ہزاروں روپئے پان، بیڑی، سگریٹ، تمباکو، گٹکھا اور شراب میں اُڑا دیتے ہیں لیکن سو پچاس روپئے کا رسالہ خریدنے میں ان کی جان نکلنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ادبی رسالے چند شماروں کے بعد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں بلکہ بعضے تو ایک ہی شمارے کے بعد صفحۂ ہستی سے غائب ہو جاتے ہیں:

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے

ہر رسالے کی ایک پالیسی ہوتی ہے اور اسی پر کاربند رہ کر وہ رسالہ زندہ رہ سکتا ہے۔ 'ثالث' کی بھی ایک پالیسی ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی رسائل اور اخبارات میں شائع شدہ تخلیقات اس میں شائع نہیں ہونگی۔ اور ہمیں اسی بنا پر بہت منتخب چیزوں کو نکال دینا پڑا۔ لہذا دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ صرف ایسی تخلیقات ارسال کریں جو

کبھی بھی کسی بھی ہندوستانی اخبار یا رسالے میں شائع نہیں ہوئی ہوں۔ اور اگر کسی نے ہمیں دھوکے میں رکھ کر ایسی حرکت کی تو اس کے لئے 'ثالث' کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے جائیں گے، البتہ 'گوشے اور 'انتخاب' پر یہ شرط لاگو نہیں ہوگی۔ دوسری پالیسی یہ ہے کہ ایک شمارے میں کسی بھی تخلیق کار کی صرف ایک ہی چیز شائع ہوگی اور اس تخلیق کار کی دوسری تخلیق کم از کم ایک رسالے کے بعد ہی شائع کی جائے گی، شکریہ!

ہمارے اردو سماج میں جو دو غلط فہمیاں عام طور پر پائی جاتی ہیں.....اول تو یہ کہ اردو لب گور ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ ہمیں اس کی تجہیز و تکفین کرنی پڑے گی، لہذا بعضوں نے اس کے لئے تو کفن کا بھی انتظام کر رکھا ہے اور گورکن سے بھی بات کر لی ہے۔ اور دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ اردو میں اچھے افسانے نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ 'ثالث' کے اجرا کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ اردو دن بدن عالمی زبان کا درجہ حاصل کرتی جا رہی ہے اور اس کے جاننے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، یعنی:

سارے عالم پر ہوں میں 'چھائی' ہوئی

لیکن اس کی آخری رسوم کا انتظام وہی لوگ کر رہے ہیں جنہیں عرف عام میں 'مفت خورہ' کہا جاتا ہے اور جو اردو کے نام پر خرچ کرنے میں سبکی محسوس کرتے ہیں۔

ایک اور غلط فہمی 'ثالث' کے سلسلے میں یہ پھیلائی جا رہی ہے کہ یہ خالص افسانوی ادب کا رسالہ ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ہم افسانوں کے ساتھ ساتھ بہترین غزلیں، نظمیں اور مضامین بھی شائع کر رہے ہیں۔ اس شمارے میں تو 'دوہے' بھی شامل ہیں اور ایک بہترین خاکہ بھی۔ ہم نے سوچا تھا کہ اداریئے میں مشمولات پر ایک تعارفی نوٹ لگا دیں، جیسا کہ اکثر رسائل کے مدیر کرتے رہے ہیں لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ اس طرح بہت سارے قارئین صرف اداریہ پڑھنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ٹریلر دیکھ کر ہی پوری فلم کا مزہ لے لیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ پورا رسالہ پڑھیں اور اپنی قیمتی آرا سے ہمیں نوازیں۔ اس شمارے میں شامل تحریروں کو پڑھئے اور مصنفین کو دل سے داد دیجئے۔ یہ نگارشات کسی خاص نظریئے یا تحریک کے زیر اثر نہیں لکھی گئی ہیں۔ انہیں رومان پسندی، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت یا نجات پسندی جیسی حد بندیوں کے تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ زندہ اور متحرک تحریریں ہیں۔ ہم انہیں شائع کرنے میں خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

'تحفۂ خاص' کے تحت اس بار کشمیر کی چند غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ غزلیں ہمیں جناب ذوالفقار نقوی نے ارسال کی ہیں۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ (ادارہ)

نوٹ: گذشتہ شمارے میں ہم نے پروفیسر لطف الرحمان پر گوشہ شائع کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اسے موخر کرنا پڑا۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ یہ گوشہ آئندہ شمارے میں شامل ہو۔

◀◀ ● ▶▶

● شفیق احمد شفیق

ادب اور عصر نو کے تقاضے

زندگی مجموعہ ہے بہت ساری اقدار کا۔ چونکہ ادب حیات و کائنات کا ترجمان اور مظہر ہوتا ہے، اس لئے ادب کی شریانوں میں بھی زندگی کی تمام قدروں کا لہو رواں دواں نظر آتا ہے۔ قدریں، معاشی بھی ہوتی ہیں اور اقتصادی بھی، قدریں سیاسی بھی ہوتی ہیں سماجی بھی۔ قدریں تہذیب و تمدن کی بھی ہوتی ہیں اور سائنس و تاریخ کی بھی۔ مگر ان تمام قدروں کی آئینہ داری کا انحصار ادیبوں اور شاعروں کے ماحول اور عالمی صورتِ حال پر ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ لمحہء موجود کی صورت حال کے ردعمل میں قلمکار کا مجموعی رویّہ کیا ہے۔ اس نے دنیا کے چھوٹے چھوٹے وقوعوں اور بڑے بڑے تغیّرات کو کتنا اور کس طرح اپنے اندر جذب کیا ہے۔ اور اس کا خارجی تجربہ اس کی داخلی دنیا سے ہم آہنگ ہو کر تخلیقی فعالیت کے کس منطقے پر نمود و ظہور کا باعث بنا ہے۔ مگر یہ ساری قدریں دو بنیادی قدروں کی شاخیں ہیں۔ یعنی منفی قدریں اور مثبت قدریں۔ دنیا کی ساری قدریں انھیں دو اقدار کے حوالوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ جو ادب زندگی کی نامیاتی قدروں کا امین، زندگی افروز رجحان کا علمبردار اور مثبت اوصاف کا حامل ہوتا ہے وہ ادب عصرِ نو کا ادب کہلاتا ہے۔

رات اور دن کا ظہور، طلوع و غروبِ آفتاب، چاند کا نکلنا اور اور معدوم ہونا، ستاروں کا ابھرنا اور ڈوبنا اور موسموں کا بدلنا یہ وہ عوامل ہیں جو ہم کو اس بات کا ادراک کراتے ہیں کہ تبدیلی اور تغیر قانونِ فطرت ہے۔ جس طرح فطرت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اسی طرح سماج اور معاشرے میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ سماج میں موجود مختلف اداروں اور شعبوں میں بھی فرسودگی کو ترک کر کے تازگی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ کارکردگی، طریقے اور ضابطے میں بدلاؤ لانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' تو اس میں شمہ برابر بھی جھوٹ نہیں۔

ادب تخلیق کرنا، اسے قاعدے اور سلیقے سے پیش کرنا اور اسے قارئین، شائقین اور ناقدین تک پہنچانا بھی ادیب کی ذمہ داری ہے اور اور اس کا تعلق بھی عصری تقاضے سے ہے۔ اگر کوئی اہم ترین تخلیق جو اپنے عصر سے گہرا تعلق رکھتی ہے تو اس کا، اس کے عہد میں منظر عام پر آنا ضروری ہے۔ ورنہ اس تخلیق کی اہمیت کا خون ہو جائے گا۔ مگر یہ کام ادیب تنہا سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لئے اسے متعلقہ سارے

اداروں سے رابطہ قائم رکھنا ہوگا۔ سب کے تعاون ہی سے کوئی جریدہ یا کوئی کتاب بامعنی انداز میں منصۂ شہود پر آسکتی ہے۔ لہذا زندگی کا سفر ہو یا ادب کا، تنہا طے نہیں کیا جاسکتا۔ بقول محمود واجد:

> ''.....کوئی بامعنی سفر اسی وقت ممکن ہے جب وہ تنہا نہ ہو۔ تنہائی کو ہم وسیع معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اپنے خالق حقیقی کے فیض سے لی ہوئی تنہائی جس کا ہر لمحہ امکان بدوش ہوتا ہے.....اپنے اندر کی خفیہ کارکردگی کا جائزہ لیں کہ کس طرح ہم امکانات کے در وا کر سکتے ہیں۔ تخلیق کار کی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں، چھوٹے دائروں سے بڑے دائروں تک جاسکتے ہیں اور لاحاصلی کے دکھ سے کنارہ کش ہو سکتے ہیں اور معنویت کے دائروں میں خود کو فعال بنا کر ہی معنی کی وسعتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں.....یاد رکھئے کہ تنہا آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ تخلیقی عمل کو بھی کسی تفاعل کے بغیر مکمل نہیں کر سکتے۔''
>
> (' آئندہ' کراچی جنوری تا جون ۲۰۰۹ء کے اداریئے سے اقتباس)

ہم ضرورتوں کے سبب تبدیلی لاتے بھی ہیں خود تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بھی تبدیل ہونے پر مائل کرتے ہیں۔ سکون اور یکسانیت کی زندگی دیرپا نہیں۔ اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لہذا جب، موسموں میں، دن رات میں اور اسی طرح دنیا کے دیگر عوامل میں تغیر رونما ہوتے ہیں اور یہ کہ تبدیلی قانونِ فطرت بھی ہے تو ادب کے رویے، اسلوب، موضوع و مواد اور اس کے تقاضے کیسے نہیں بدلیں گے۔ اور اس میں کیسے انجماد اور بے کیفی قائم رہ سکتی ہے۔ سماج بدلتا ہے تو انسان بھی بدلتا ہے اور انسان اپنے بدلنے کے عمل کے ساتھ سماج کو بھی بدلنے پر مجبور کرتا ہے۔ بلکہ وہ تو تاریخ کا رخ بھی موڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ادب تخلیق کرنے والے کے اندر جب تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے تو اس کی تخلیقی فعالیت، اسلوب، آدرش، لفظیات، علامات، موضوعات بھی بدل جاتے ہیں۔ اس طرح ادیبوں اور اور شاعروں میں خارجی تغیر کے ساتھ ساتھ داخلی تغیر بھی ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ ان دونوں دنیاؤں میں تبدیلی رونما ہونے سے ادب بھی تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ اس کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔

ادب ماضی سے بھی کسبِ فیض کرتا ہے، تاریخ سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، مگر ان پر کلی انحصار نہیں کرتا۔ ادب سائنس اور تکنالوجی میں ہونے والی پیش رفت کو بھی نظر میں رکھتا ہے، یہ سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، علمی اور نفسیاتی عناصر و اقدار کو بھی جذب کرتا ہے۔ ادب خارجی زندگی سے حاصل شدہ تجربات و مشاہدات کو فنی اور

جمالیاتی انسلاک کے ساتھ ہمیں لوٹاتا بھی رہتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے بڑی سچی بات کی ہے کہ ؎

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا تھا وہ لوٹا رہا ہوں

یہ جو چیز لوٹائی جارہی ہے کیا ہے؟ یہی تو عصری ادب ہے۔ غرض کہ ہر زندہ ادب اپنے عہد کا آئینہء اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے بعض دانشور جو فکری پسماندگی کے شکار ہیں وہ جب عصرِ نو کی بات کرتے ہیں تو بجائے آگے دیکھنے کے پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں بلکہ ماضی کو حال اور مستقبل پر ہو بہو منطبق کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اپنی ہمہ دانی جتانے کے لئے فیشن کے طور پر ایلیٹ کی طویل نظم ''ویسٹ لینڈ'' اور اقبال کے نام کا حوالہ دے کر بہ زعمِ خود یہ سمجھتے ہیں انھوں نے ادب اور عصرِ نو کے موضوع کا احاطہ کر لیا ہے۔ ایلیٹ اور اقبال کے بارے میں دو چار جملے ادا کر کے ادب اور عصرِ نو کے موضوع سے انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ لوگوں کو چونکانے کا زمانہ نہیں رہا۔ اب قاری خود بالغ نظر ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ نقاد کا کام تخلیقات کی فہرست تیار کرنا نہیں۔ وہ ادب میں تبدیلی کی جانب اشارا کرتا ہے قاری کو خود عصرِ نو میں وجود پانے والے فن پارے تک پہنچنا ہے اور ان کا مطالعہ کرنا ہے۔

یہ صداقت بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ ہر عہد میں بڑے چھوٹے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جو ایک طرح سے تبدیلی کا عمل بھی ہے۔ بعض واقعات قیامت خیز بھی ہوتے ہیں۔ قلم کار عام آدمی سے زیادہ ان قیامت خیز واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ متاثر ہوتا ہے بلکہ ان کو اپنے فن میں منعکس بھی کرتا ہے۔ جب واقعات رونما ہوتے ہیں تو یہ واقعات ادیب کی ذات سے مشاہدے کی صورت میں گزرتے ہیں لیکن جب یہ اس کے فن میں نمود وظہور کرتے ہیں تو یہ ادیب کے شعور سے گزرتے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ ذاتی مشاہدہ ایک خارجی عمل ہے لیکن جب یہ عمل خارج سے ادیب کے داخل میں اتر جاتا ہے تو اس کے شعور کا حصہ بننے کے عمل سے گزرتا ہے۔ جسے ہم ادیب کی داخلی دنیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ واقعات تو سماج میں رہنے والے ہر آدمی کے سر سے گزرتے رہتے ہیں مگر ایک تخلیق کار انھیں اپنے سر سے گزار کر شعور سے بھی گزارتا ہے اور عصرِ نو یا لمحہء موجود کی پیشانی پر خوبصورت جھومر کی طرح سجا دیتا ہے۔

ہمارے عہد میں سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تبدیلی جس انداز میں رونما ہوئی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ادب کے علاوہ ریڈیو، ٹی وی، ڈرامے، فلم اور اخبارات ورسائل کے صفحات شاہد ہیں۔ ہم اگر بہت زیادہ بیدار نہیں ہوئے ہیں تو بالکل نیند کے ماتے بھی نہیں ہیں۔ مذہبی تعصب اور بابری مسجد کا واقعہ، سیموئل ہن ٹنگ ٹن کے تہذیبی تصادم کا نظریہ، ایڈورڈ سعید کی مدافعانہ کوششیں، نوم چسکی کا متوازن ناقدانہ رویہ، نیا عالمی نظام، انفارمیشن ٹیکنالوجی میں آئے دن پیش رفتگی، گجرات کی خون آشام بربریت، ۱۱ ستمبر کا سانحہ، ڈرون حملے اور اس کے بعد کے اثرات، اس کے ردعمل میں امریکی رویہ، افغانستان کا منظر

نامہ، عراق کی پسپائی اور بکھراؤ، پاکستان اور ہندوستان کے روابط، ثقافتی تھیسس اور انٹی تھیسس، ساختیات، پس ساختیات، ردِ ساختیات، مابعد جدیدیت، انفارمیشن تکنالوجی وغیرہ سے علاقہ رکھنے والے رجحانات واضح طور پر داخلِ ادب وفن ہوئے ہیں۔ یہ رویہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا ادب اپنے عصر کے انسان دشمن قوتوں سے دست وگریباں بھی ہے اور انسان دوست اقدار کے لئے پرتپاک بھی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی نشوونما کے لئے کوشاں بھی ہے۔ ادب کے حوالے سے یہ کوشش عصرِ نو سے ہم آہنگ ہونے اور اسے منعکس کرنے ہی سے عبارت ہے۔

◀◀ ● ▶▶

1180/18, Samanabad, Gulber Town,
Federal 'B' Area, Karachi, Pakistan

عارف شفیق کی پانچ سو غزلوں کا مجموعہ

''یقین''

غریبِ شہر تو فاقے سے مر گیا عارف
امیرِ شہر نے ہیرے سے خودکشی کر لی

☆☆☆

پانچوں ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

☆

صفحات: 544 قیمت: 300

زیر اہتمام
ماھنامہ'' ادبی دنیا''
SP/1 بلاک 1 میزنائن فلور۔ الکرم اسکوائر ایف سی ایریا
کراچی پاکستان موبائل۔ 0345-2699347

● سعید رحمانی

حمدِ باری تعالیٰ

لفظِ 'کُن' کہہ کے ہراک شے کو بنایا تونے
اپنا اعجاز زمانے کو دکھایا تونے

دن کے آنگن میں اگایا یہ چمکتا سورج
شب کے آنچل کو ستاروں سے سجایا تونے

دے کے محبوب کے ہاتھوں میں ہدایت کی کتاب
آدمی سے ہمیں انسان بنایا تونے

یاس کی تیرہ شبی ہوگئی طاری جب بھی
دل میں امید کی شمعوں کو جلایا تونے

جب کڑی دھوپ ستانے لگی رستے میں ہمیں
اپنی رحمت کا وہاں کردیا سایہ تونے

شکر کرتا ہے ادا تیرے کرم کا یہ سعیدؔ
اس کی سوئی ہوئی قسمت کو جگایا تونے

◀◀ ● ▶▶

Pwd Buildingsdivision
Kasaragod , Kerala-671121.

● عزیز فیصل

نعت

جو ہمارا ہے، اسی کے ہی رہیں، نعت کہیں
کربِ توصیفِ زمانہ سے بچیں، نعت کہیں

جو ترے اہل سخن ہیں، وہ یہی سوچتے ہیں
دھڑکنیں جب بھی ترا نام سنیں، نعت کہیں

بخت کی رات، شب قدر سی بن جاتی ہے
ہم اگر نعت سنیں، نعت پڑھیں، نعت کہیں

ہیں مقدر کے سکندر وہ سخن ساز ترے
جو ترے سچے غلاموں سے ملیں، نعت کہیں

چھوڑیں آوارہ خیالی کی مسافت فیصل
آو اب شہر مدینہ کو چلیں، نعت کہیں

◀◀ ● ▶▶

House no.513 Street 4, Model town
Hummak Zimni, ISLAMABAD -44000

● ڈاکٹر منظر اعجاز

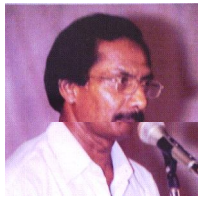

اردو شعراء کے انتقادی زاویئے

(الہام واکتساب کے تناظر میں)

اردو شعرا کے انتقادی زاویئے بزبان شعر بھی ابھرتے رہے ہیں اور بصورتِ نثر بھی۔ لیکن یہاں شعر کے حوالے سے یہی اس موضوع پر گفتگو مقصود ہے۔ البتہ اس گفتگو کے آغاز سے پہلے افلاطون کے اس خیال سے صرفِ نظر کرنا مناسب نہ ہوگا۔

''بہت ہیں شاندار الفاظ میں شعراء انسانی کارناموں کا بیان کرتے ہیں.....لیکن ہو فنی اصول کی بنا پر ایسا نہیں کرتے.....شاعر کے الہام کا سرچشمہ فن نہیں ربانی طاقت ہے۔ خدا شاعروں کے ادراک کو چھین لیتا ہے اور انہیں اپنے وزراء کی طرح استعمال کرتا ہے، جس طرح وہ مخبرانِ غیب یا مقدس پیغمبروں سے کام لیتا ہے، اس لیے کہ ہم جو اسے سنتے ہیں، بخوبی جان لیں کہ یہ انمول باتیں جو وہ حالت بیہوشی میں کہتے ہیں وہ ان کی اپنی نہیں ہوتیں بلکہ خدا کی ہوتی ہیں، جو بولنے والا ہے اور ان کے ذریعے ہم سے بول رہا ہے۔''

افلاطون کے اس خیال سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعری عطیہ الٰہی ہے۔ شاعری کا فن الہامی اور وہبی ہے، اکتسابی نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فن کا یہ الوہیتی نظریہ فلسفۂ جبر کے زیر اثر ہے اور جس کے ذریعے خدا کی قدرتِ کاملہ کا اظہار و اعتراف مقصود ہے۔ میر کا مشہور شعر ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اور جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے تو افلاطون کے محولۂ بالا خیال کی تائید و توثیق غالبؔ کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

یعنی مضامینِ شاعری غیب سے آتے ہیں جنہیں فرشتے لاتے ہیں اور Dictate (املا) کرا جاتے ہیں۔ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں شاعروں نے بھی اپنے اشعار کے ذریعے اس طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ عربی میں 'الشعراء تلامیذ الرحمٰن' بھی اسی خیال کا عکاس ہے۔ جہاں تک اردو شعراء اور شاعری کا تعلق ہے تو اردو شاعری کے ابتدائی عہد سے ہی اس طرح کے خیالات ملنے لگتے ہیں مثلاً صنعتی کہتا ہے ؎

ع سخن فیض ہے، عالم الغیب کا

یا:

سخن گنج ہے عالم الغیب کا
سخن موجزن ملک لاریب کا

راسخ عظیم آبادی سخن کو گوہر گنجینۂ جاں بھی کہتے ہیں اور اسے سرّ الٰہی بھی قرار دیتے ہیں ؎

ع کچھ عجب سرّ الٰہی ہے یہ

جمیل مظہری بھی الہام کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مژدہ اے ذوقِ سخن جنبشِ لب ہائے جمیلؔ
جنبشِ پردۂ الہام ہوتی جاتی ہے

جمیل مظہری نے اپنی سخن وری کو مصوری کے ساتھ ساتھ فسوں گری سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اسے سحر و فسوں سے تعبیر کرنے والے اور بھی شعرا ہیں۔ شاعری کو جزوِ پیغمبری قرار دینے کے باوجود اقبال اسے جادوگری سے بھی عبارت کرتے ہیں ؎

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے مصوری ہے
بنا کے تصویرِ مہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا
(جمیل مظہری)

حسیں تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگین نوا میں ہے جادو
(اقبال)

سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعر میر ہے سحر
زبانِ خلق کو کس طور کوئی بند کرے
(میر)

فسوں گری، سحر طرازی، جنون اور وجد وغیرہ بھی الہام ہی کے معنوی تناظر سے وابستہ ہیں۔ اور ان کیفیات کا اظہار مختلف زبان کے شعرا اپنے تخلیقی تجربات کی بنا پر کرتے رہے ہیں۔ لیکن بقول کلیم الدین احمد:

''افلاطون نے اس نقطۂ نظر کو انتہائی شدت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ شاعر پر کسی دیوی کا سایہ ہوتا ہے اور وہ مجنوں ہو جاتا ہے اور جو کچھ حالت جنوں میں کہتا ہے، وہ اس کی باتیں نہیں ہوتیں بلکہ اس دیوی یا خدا کی باتیں ہوتی ہیں، جسے مخبرانِ غیب یا پیغمبروں پر الہام ہوتا ہے۔ وہ محض خدا کی باتوں کی ترسیل کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں اس طرح شاعر بھی جو کچھ کہتا ہے وہ حالت جنونِ عالم وجد یا عالم بیخودی میں کہتا ہے اور جو انمول باتیں اس کی زبان سے نکلتی ہیں وہ اس کی نہیں ہوتی ہیں۔''

کلیم الدین احمد معترض ہیں کہ:

''افلاطون کے نظریہ میں ادراک کی کوئی جگہ نہیں حالانکہ بقول رچرڈز شاعر اپنے زمانے میں ادراک کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے۔ پھر افلاطون کے نظریہ میں فن کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہے وہ الہام ہے۔ الہام میں ساری حقیقت ہے۔''

رچرڈز اور کئی دوسرے انگریزی شاعروں کے حوالے سے کلیم الدین احمد نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ شاعر صاحبِ ادراک بھی ہوتا ہے اور فن کی بدولت نغمہ نگاری کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ یعنی تخلیق فن صرف الہام ہی کا نتیجہ نہیں۔ لیکن انہوں نے شیلی، کو برج اور اے۔ ای ہاؤس کے بھی حوالے دیئے ہیں جو جنون، وجد یا الہام کے قائل ہیں۔ گویا افلاطون جسے تعقل پرست اور فلسفی کے رومانی تخیل کے اثرات بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ افلاطون نے الہام کے ساتھ ساتھ مقدس پیغمبروں اور مخبران غیب کی بھی مثال دی ہے۔ چنانچہ پیغمبروں کے حوالے سے الہام کی روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ الہام خود اکتساب کا نتیجہ ہے۔ اس اکتساب میں ریاضت، بندگی، دعا سب کچھ شامل ہے۔ ایثار، انہماک، اشراق کو بھی الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کوئی رسمی باتیں نہیں ہیں۔ نظریہ جبر کے برخلاف اکتساب کا بھی فلفیانہ نظریہ از روئے قرآن حکیم ثابت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شوپن ہاور اکتساب کو توفیق الٰہی قرار دے کر اسے بھی نظریۂ جبر ہی کی ایک تعبیر قرار دیتا ہے لیکن تقریباً تمام بڑی زبانوں کے شعرا نے اپنے انتقادی شعور و بصیرت کا اظہار کرتے ہوئے اکتساب فن، یا فن کے اسرار و رموز پر گرفت کے لئے جدوجہد، کوشش اور مشق و ریاض وغیرہ کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ سخن کو عالم الغیب کا فیض قرار دینے والا صنعتی سخن کو عقل کے درج کا لعل اور برج لامکاں کا سورج بھی کہتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ گہر محنت و مشقت کے بغیر ہاتھ نہیں آتا۔ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس کی مثال بھی پیش کرتا ہے۔

سخن لعل ہے عقل کے درج کا — سخن شور ہے لامکاں برج کا
نہ محنت بغیر یوں گہر ہاتھ آئے — نہ چھیدے بغیر کان میں در سمائے

ولی نے بھی اشعارِ غزل کے ذریعے اپنے انتقادی زوایے کا اظہار کیا ہے۔ اور عقل و دل یعنی حس اور وجدان یا ادراک و الہام کی ہمکاری پر زور دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری بالخصوص غزل کی شاعری ایک پورے انسان کا پوری کائنات کے مقابلے میں پورا پورا ردِعمل ہے۔ یہاں جس اور وجدان ہمکار ہو جاتے ہیں اور یہ ہمکاری رسید طبائع کو اسریٰ کی منزلوں سے گزار دیتی ہے اور ان حقائق کا بلا واسطہ مشاہدہ کرا دیتی ہے جن پر کاسۂ چشم لئے ذوقِ نظر کے گدا گر تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔

افتمرونہ علی ما یری (تم ان باتوں پر اس سے جھگڑتے ہو جو تم نے نہیں دیکھی ہیں۔) (اور اس نے دیکھی ہیں)۔ (قرآن) ولی جس اور وجدان یا ادراک و الہام کے بیان کے لئے علامتی پیرایۂ اختیار کرتے ہیں تو عقل اور دل کی اصطلاحات اور علامات سے یہی مفہوم مرتب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔

یوں بات کو لکھا ہوں سفینے میں عقل کے
ہے بحرِ دل میں طبع سخن آشنا بلند

اسی وجہ سے ولی کے خیال میں سخن گلشن معنی کا گل ہے جس پر بلبل رنگیں بیان عاشق ہوتے ہیں۔

میرے سخن کو گلشن معنی کا بوجھ گل
عاشق ہوئے ہیں بلبل رنگیں بیان آج

چنانچہ اچھے شعر، شاعری یا سخن کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ ایسی انمول بات کے آگے لعل و گہر کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ بقول شخصے:

ع شعر گفتن بہ زدُر سُفتن بود

یعنی شعر کہنا موتی رولنے، موتی چننے یا موتی پرونے سے بہتر ہے۔ کیونکہ جب زبان سے نقاب سخن اُٹھتا ہے اور شاہد معنی جلوہ پیرا ہوتا ہے تو اس کی آب و تاب اور چمک دمک کے آگے دنیا کی ہر دولت اپنی آب و تاب اور چمک دمک کھو بیٹھتی ہے، اسی لئے ولی سخن کو کو عدیم امثال قرار دیتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کے سوائے سخن کے کوئی دوسری چیز سخن کا جواب نہیں بن سکتی۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ لفظ رنگیں مطلع رنگیں ہے اور کچھ اور نہیں۔ لیکن اصل میں آفتاب سخن جو چیز ہے وہ نور سخن ہے:

جلوہ پیرا ہو شاہد معنی — جب زباں سوں اُٹھے نقاب سخن
ہے سخن جگ منے عدیم المثال — جز سخن میں دوجا جواب سخن
لفظ رنگیں ہے مطلع رنگیں — نور معنی ہے آفتاب سخن

سراج نقد سخن میں درد جگر کو اہم قرار دیتے ہیں کیونکہ درد سے لبریز سخن محبوب کو مرغوب ہوتا ہے۔ فائز داد سخن کے لئے محبوب کو کلی کی طرح منہ بند نہیں بلکہ گل خنداں کی طرح دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ آبرو

کے خیال میں سخن کو قیمتی ہونا چاہئے اس لئے کہ جس طرح قیمتی گوہر جوہری کی عزت بڑھاتا ہے، اسی طرح اچھے سخن سے سخنور کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ حاتم کا خیال ہے کہ سخن میں بانکپن کا ہونا ضروری ہے جو گفتگو کی انفرادیت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں اسلوب کی انفرادیت پر زور بالکل واضح ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ رنگارنگی، بوقلمونی اور تنوع کے بھی قائل ہیں۔ سخن میں سب طرح کے مذاق کا پایا جانا بھی حاتم کے نزدیک سخن کے عمدہ ہونے کی دلیل ہے۔ فغاں رنگینیٔ الفاظ کے قائل ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک رنگینیٔ الفاظ، رنگ گل سے بھی نازک ہوتی ہے۔ سودا معنیٔ رنگیں کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک معنیٔ رنگیں کی تعریف یہ ہے کہ سخن کے ہر رنگ میں سخنور کی شخصیت شامل ہو، کیونکہ وہ سخن جو پُر تاثیر نہ ہو، آفاق کے لئے دلکش نہیں ہوسکتا۔ اگر اس میں تاثیر ہے تو وہ یقیناً دل کو مسخر کرلے گا۔ سودا کے اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زبس رنگینیٔ معنی مری عالم میں پھیلی ہے
سخن جس رنگ کا دیکھو گے اس میں میں بھی شامل ہوں

نہیں آفاق میں دلکش سخن بے تاثیر
گر اثر ہو تو کریں دل کو مسخر اشعار

سودا کا خیال یہ بھی ہے کہ سخن کی چستی و سستی کا راز بحر معنی میں مضمر ہے۔ اس لئے کہ بحر معنی میں کہیں گہر ہے اور کہیں تہہ آب سراب ہے۔

سخن کی چستی و سستی ہے بحر معنی میں
کہیں گہر ہے، کہیں ہے سراب در تہہ آب

میر حسن سخن میں نئی شان اور گل معنی کے سو رنگ دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ وہ سخن میں تاثیر کے بھی قائل ہیں ان کے خیال میں وہ سخن ہی کیا جو اشک غم دیدہ کی طرح دل پر اثر نہ کرے۔ سخن میں یہ کیفیت ریاض سخن کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ سخن کو وہی بے نظیر بنا سکتا ہے جو جوانی ہی میں ریاض سخن سے بہرہ ور ہو جائے۔ لیکن ریاض سخن کا یہ حوصلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سخن عزیز از جان ہو، ورنہ سخن بے جان ہی رہ جاتا ہے۔ مصحفی سخن میں انداز سخن کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ انداز سخن جس کے حسن پر پڑھنے والا مر مٹے۔ یہ کیفیت سخن میں گہری تاثیر کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ اور بقول فدوی یہ تاثیر، یہ لطف، یہ مزہ اسی وقت ممکن ہے جب سخن ور نے سالہا سال خون جگر کھایا ہو۔

جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر — تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
(میر حسن)

سالہا خون جگر کھایا ہے — ہے مزہ تب یہ سخن میں مرے
(فدوی)

افلاطون کا خیال ہے کہ شاعر حالت جنون، عالم وجد یا عالم بے خودی میں شعر کہتا ہے۔ اور جو انمول باتیں اس کے منہ سے نکلتی ہیں، وہ اس کی نہیں ہوتیں۔ یعنی بقول کلیم الدین احمد:

''ایک طرف افلاطون شاعروں کی بزرگی اور ان کی عظمت پر زور دیتا ہے، انہیں مخبران غیب اور پیغمبروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور دوسری طرف ان کی ساری دولت ان سے چھین لیتا ہے۔ ان کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ جب ان پر القا یا الہام نہیں ہوتا تو پھر کچھ بھی نہیں۔''

میں پھر ایک بار یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ القا یا الہام بیٹھے بیٹھائے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے شاعر کو اپنی ذات کے 'حرا' میں معتکف ہونا پڑتا ہے۔ اس دوران وہ محویت، استغراق اور تمام تر خلوص و انہماک یعنی خشوع و خضوع کے ساتھ جستجو، آرزو، بندگی اور ریاضت کے مرحلے سے گذرتا ہے۔ یہ اکتساب کا مرحلہ ہوتا ہے۔ سخت ترین مراقبے اور مجاہدے کا مرحلہ..... اس مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے بعد ہی القا یا الہام کا مرحلہ آتا ہے۔ راسخ کہتے ہیں کہ سخن انسان کا تن نہیں، اس کی روح ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معشوق مزاج داں بھی لیکن وہ حسن سخن کو حسن محبوب پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ سخن کا حسن ہمیشہ رہنے والا ہے اور محبوب کا حسن بے بقا ہے۔ اس لئے سخنور اس کی ادا میں محو اور اس کے نشے میں مخمور رہتا ہے۔

روح تن و انس و جاں ہے سخن — معشوق مزاج داں ہے سخن
محبوبوں اگو ہے بے بقا حسن — ہے اس محبوب کا سدا حسن
ہوں میں محو ادا اسی کا — ہے سر میں میرے نشہ اسی کا

صوفیوں اور شاعروں کا یہ مشترکہ تجربہ ہے۔ دونوں کے تجربے میں بڑی حد تک مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک ناقابل بیان تجربہ ہوتا ہے، اس لئے اس کی حقیقت وصداقت ناقابل تردید ہوتی ہے۔ لیکن یہ تجربہ معرض بیان واظہار میں نہیں آسکتا۔ اس لئے اس کے اسلوب بیان سے پرے ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی گویا سرّ الٰہی ہے۔ راسخ کہتے ہیں۔

اوّل نا متناہی ہے یہ — کچھ عجب سرّ الٰہی ہے یہ
ہے سخن گوہر گنجینۂ جاں — منعکس اس سے ہے آئینۂ جاں
منتظم کارِ سفارت اس سے — سحر افسوں ہے عبارت اس سے
گرمیٔ معرکۂ صلح و جنگ — ہمہ تاثیر ہے یہ پیر ننگ
اس کی ترکیب کہیں مہر انگیز — نظم اس کا ہے کہیں وجۂ ستیز
کہیں اعجاز کہیں استدراج — واہ کیا شئے ہے یہ عجوبہ مزاج
ہیں بیاں سے پرے اس کے اسلوب — ہے طرفدار محبّ و محبوب

آیت اللہ جوہری بھی بالآخر سخن کو الہام ہی قرار دیتے ہیں۔ وہ سخن کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ سخن کے جلوے سے ہی معنی کی خبر مل جاتی ہے۔ اور سخن کو بقول آیت اللہ جوہری جام و مینا سمجھ لیا جائے تو پھر سخن کی صحیح عریف یہ ہوگی کہ وہ طلوعِ نشۂ صہبا ہے۔ جوہری سخن کو گل، غنچہ اور بو قرار دیتے ہیں اور شاعر کو عندلیب۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ سخن مبدأ فیاض کی طرف سے آتا ہے اور اگر کوئی آپ سے سخن کہہ کر سنانا چاہے تو نہیں سنا سکتا۔

سخن جلوے سیں معنی کی خبر دے — دلوں میں جوش مستی کا اثر دے
اگر جام و اگر مینا سخن ہے — طلوعِ نشہ ٔ صہبا سخن ہے
سخن غنچہ، سخن گل ہے، سخن بو — برنگِ عندلیباں ہیں سخن گو
نہ کوئی آپ سے کہہ کر سناتا — سخن از مبتدأ فیاض آتا

سخن عطیۂ الٰہی ہے اور مبدأ فیاض سے آتا ہے مگر یہ نعم البدل ہے جو خون جگر کے صرفے سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ خون جگر اکتسابِ فن یا کاوشِ فن کا استعارہ ہے:

نعم البدل دیا مجھے اللہ نے امیر
دل ہو گیا جو خون تو رنگیں سخن ہوا
اہل زمیں کو نسخۂ زندگی ٔ دوام ہے
خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو
سخنوری (امیر مینائی)

نقش ہیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر
(اقبال)

اللہ اللہ یہ رنگینیٔ و امان سخن
شفقِ خونِ تخیل ہے بہ عنوان سخن
(جمیل مظہری)

ان تصریحات وتفصیلات سے واضح ہے کہ شاعری الہام ہے لیکن اکتساب فن کے مشقت آمیز مرحلے سے گزرنے بغیر شاعری مرتبۂ الہام تک نہیں پہنچ سکتی۔

Head P.G. Dept. of Urdu, A.N. College, Patna-13

● نسیم سید

'مکان' طاقت سے نجات کا تخلیقی منشور

مکان صرف ایک ناول نہیں ہے، یہ بچھڑی ہوئی تہذیب، گزرے ہوئے وقت کی کہانی بھی نہیں ہے، یہ حسن وعشق کی ماجرا خیز داستان بھی نہیں، یہ جسم یا جنس کے خلوت افروز جذبات انگیز بھیدوں بھرے اوراق بھی نہیں ہے۔

پھر کیا ہے؟

مکان کو پڑھ کے میں نے سوچا۔ میرے اندر بہت سی آوازیں اپنی اپنی بات کہہ رہی تھیں مگر سب سے صاف اور واضح ایک آواز تھی۔

'دراصل یہ گلوب پر کھینچی ہوئی لکیروں کو مٹا کے ایک مکان جیسا بنا دینے کے بعد اس میں موجود ہونٹ سی، لینے خاموش غلام گردشوں، سازشی بیٹھکوں، طاقت کی پر پیچ دستار سروں پر سجائے مکان کی ہر آہٹ پر نظر رکھنے اور اپنی مٹھی میں جکڑ لینے والے ہمارے اطراف چلتے پھرتے کرداروں کی روداد ہے اور اس کے ان ہی کرداروں سے ٹکرا جانے والی صدیوں کی کم ہمت، مجبور آواز کے باوجود کے اپنے آپ کو جوڑنے بٹورنے اٹھ کھڑے ہونے اور منوانے کی داستان ہے۔ 'مکان' دراصل ٹوٹی ہمتوں کو جوڑنے کا فکری وجدان بھی ہے اور تخلیقی منشور بھی اور وہ گربھی جو راکھ میں دبکی آگ ڈھونڈ نکالتا ہے اور اسے پھر شعلے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس گُر کو مصنف نے 'نیرا' کا نام دیا ہے اور اس منشور کو 'مکان' کا۔

بلراج ورما صاحب نے گو ایک بہت گہری بات کی ایک جملہ میں 'مکان' کے حوالے سے کے نیرا ایک لڑکی نہیں بلکہ ہندوستان کی وہ اقلیت ہے جو اکثریت سے برسر پیکار ہے۔' میں اس بات کو آگے بڑھانا چاہوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ مکان صرف ہندوستان کی اقلیت کے اکثریت سے برسر پیکار ہونے کی داستان نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر اس بظاہر کمزور لیکن کسی چٹان سے زیادہ مضبوط انسان کی داستان ہے جو طاقت سے برسر پیکار ہے۔ اگر اس کو دنیا کے نقشے پر کھینچی ہوئی لکیروں کو مٹا کے دیکھا جائے تو یہ ایک بہت بڑے کینوس پر بنائی ہوئی تصویر ہے۔

'مکان' صدیوں کی بوسیدہ ہڈیوں میں اترے ہوئے گھن کا وہ ایکسرے ہے جو صرف مرض کی

تشخیص نہیں کرتا بلکہ علاج بھی بتاتا ہے۔ پیغام آفاقی کی آفاقی فکر سماج ورسماجی شعور کی نباض ہے۔ وہ ماؤزے تنگ کے اس قول کی روشنائی میں اپنا قلم ڈبو کے فکری پیکر تراشتے ہیں کہ 'ادیب ودانشور اس ہراول دستے کے سپاہی ہیں جو قلم سے لڑتے ہیں۔' ان کا گہرا مشاہدہ، بے پناہ حساسیت اور آفاقی شعور ہر بے ایمانی، ہر چالاکی، ہر جبر کو آئینہ دکھاتا چلا جاتا ہے۔

مکان کی داستان کو اگر ہم بین الاقوامی تناظر میں دیکھیں تو اسے دس ہزار سال قبل کے شمالی امریکہ کے مقامی باشندوں کی اس داستان سے بھی جڑا پائیں گے جس میں اس زمین یا اس مکان کے اصل وارثوں کی مجبوری اور جدوجہد کی کہانی تفصیلاً رقم ہیں کہ کس طرح سفید نسل نے انھیں ان کے گھروں سے بے دخل کر کے ان کی زمین یعنی ان کے مکان پر قبضہ کر لیا۔

یہاں میں پیغام آفاقی کے ناول کی ابتدائی سطور کوٹ کرنا چاہوں گی 'یہ ایک سنگین مسئلہ تھا۔ نیرا کا مکان خطرے میں تھا اور اس کا کرایہ دار اس سے اس کا یہ مکان چھین لینا چاہتا تھا۔'

شمالی امریکہ کے حقیقی وارثوں کا مسئلہ بھی 'سنگین' تھا کہ باہر سے آنے والے ان کی زمین، ان کا مکان چھین کے انھیں وہاں سے بے دخل کر رہے تھے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ: Aboriginal are the people who already lived in America through out Alaska and Canada about 10,000 years ago when the arrived. Europeans ان حقیقی باشندوں کے بارے میں اس دور کے معروف تنقید نگار ڈائمنڈ جیمز نے فیصلہ دیا تھا کہ 'یہ جنگلی کچھ ہی عرصہ میں اپنی موت آپ مر جائیں گے' لیکن وقت پر اپنی راس ڈال کے رکھنے والے ان قبائل کے ادیبوں اور شاعروں نے پیغام آفاقی کی نیرا کی طرح ہار ماننے سے انکار کر دیا اور جبر کے سامنے صبر سے ڈٹے رہے۔ اپنے ہونے کی گواہی اور جدوجہد کے طویل دورانیہ کے بعد اس کے جشن کے وقت اس دور کا ایک شاعر (یا پیغام آفاقی کی نیرا) ڈائمنڈ جیمز اور اس جیسے تمام فیصلہ سنانے والے جابروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے طنز سے پوچھتا ہے: 'کیا تم وہی سفید فام نہیں ہو، جس نے ہمیں ہمارے خیموں سے بے دخل کر دیا تھا۔'

اسی طرح 'مکان' اس سیاہ فام قوم کے اپنے دور غلامی سے نجات کی اذیت ناک تاریخ وتفصیل بھی ہے جنھوں نے خود کو برابر کا انسان منوانے کی جدوجہد میں برسہا برس گزار دیے لیکن ہار نہیں مانی۔ یہ وہ تھے جن کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی سفید نسل کے علاقے میں قدم بھی رکھ سکیں۔ پیغام آفاقی کے ناول کا مرکزی کردار نیرا ہو یا افریقن امریکن عورت روزا پارکس (Rosa Parks) دونوں کی اپنے سچ کو منوانے کی ضد اور اس سے جڑی بے مثال ذہنی اور جسمانی مشقت، تھکن، ٹوٹنے اور ٹوٹ ٹوٹ کے جڑنے کی داستان تقریباً ایک ہے۔ روزا پارکس کا واقعہ 1955 کا ہے۔ وہ ایک دن اپنے کام سے گھر واپسی کے

وقت بس میں سوار ہوئی۔ بس میں آگے کی دس سیٹوں پر سفید امریکن کے لیے مخصوص ہوتی تھیں اور افریقن امریکی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھتے تھے۔ روزا حسب دستور پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آگے کی دس سیٹیں اس وقت تک بھر چکی تھیں۔ تب اسی وقت ایک امریکن بس میں سوار ہوا اور پچھلی سیٹ پر چار افریقی جو روزا سمیت تھے انھیں بس کے ڈرائیور نے سیٹ خالی کرنے کا حکم دیا۔ سب اٹھ گئے لیکن روزا نے اٹھنے سے انکار کر دیا اور اس جرم پر روزا کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے سزا سنائی گئی۔ روزا نے ہار نہیں مانی۔ اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی اور Jim Crow Laws جیسے سخت قانون کو چیلنج کر دیا۔ روزا کی بے مثال جنگ اور اس کی جرأت نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس طویل جدوجہد کی شکل میں آج امریکہ کا وہ وہائٹ ہاؤس جس کے لیے یہ سوچنا بھی گناہ جیسا ہوگا کہ کوئی سیاہ فام اس میں قدم رکھے گا، اوباما کے قدم چوم رہا ہے۔

مجھے مکان کو پڑھتے ہوئے روزا بے اختیار یاد آ گئی۔ کیا نیرا وہی روح، وہی اپنے سچ کا یقین، وہی طاقت کے قوانین کے سامنے ڈٹ جانے کی لاپروا ضد نہیں؟ انسان کے اندر پوشیدہ ہمتوں اور صلاحیتوں کی لازوال داستانوں کے ہر صفحے سے 'مکان' کے اوراق جڑے ہوئے ہیں۔ اس دور کی روزا اور 'مکان' کی نیرا ایسے کردار ہیں، جو سیلاب حیات کے منجھدھار سے الجھتے ہی نہیں بلکہ طوفانی موجوں پر راس ڈال کے ان کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ مکان گزشتہ سے لیکر موجودہ دور تک کے انسانی مسائل اور ان سے نبرد آزمائی کا وہ منشور ہے جو انسان کو زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ دیتا ہے۔ پیغام آفاقی ایک ایسی مضطرب روح کا نام ہے جو وقت کی صدائیں دیتی، بین کرتی، جگاتی آوازوں پر خود بھی لبیک کہتی ہے اور قلم کے سرفروشوں کو بھی صدا دیتی اور جھنجھوڑتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اعلیٰ تصورِ حیات اور سماجی نصب العین کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مکان کی داستان ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ اس میں تمام وہ تصویریں بھی ان جابروں کی ہیں جو کمزوروں کے نرخرے پر پاؤں دھرے اسے اپنا حق سمجھ رہی ہیں اور اس ہمت کی تصویر بھی جو انھیں دھتکارنا اور سدھارنا جانتی ہے یعنی یہ صرف ایک ناول نہیں ہے بلکہ یہ نشان دہی ہے ان سنگین مسائل کی کہ سماج کی منفی قدروں کو کن اسباب سے، کن وجوہات سے تقویت ملتی ہے اور کیوں کوئی معاشرہ نفسیاتی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے دیوالیہ ہوتا ہے۔ اس سنگین مسئلہ کو کن اداروں کی سرپرستی سے احکام ملا ہے۔ پیغام آفاقی نے انتہائی ذہانت اور سہولت سے اسے کسی وعظ کی شکل دینے کے بجائے کبھی نیرا کی خود کلامی کے ذریعہ، کبھی مختلف کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ بڑے فلسفیانہ انداز میں نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ اسے زور آور کی پیٹھ پر سواری کرنے کا نسخہ کیمیا بھی بنا دیا ہے۔ یہ آج کے بین الاقوامی اضطراب کے پس منظر میں پھیلتی اور سکڑتی سرحدوں کی دستاویز بھی ہے اور گربھی وہ جو دنیا کی ہر اقلیت کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا ہندوستان کی اقلیت کے لیے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے اس کو گلوب پر کھینچی ہوئی لکیروں کو مٹا کر ایک بہت بڑے کینوس پر پھیلا کر دیکھا۔ پوری دنیا کی وہ اقلیت جو اکثریت سے برسرپیکار ہے

اس کی کہانی بہت قدیم بھی ہے اور موجودہ دور تک ہمارے اطراف موجود بھی۔ اس صورت حال کا پیغام آفاقی نے بغور مطالعہ کیا ہے ان کی قوت مشاہدہ، تخلیقی بصیرت اور زندگی سے گہرا ربط وہی ہے جسے معروف تنقید نگار افسانہ نگار اور ناول نگار جناب حمید شاہد نے 'اچھے فنکار کے تخلیقی حواس خمسہ' قرار دیا ہے۔ حمید شاہد کہتے ہیں:

''ایک حقیقی فنکار اپنے باطن میں کائنات کی سی وسعت لیے ہوتا ہے۔ وہ لفظ کی بھیڑ میں موجزن معنی کے طلسم اور بہتے دھاروں پر قدرت رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ لطف تاثیر، گہرائی، گیرائی اور تعبیر کی تکثیر ایک جملے کی تقدیر کیسے بن سکتے ہیں۔ وہ زندگی کو دیکھتا ہے اور زندگی کے جوہر کو بھی۔ وہ کائنات پر نظر رکھتا ہے اور ابدیت کے کنگروں کو چھونے کا بھی حوصلہ مند ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر الفاظ، سوچوں، جذبوں کو سنبھال کر رکھنے اور اپنے تخلیقی وجود کا حصہ بنا لینے کی للک اور قرینہ رکھتا ہے۔''

پیغام آفاقی کی تخلیق مکان بھی اپنے لطف تاثیر، گہرائی، گیرائی، فکری آفاقیت اور اظہار کی ندرت میں ان کے تخلیقی حواس خمسہ کی رعنائی کا مظہر ہے۔

پیغام آفاقی نے اپنے ناول کو 'مکان' کا نام بہت سوچ سمجھ کے دیا۔ ہر فرد کی زندگی ایک مکان جیسی ہے اور کوئی نہ کوئی سنگین مسئلہ اس مکان جیسی زندگی کو گھر کرنے تک کسی کمار (نیرا کا کرایہ دار جو نیرا کو اس کے گھر سے بے دخل کرنے کے لیے حد سے گزر جاتا ہے) کا سامنا ہے۔ یہ ناول مکان جیسی زندگی کو گھر کرنے کے ہنر بتاتا ہے اس کو پڑھتے ہوئے اپنے اندر مسمار ہوتا وجود، ٹوٹتی ہمتیں، سیلن کھاتی سوچیں کسی مئی جون میں بدلتی جاتی ہیں اور اپنے اندر ایک نئی کائنات کی دھمک محسوس کرتی ہیں۔ اس نئی کائنات کا وجود زندگی بسر کرنے کے اس فلسفے کا مرہون منت ہے جو 'مکان' کا عطا کردہ ہے۔

''تم اس کے قدموں تلے آؤ تو یہ تمھیں کچل دے گی، تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ تو زندگی تم کو بلندیوں کی سیر کرائے گی۔''

زندگی میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے تمام کے تمام کردار اس ناول میں اپنی اصل شناخت اور چہرے کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کرداروں کی شخصیت کسی تصوراتی دنیا میں نہیں بلکہ ہماری حقیقی دنیا کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک لڑکی نیرا ہے۔ پیغام آفاقی نے اس کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی کہ نیرا کے حسن کی تفصیلات میں جا کے قاری کو متوجہ کرتے بلکہ انھوں نے اس پہلو سے بالکل پہلوتہی برتی ہے اور اہمیت اس لڑکی کے وجود میں موجود اس چنگاری کو دی جو مخالف ہواؤں کے جھکڑ کے سامنے دھیرے دھیرے شعلہ بن کے ان کے اطراف پھیل جاتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب بھی یقیناً منصف کا سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ عورت برسہابرس سے 'کمزور' کے لیبل کے تحت زندگی گزار رہی ہے۔ چتا پر زندہ جل جانے والی، قرآن سے بیاہ دی جانے والی، تاوان میں دے دی جانے والی۔ نن بنا کے

گرجاؤں میں حنوط کر دی جانے والی لاتعداد عورتیں جو ذاتی اور سماجی حقوق سے طرح طرح سے دھتکاری جاتی رہی ہیں۔ پیغام آفاقی اس عورت کے تشخص کو پہچانتے بھی ہیں اور اس کی پہچان بہت بھرپور طریقے سے دنیا سے بھی کراتے ہیں وہ اپنی تابناک فکر کو نیرا کی سوچ میں ڈھال کے عورت کے وجود کو اپنی شناخت کا وجدان عطا کرتے ہیں۔

''اس کا کوئی سرپرست نہیں ہے، کوئی اس کی حفاظت کرنے والا، اس کے لیے سوچنے والا نہیں ہے۔''

''سوچنے کے دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ کے ریشے از سر نو مرتب ہو رہے ہیں جیسے کوئی اس سے ہولے ہولے کہہ رہا ہو۔ یہاں قدم قدم پر رہزن گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہاں معاہدہ بنانے والے ایک ایک لفظ کے ہزاروں ہزاروں روپے لیتے ہیں، اس شہر میں تم بھروسوں کی سڑک پر چل رہی ہو۔''

نیرا کو جن چالاکیوں کا سامنا ہے مردانے معاشرے میں مصنف نے ان کو ننگا کرنے میں کوئی رعایت نہیں برتی بلکہ مردانہ معاشرے کی گھناؤنی سازشوں کی وکالت وہ ایک مرد (پولیس انسپکٹر نیّر) سے ہی کرواتے ہیں۔

''آپ دیکھئے تو... رفتہ رفتہ تھانے اور کورٹ بھگاتے بھگاتے اور قدم قدم پر اسمارٹ نس کے استعمال کا موقع دیتے دیتے اس کے پرس کے پیسے اور آنکھوں کی جھجک سب چھین لوں گا اور پھر وہ دن آئیں گے کہ ہماری ہر چوٹ کو وہ اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ روکے گی۔ اسے پتہ بھی نہیں چلے گا کہ وہ وہاں جا رہی ہے اور ان لوگوں سے مدد لے رہی ہے جہاں ہم چاہتے ہیں۔ ہم ایک طرف سے اسے دبائیں گے اور دوسری طرف سے اسے پچکاریں گے اور سہارا دیں گے۔ وہ ہماری آغوش میں ہمیں سے پوری یکسوئی اور دلجوئی سے جنگ میں مشغول نظر آئے گی اور اس خوش گمانی میں مبتلا رہے گی کہ وہ بہت بہادری سے لڑ رہی ہے اور پھر ہم اس کو سراہتے ہوئے اس کو مقدمہ لڑنے کے لیے سکے بھی دیں گے اور دوسروں سے دلوائیں گے۔ تب اسے پتہ چلے گا کہ وہ جنگ لڑتے لڑتے کہاں پہنچ چکی ہے اور پھر وہ خاموشی سے ایک دن یہ محسوس کر لے گی کہ یہ جنگ اس کا پیشہ بن چکا ہے۔ اس پیشے کی دنیا میں وہ مشہور و مقبول ہو چکی ہے۔ وہ جان جائے گی کہ اب یہ جنگ اس کو اس وقت تک لڑنی ہے جب تک اس کے جسم میں کشش کی ایک کرن بھی باقی ہے۔''

ایک ایک جملے میں ہزار ہزار چالاکیوں کو سمیٹے ہوئے کس طرح کوزے میں گویا دریا دکھا دیا ہے مصنف نے۔ مجھے بے اختیار کچھ یاد آ گیا۔ ٹورنٹو کے ایک شاعر نے ایک نیرا جیسی یہاں کے شاعرہ کے لئے ایک بیان دیا تھا: 'فلاں (ایک بڑے شاعر) کہہ رہے تھے مجھ سے کہ سالی کو اپنی جانگھ کے نیچے لے آؤ۔ دیکھو کیسے اپنی ساری اکڑ بھول کے تمہارے اشاروں پر ناچتی ہے۔''

تجربات عورت کے ہیں، ان عورتوں کے جو سوچنے بولنے اور اپنے ہونے کا حق اپنے نام محفوظ رکھتی ہیں اور کسی زور آور کے جال اور جھانسے میں نہیں آتیں۔ لیکن پیغام آفاقی وہ مصنف ہیں جو مرد ہوتے ہوئے بھی ان بیانات کو رقم کرتے ہوئے اپنے قلم کو لکنت نہیں کھانے دیتے۔ جو پولیس کے محکمہ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس محکمے کی بدعنوانیوں پر انگلی دھر کے ان کی تفصیلات دکھاتے ہیں۔ پیغام آفاقی کا تخلیقی وجدان جھوٹ کو جھوٹ، بدعنوانی کو بدعنوانی، خرد برد کو خرد برد کہنے کا فولادی حوصلہ رکھتا ہے۔ ان کا قلم ہر سچ کو بلا کسی تفریق کے تصویر کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا سماجی نظام دو طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو لوٹ رہا ہے اور دوسرا وہ لٹ رہا ہے۔ آج پوری نوع انسانی سرمایہ داروں اور محنت کشوں، آجروں اور اجیروں، مظلونوں اور ظالموں، کمزوروں اور طاقتوروں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ طاقتوروں کے بچھائے ہوئے جال اور سجائے ہوئے یہ استحصال کے مناظر سانپ کی طرح اپنا پھن اٹھائے کھڑے ہیں ہمارے اطراف۔ زندگی کی مادّی، روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں کے انمول خزانے پر بیٹھے یہ سانپوں کے آلہ کار اور مددگار ہر مذہب کے 'ملّا' سیاسی رہنما اور ان کے دسترخوان کے نمک حلال ہیں۔ اس وقت پوری دنیا کو کن مشکلات کا سامنا ہے وہ جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ خود کو اپنا پرسہ دینے کے بجائے کچھ کرنا ہے۔ اس جانکاری کی بے چینی اور اس بے چینی کا حل ان کا ناول 'مکان' ہے۔

پیغام آفاقی جانتے ہیں کہ ایسے میں فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ہر ادیب ہر شاعر اور ہر فنکار کو بیک وقت کئی محاذوں پر اپنی جنگ لڑنی ہے اور اپنے فن کو بلا تفریق وامتیاز سچ کا فرض ادا کرنے میں جرأت عطا کرنی ہے۔ حقیقی مسائل کی نشاندہی کرنی ہے۔ اس حشر انگیز اور اضطرابی دور میں کوئی تخلیق کار اپنی تخلیقی ذمہ داریوں کو کیسے پورا کرے۔ لہٰذا وہ 'مکان' کی فکر کے وسیع تر افق کے پس منظر میں مسائل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور مرکزی کردار نیرا کے ذریعہ ایک عام انسان کی ہمت کو مہمیز بھی۔ پیغام آفاقی نے ناول کے مختلف کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ دکھایا ہے کہ کوئی ادیب کس طرح ادب کا فلسفیانہ منطقیانہ اور وہ سماجی تصور باقی رکھے جس میں ہم ارسطو کے منطق کی گونج سنتے ہیں اور جسے ہم ادیب ترجمان بھی ہیں اور نقیب بھی۔ مکان اعلیٰ تصور حیات اور سماجی نصب العین کا خاکہ بھی ہے اور دستور بھی۔ یہ سماج کی منفی قدروں کو بڑی کاری ضرب لگاتا ہے اور وہ تمام کردار جو ان منفی قدروں کی پشت پناہی کرتے ہیں ایک ایک کر کے بے نقاب کرتا چلا جاتا۔ جس کی ایک بھرپور مثال آلوک کا کردار ہے۔

ڈاکٹر مولا نا بخش نے ناول کے پیش لفظ میں آلوک کو پیغام آفاقی کا ہمزاد قرار دیا ہے اور بجا طور پر قرار دیا ہے کہ آلوک کی سوچ اور اس کے کردار میں پیغام آفاقی کی اپنی ذات اور ان کے عہدے کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں، لہٰذا وہ لاشعوری طور پر بھی اس کو انسانی فطرت سے ماورا کوئی تصوراتی کردار بنا کے پیش کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس کردار کے کمزور (یا فطری کہہ لیجیے) پہلو سے صرفِ نظر

نہیں کیا اور پورا سچ لکھنے سے اپنے قلم کو نہیں روکا۔

پیغام آفاقی کی تخلیقی بصیرت، کردار شناسی، مجموعی حسیت اور زندگی کو ذاتی نقطہ نظر کے علاوہ کائناتی نقطہ نظر سے دیکھنے کی صلاحیت نے 'مکان' میں انسان کو انسان سے متعارف کرایا ہے۔ اس انسان کو جو بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے وہ انسان نیرا کے روپ میں اعلان کرتا ہے: 'میں حقیقت کو تسلیم کرنے نہیں حقیقت کو بدلنے نکلی ہوں۔'

ناول کے طویل مکالمے اور نیرا کی طویل خود کلامی ممکن ہے کچھ صاحبان نقد کے لیے قابل قبول نہ ہوں لیکن اگر ایک بار ان کی گہرائی میں اُتر کے ان کے ساتھ جم کے بیٹھ جائے قاری تو فکر کے نئے دریچے کھلنے لگتے ہیں۔ دراصل اس ناول کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغام آفاقی اس فکر کے قائل ہیں کہ کوئی رائے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے پوری قوت سے پیش کر دیا جائے۔ ان کی وہ رائے یا وہ عقیدہ کیا ہے جو وہ مکان کے صفحات میں پوری سچائی سے پیش کر رہے ہیں؟

وہ رائے یا عقیدہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان ظالم اور مظلوم کے علاوہ کسی تفریق کو نہیں مانتے۔ ظالم کے خوف کو وہ مظلوم کی چھوٹی سی ماچس کی ڈبیا سے کیسا تیلی جلا کے رکھ کرتے ہیں۔ دیکھئے: 'نیرا ایک ماچس کی ڈبیا خریدتی ہے۔ ایک پارک میں ایک اونچی چٹان کے نیچے ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ ماچس کی ڈبیا کھولتی ہے اور ایک ایک تیلی کر کے جلاتی ہے۔ اس خوف کے نام کہ اگر میں نے کمار سے جھگڑا کیا تو میری پڑھائی خراب ہو جائے گی۔ آج اس خوف کو جلا کے فنا کر رہی ہوں۔ اس خوف کے نام کہ لوگ مجھے تھانے اور کچہری جاتے دیکھ کے کیا کہیں گے۔ تیسری، چوتھی، پانچوی تیلی جلاتی ہے اور اپنے اندر کے خوف کو جلا جلا کے پھینکتی جاتی ہے 'پولیس اسٹیشن سے لگی امیدوں کے نام، کمار کے نام، راکیش کے نام، غنڈوں کے نام!'

غرض وہ ہر خوف کو ماچس کی چند تیلیوں سے جلا کے رکھ کر دیتی ہے۔ ان جلتی ہوئی تیلیوں میں اس نے آخری تیلی جلاتے ہوئے کہا: 'یہ آخری تیلی... ان تیلیوں کے نام... کہ میں رشتوں کے اس شمشان گھاٹ تک کو یاد نہیں رکھنا چاہتی۔'

اس ناول کو پڑھتے ہوئے میں نیرا کی اسی ماچس کی تیلی سے ایک شمع روشن کرنا چاہوں گی 'مکان' کے نام اور پیغام آفاقی کے تخلیقی منشور اور فکری وجدان کے نام!

◀◀ ● ▶▶

225 Webb Drive
Mississauga ON
Canada L5B 4P2

● یونس خان

ناول، بین الاقوامی تاریخ اور آتش رفتہ کا سراغ

ایک ایسی تحریر جو سیاسی واقعات، سیاسی نظام یا سیاسی نظریات پر بحث کرے سیاسی تحریر کہلاتی ہے۔ایسی تحریریں عموماً تنقیدی بھی ہوسکتی ہیں اور توصیفی بھی۔ایسی تحریر حقیقت کے قریب بھی ہوسکتی ہے اور مبالغہ آرائی پر مبنی بھی۔ایک ایسی تحریر جس کا ایک پلاٹ بھی ہو، جس میں کچھ کردار بھی ہوں اور اس کی کہانی میں واقعاتی تسلسل بھی ہو ناول کہلاتا ہے۔ناول کے کردار حقیقی بھی ہوسکتے ہیں اور افسانوی بھی۔ادبی اظہار کے لئے ایک ناول میں بیان کئے گئے واقعات حقیقت کے قریب تو ہوسکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ حقیقی بھی ہوں۔تاریخی پس منظر میں ماضی کے سماجی حالات کی تفصیل پر مشتمل ایک ایسا ناول کہ جس کے کچھ یا تمام کردار اور واقعات حقیقت پر مبنی ہوں کو تاریخی سیاسی ناول کہا جاسکتا ہے۔اب تک بین الاقوامی طور پر ایسے بے شمار ناول تحریر کئے گئے ہیں جن میں تاریخی پس منظر کے ساتھ سیاسی واقعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور ایسا ہی ایک ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' بھی ہے جسے ہندوستان کے ایک معروف لکھاری مشرف عالم زوقی نے لکھا ہے۔ اس ناول میں ایک نسبتاً چھوٹے واقعے 'بٹلہ انکونٹر' اور ایک بڑے سیاسی مذہبی واقعے 'بابری مسجد کا انہدام' کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس ناول کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ماضی کی بین الاقوامی تاریخ خصوصاً ایشیاء کی تاریخ کو سمجھا جائے۔تاریخ آپ کو بور کرسکتی ہے لیکن یہ وہ ہے جسے میں نے 'آتش رفتہ کا سراغ' پڑھ کر جانا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان ایک قوم تھے لیکن بٹوارے کے بعد ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ اب کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کا عام مسلمان پاکستان سے محبت نہیں کرتا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی حد تک پاکستان سے نفرت کرتا ہے۔ وجہ صاف ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اس تقسیم نے ان کی ہندوستان کے ساتھ صدیوں کی وفاداری کو شکوک وشبہات کی زد میں لا کھڑا کیا ہے۔عام مسلمان سمجھتے ہیں کہ جو پاکستان میں ہیں وہ بھی مصیبت میں ہیں اور جو پیچھے ہندوستان میں رہ گئے ہیں وہ بھی اپنی وفاداری کے ثبوت کو ترس رہے ہیں۔ جب کوئی آتنک وادی یا دہشت پسند شخص مارا جاتا ہے تو اس کی جیب سے اردو میں لکھا ایک پرچہ نکلتا ہے۔ یہ دہشت گرد ہر جگہ اپنے ہونے کے ثبوت لئے پھرتے ہیں سر پر ٹوپی، چہرے پر

داڑھی، عمر 15 سے 17 سال۔میڈیا اور سیاست، اسلامی آتنک واد، مسلم آتنک واد چیختی رہی اور عام مسلمان سیکولرازم کا لبادہ اوڑھ کر تماشا دیکھتا رہتا ہے۔انڈیا میں مسلم قیادت داغی ہوئی آتش بازی کی طرح رہتی ہے۔ ہمیشہ سے ہر حکومت انہیں لالچ دے کر اپنے منصوبوں میں اتارتی رہی۔ دہشت پسند تنظیمیں اور خفیہ ایجنسیاں مل کر کام کرتی ہیں۔ایجنسیاں مسلم دہشت گردی کی افواہیں پھیلاتی ہیں۔فرضی انکونٹرز ہوتے ہیں اور مٹھ بھیڑ دنگے فساد اس پراپیگنڈا کو بڑھاوا دیتے ہیں۔لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ گلوبل پاورز اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے بھیس میں اس مہم میں اتار رہیں ہیں۔انہیں عربی سکھائی جاتی ہے، اسلامی طور طریقے سکھائے جاتے ہیں۔داڑھی بنانے اور نماز کی صحیح ادائیگی کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ایک طرف تو یہ لوگ دہشت پسند کاروائیاں کرتے ہیں اور دوسری طرف بچوں کو بلاوجہ اشتعال دلایا جاتا ہے اور پھر اس آڑ میں وہاں کی پولیس انکونٹرز کرتی ہے۔ایسا ہی ایک فرضی 'بٹلہ انکونٹر' کھڑا کیا جاتا ہے۔اس انکونٹر میں دو نوجوانوں منیر اور ارشد کو مار دیا جاتا ہے۔ایک نوجوان آسامہ پاشا گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور ایک نوجوان علوی کو پولیس پکڑ لیتی ہے۔'بٹلہ انکونٹر' اس ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' کا ایک ضمنی موضوع ہے۔

پچھلے کوئی چودہ، پندرہ برسوں میں انڈیا میں دو ہزار سے زائد انکونٹرز ہوتے ہیں اور ان میں ہر دوسرا انکونٹر فرضی ہوتا ہے۔ ہر پولیس انکونٹر کے بعد پولیس کا پہلا کام ہوتا ہے اس انکونٹر کو صحیح ثابت کرنا اور پولیس اپنے ذرائع اور جبر سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانا اچھی طرح جانتی ہے۔فرضی انکونٹر کرنے والے پولیس والوں کو سزا اس لئے نہیں ملتی کہ ان کی جانچ کا کام بھی انہیں پولیس والوں نے ہی کرنا ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر دہشت گردی ایک نفسیاتی جنگ بن چکی ہے۔ عام مسلمان اس جنگ میں جسمانی طور پر بھی پس رہا ہے، روحانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔اس تین طرفہ حملے نے عام آدمی کو معذور اور مجبور کردیا ہے اور اب وہ یہ سوچتا ہے کہ اس کو سزا صرف اس لئے ملے گی کہ وہ کرتا پائجامہ پہنتا ہے اس کے سر پر ٹوپی ہے یا صرف اس لئے کہ وہ صرف ایک مسلمان نوجوان ہے۔

عالمی طاقتیں اپنے تمام انفراسٹرکچر، اپنے وسائل اور اپنے لاجسٹک سپورٹ سے اس دہشت گردی کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔افغانستان سے عراق اور پاکستان سے کشمیر تک۔صرف ایک تہذیب رہ گئی ہے اور وہ ہے دہشت گردی کی تہذیب۔نئی دنیا اسی تہذیب کے سائے میں پل رہی ہے۔ جارج بش نے مسلمانوں کی طرف بندوق تان کر دہشت گردی کی اس تہذیب کو بڑھاوا دینے کے لئے ایک غیر محفوظ امریکہ کو جنم دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب عالمی سیاست صرف ایک خوف کا بوجھ اٹھا رہی ہے اور وہ ہے دہشت گردی۔

قلم کی ذمہ داری اٹھانے والے ہر شخص کو اپنے منصب کو پہچاننا چاہئے۔قلم کی ذمہ داری کو پہچاننے والا کوئی بھی شخص مسلمان یا ہندو یا عیسائی نہیں ہوتا۔ ہندو، عیسائی یا مسلمان ہو کر وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کر ہی نہیں سکتا۔پھر چاہئے ادب کا میدان ہو یا صحافت، یہاں بس عام انسان ہو کر اسے لکھنا ہوتا ہے کہ

جو سچ ہوتا ہے لیکن میڈیا کسی بھی ایسے واقعہ پر جس میں مسلمانوں کو ملوث کیا جا رہا ہو ایک طرح کا شور اور ہنگامہ شروع کر دیتا ہے کہ جیسے کوئی بھی مسلمان اس دہشت گردی سے الگ نہیں۔ جیسے ہر مسلمان بچہ مدرسے میں پڑھتا ہے جبکہ مدرسے آتنک کی فیکٹریاں ہیں۔ جہاں اسلحے اور بم بنائے جانے کے طریقے سکھلائے جاتے ہیں اور تمام دنیا میں بسنے والے مسلمان انہیں بموں اور اسلحوں سے کھیل رہے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کا ہر مسلمان آتنک وادی ہے لیکن ملک پر سب سے بڑا آتنک وادی حملہ بابری مسجد پر ہوا تھا۔ اس مسجد کو ڈھانے میں کون لوگ شامل تھے، یہ ساری دنیا جانتی ہے۔ یہ عقدہ بھی کھل چکا کہ یہ طاقتیں مسلمانوں کو کمزور کرنا چاہتی ہیں اور یہ طاقتیں ان جگہوں پر ہی ہاتھ ڈالنا پسند کرتی ہیں جہاں مسلمان معاشی اور اقتصادی طور پر مضبوط ہیں۔ بھاگلپور سے مالیگاؤں اور بھیونڈی تک مسلمانوں کا اتحاد اور خوشحالی ہی دراصل فساد کی اصل وجہ ہے۔ کوئی بھی حکومت ہو اس سازش میں شریک کار نظر آتی ہے۔ میڈیا تک عام مسلمانوں کی آواز نہیں پہنچتی اور جن لوگوں کی آواز پہنچتی ہے ان کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ یہ لوگ محض مسلمانوں کی سیاست کرنا چاہتے ہیں۔ 'بٹلہ ہاؤس' جیسا ایک بڑا واقعہ ہو جاتا ہے اور یہ سیاسی رہنما شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لیتے ہیں کیوں جو اگر آواز اٹھائی تو حکومت سے ملنے والے مفادات پر زک آئے گی۔

انسان کتنا ہی کامریڈ بن جائے مذہب کے خلاف بغاوت کر دے لیکن ہماری سنسکرتی، ہماری جڑیں.....ایک مذہب کہیں نہ کہیں چھپا بیٹھا رہتا ہے اور کسی نہ کسی حادثے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جیسے ہی کوئی حادثہ ہوتا ہے پلک جھپکتے ہی وہ سامنے آجاتا ہے۔

فسطائیت اپنی طاقت، توانائی اور مقبولیت عوام کی حکمرانوں سے شکایات اور ان کی نفرت سے حاصل کرتی ہے۔ فسطائیت ناکام، بے کار اور بے روزگار نوجوانوں سے ان طبقات سے انتقام لینے کی راہ سجھاتی ہے جن کی وجہ سے ان کو ناکامی دیکھنا پڑی اور بے روزگاری اور بے کاری کی چکی میں پسنا پڑا۔ یہ ایسے ناکام لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی امنگوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کو سماجی قوانین سے ضد ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی وہ قوانین ہیں جو ان کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ سیاست دان ایسے بیکار اور غیر مطمئن لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیتے ہیں اور پھر ان کی مشکلات سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فاشسٹ کے لئے امن اور سکون ترجیح نہیں ہوتا ان کے نزدیک امن کے لئے کئے گئے اقدامات بزدلی کی علامت ہوتے ہیں۔ فاشسٹ تشدد پر یقین رکھتے ہیں اور دوسروں کو تشدد پر اکساتے ہیں۔ ایک لبرل شخص، انسان کے زندہ رہنے کے حق، آزاد رہنے کے حق اور سر پر چھت رکھنے کے حق کو تسلیم کرتا ہے جب کہ فاشسٹ دوسروں کو یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ فاشزم کی ضد لبرل ازم ہے۔ فاشزم، جمہوریت کے بھی خلاف ہے اور سوشل ازم کے بھی۔

آج ہمیں ایک اور قسم کی فسطائیت کا سامنا ہے، یہ فسطائیت ہے عقل دشمن نظریات کی، یہ

فسطائیت ہے مذہبی عدم رواداری کی، یہ فسطائیت ہے مذہب کے نام پر سیاست کی۔ لوگوں کو چونکہ نفرت کے نام پر ابھارا جا سکتا ہے اس لئے اپنے سیاسی اور گروہی مفادات کے لئے کبھی ایک شخص کو اور کبھی ایک قوم کو اپنا دشمن گھڑ لیا جاتا ہے۔ یہی وہ موضوع ہے جسے مشرف عالم ذوقی نے ''آتش رفتہ کا سراغ'' میں خوب صورتی سے برتا ہے۔

اٹلی میں فسطائیت کے خلاف 1933ء میں اگناز ئیو سلونے کا لکھا ناول 'فونطامارا' ہو یا جاپان میں مذہبی عدم رواداری پر 1966ء میں لکھا گیا سوزا کو اینڈو کا ناول 'خاموشی' ان کا موازنہ 'آتش رفتہ کا سراغ' سے ہو سکتا ہے بلکہ کچھ حوالوں سے 1938ء میں جارج اورویل کی سپین کی خانہ جنگی پر لکھی خود نوشت 'ہومیج ٹو کیٹیلونیا' سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس جنگ میں بہت سارے لکھاری بھی شامل تھے۔

سٹیٹ ٹیررازم کے حوالے سے 'بٹلہ انکونٹر' کو انڈیا جیسے ترقی پذیر لیکن ایک بڑی جمہوریت میں ناول کا موضوع بنانا بہت اہم ہے۔ روسی انقلاب کو زیر بحث لانے پر بورس پیسٹرناک کا ناول 'ڈاکٹر ژواگو' روس میں بین ہو جاتا ہے۔ ہٹلر اور نازی ازم پر تنقید کرنے پر ہرمن ہیسے کو جلاوطن ہونا پڑتا ہے۔ بعد ازاں اس کی کتابوں کو سڑک پر رکھ کا آگ لگا دی جاتی ہے اور 1930ء کے بعد اس کی تحریروں کو جرمنی میں چھاپنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ جارج اورویل کا مطلق العنانیت پر لکھا ناول '1984ء' ہو یا رشین انقلاب کے پس منظر میں لکھا گیا ناول 'اینمل فارم'.....روس میں بین ہو جاتے ہیں۔

نسیم حجازی کے ناول 'خاک اور خون'' پر انڈیا میں پابندی لگ جاتی ہے لیکن 'آتش رفتہ کا سراغ' چھپ جاتا ہے جس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم نے مجموعی طور پر کچھ سفر آگے کی طرف بھی کیا ہے کہ ہم مسلمان اب اپنا نقطہء نظر بیان کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔ جب انسان اپنا نقطہء نظر پیش کرنے کا اہل ہو جاتا ہے تو انسانیت کے آگے بڑھنے کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخر انسان کتنے عرصے تک پابندرہ سکتا ہے؟

معاشروں میں آنے والی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو دنیا سے اگاہ کرنے کے لئے دنیا بھر کے ادیب جس میڈیا کا سہارا لے رہے ہیں ان میں ناول کی صنف بھی شامل ہے۔ نوآبادیاتی نظام کا شکار ممالک نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد کی صورت حال کو پیش کرنے کے لئے جن زرائع کا سہارا لے رہے ہیں ان میں ناول بھی شامل ہے۔ ایسا ہی ایک ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' ہے جسے مشرف عالم ذوقی نے لکھا ہے جن کا تعلق ہندوستان سے ہے۔

◀◀ ● ▶▶

P-21 Street-10 Block- X
New Satellite Town Sargodha, Pakistan

● ابو فہد

8077_1536573
not found.

اسلامی افسانوی ادب

ادب جب بے مقصدیت اور غیر اخلاقیت کے دوراہے سے گزر کر فنٹسی اور پورنیات کے متعفن زدہ بدبو دار گلیاروں میں بنا کسی پیش بندی اور تحفظِ ذہنی کے داخل ہوگیا، بلکہ کسی قدر فخریہ جذبات اور وفورشوق کی جلوہ سامانیوں اور تمام تر ہنرمندی اور کمالِ ذہنی کے ساتھ داخل ہوا اور پورا کا پورا داخل ہوا جس کے نتیجے میں ادب ماسوائے ادب کے تمام طرح کی بے ادبیوں کی آماجگاہ بن گیا تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ ادب کی درجہ بندی کی جائے اور صالح اور نافع ادب کو غیر صالح اور غیر نافع ادب سے الگ کیا جائے یا کم از کم اس کے بالمقابل ادب کے وہ نمونے سامنے لائے جائیں جو انسانی زندگی کے کارواں کو آگے بڑھانے کے لیے معاون ہوں اور ایسے نمونے تخلیق کرنے والے روحانیت اور تقدیسیت کی ضرورت کو نہ صرف یہ کہ محسوس کرتے ہوں بلکہ اسے ہر قیمت پر حرز جاں بنائے رکھنے کے قائل اور داعی ہوں ۔اور ہر طرح کے سطحی، قبیح اور سفلی جذبات کو ابھارنے والے منظر، بری اور گھٹیا سوچ کے در آنے سے اور برہنہ لفظ کو جانتے بوجھتے زیرِ نوک قلم لانے سے احتراز کرنا گویا ان کی علوشان کے لیے ضروری ہو۔ وہ ایسا ادب تخلیق کرنے پر قدرت رکھتے ہوں جسے پڑھ کر انسان کے اندر ملکوتی صفات پیدا ہوں اور انسان کو اپنے رب سے اپنے رشتہ عبد و معبود کو استوار کرنے میں اس کے ذریعہ مدد مل سکے۔ ایسا ادب جو ایک طرف انسانی رفعتوں کو پروان چڑھانے میں انسان کا معاون ہو تو دوسری طرف ابلیس اور اس کے کارندوں کے دام تزویر سے انہیں آگاہ اور خبردار رکھ سکے۔ وہ ادب جو مادی اسباب اور بیرونی دباؤ کے بغیر قلم کار کے ضمیر اور اس کے دل کی آواز پر لبیک کہنے والا ہو جو بلا کسی خوف اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے نیاز اور بے پروا ہو، جس کے پیش نظر بلند مقاصد ہوں، ایسے مقاصد جو پیٹ اور جسم کے مطالبات اور اس کے تقاضوں سے ماورا ہوں اور ان میں انسانیت کے تئیں دردمندی، بے باکی اور بے خوفی رچی بسی ہو۔

آج کا ادب جو اپنی تمام تر ادبیت، افسانویت، رومانویت اور فنیت کے علی الرغم اپنی اخلاقی، روحانی، انسانی اور سماجی ذمہ داریوں سے نظریں چراتا نظر آتا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ وہ ایک بہکائی ہوئی فکر کے پیچھے ایک لہکائے ہوئے شکاری کی طرح سرپٹ دوڑ رہا ہے، ایسے ادب کے لیے ضرورت بلکہ بہت زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں وہ روحانی اور ایمانی قوت پیدا کی جائے کہ وہ اپنی ان

سماجی اور انسانی ذمہ داریوں سے بحیثیت ایک ذمہ دار فرد کے صحیح معنیٰ میں اور درست طور پر عہدہ برآں ہو سکے۔ جو انسان کو اس کا مقصد زندگی یاد دلائے، اس کے پیدا کرنے والے نے جو پیغام دے کر اسے اس دنیا میں بھیجا ہے اس کو سمجھے اور اس میں اتنا حوصلہ پیدا کرے کہ وہ ابلیس اور ابلیسی فکر و فلسفہ کا مقابلہ کر سکے جو بیک وقت خالق اور مخلوق دونوں کا ازلی دشمن ہے، جو انسان اور جنات کی رگوں میں خون کے بہاؤ کے ساتھ دوڑتا ہے اور جسے یہ قدرت اور اجازت حاصل ہے کہ وہ انسان پر آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، چہار جانب سے حملہ آور ہو سکے۔ اور اس کی آخری کوشش یہ ہو کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان دوریاں اور بے گانگیاں پیدا کر دے۔

چنانچہ ادب کے لئے اچھا سوچنے اور انسانیت کے لیے قابل قدر اور معیاری چیز تلاشنے والوں نے ادب کو غیر صالح اور غیر نافع عناصر سے پاک کرنے کی سعی کی۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے بجا طور پر اسلامی ادب اور غیر اسلامی ادب کی اصطلاح کا سہارا لیا اور ادب کو وہ قالب، وہ زندگی، وہ ذوق و شوق اور وہ لب و لہجہ دینے کی کوشش کی جس پر بہر صورت فخر کیا جا سکتا ہے اور جسے بہر صورت اسلامی ادب کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

اب سے تقریباً پچیس سال قبل ڈاکٹر مامون فریز جرار نے 'خصائص القصۃ الاسلامیۃ' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی اور اس میں یہ دکھانے یا پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی کہ خاص اس ضمن میں عربی ادب میں کیا کیا سرگرمیاں رہی ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے معاصر عربی ادب کا جائزہ بھی لیا ہے اور پھر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی افسانوی ادب کے مقاصد، شرائط، طریقہ کار اور شرائط کیا ہونا چاہئے۔ اور جبکہ انہوں نے قرآن و حدیث میں وارد سچے قصوں اور سچی کہانیوں کا فنی سطح پر جائزہ لیا ہے تو وہاں پر بھی یہ دکھانے کی کوشش کی ہے آج کی دنیا کا ادب فنی سطح پر قرآن و حدیث سے کتنی مماثلت رکھتا ہے۔ اور پھر انہوں نے اس کو بطور دلیل بھی پیش کیا ہے کہ با مقصد افسانوی ادب میں مشغول ہونا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ وہ کسی قدر مستحسن بھی ہے بلکہ اس سے بہت بڑا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے اس کتاب کا سلیس اور کسی قدر آزاد اردو ترجمہ کر کے اردو میں بھی اسلامی افسانوی ادب کی از سر نو بنا ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے بڑی اخاذ اور سیلانی طبیعت پائی ہے، ابھی تو ان کے قلم کی جولانیوں کی ابتدا ہے اور ابھی سے انہوں نے گراں قدر علمی، ادبی اور تحقیقی چیزیں پیش کر کے قارئین کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان کا قلم جوش و جذبے سے بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ وہ اردو اور عربی دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں، اگر اردو کے حوالے سے بات کریں تو ان کے قلم میں ادبی چاشنی اور انشا کی لذت صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ پہلے مرحلے میں یہ ان کا اسلوب نگارش ہی ہے جو قاری کو اپنی جانب

راغب کرتا ہے اور پھر قاری ان کا اپنا ہو کر رہ جاتا ہے۔

دو سو سولہ صفحات کی یہ کتاب آٹھ فصلوں پر تقسیم کی گئی ہے۔

۱۔ادب اسلامی

۲۔معاصر عربی افسانوی ادب

۳۔قصص قرآن

۴۔قصص حدیث نبویؐ

۵۔اسلامی افسانوی ادب کی تخلیق کے شرائط

۶۔اسلامی افسانوی ادب کے مصادر

۷۔اسلامی افسانوی ادب کی خصوصیات

۸۔اسلامی افسانوی ادب کے مقاصد

یوں تو تمام ابواب اپنی جگہ اہم ہیں تاہم خصوصیت کے ساتھ آخر کے دو باب زیادہ اہم ہیں کہ انہیں میں کتاب کا مقصد اور غایت پائی جاتی ہے اور وہی حتمی طور پر اسلامی افسانوی ادب لکھنے والوں کے لیے ایک طرح گائڈ لائن فراہم کرتے ہیں۔اگر کوئی قلم کار جو ادب اسلامی میں اپنی طبیعت کی جوہر افشانی اور جولانی دکھانا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہ دو ابواب کافی وشافی رہنما خطوط فراہم کرتے ہیں۔

سر دست یہ بھی بتا تا چلوں کہ اسلامی ادب کا مطلب صرف وہ ادب ہی نہیں ہے جو شیخ وحرم، مسجد ومحراب اور قرآن وسنت کے ارد گرد گھومتا ہو۔جس کی زبان اور اسلوب عربی زبان وادب سے متاثر ہو اور جس کے موضوعات تمام تر وہی موضوعات ہوں جو اپنا ایک مذہبی ہیولا اور تقدیسی رجحانات رکھتے ہوں، بلکہ اسلامی ادب اپنے وسیع تر مفہوم میں پوری انسانیت کو بلکہ کل کائنات کو، اس کی کنہہ کو، اس کے مسائل کو، اس کے سود وزیاں کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ ہر وہ ادب اسلامی ادب کہلائے جانے کا مستحق ہے جو منفی خیالات کا آئینہ دار نہ ہو، حرم اور مقدساتِ حرم، اسلام اور شعائر اسلام کی ہجو نہ کرتا ہو اور جو انسان کو اس کے معیارِ اشرف المخلوقات سے گرانے کا روادار نہ ہو۔جس طرح فقہہ کا یہ اصول ہے کہ اشیا کی اصل حلت ہے اور حرمت کسی خارجی عارضہ کی وجہ سے یا قطعی الدلالہ نص کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح ادب کو اس کے تمام اصولوں اور آداب کے ساتھ اس وقت تک صالح اور نافع ادب کے زمرے میں رکھا جائے گا جب تک کہ اس میں غیر صالح اور غیر نافع عناصر کی آمیزش نہ کر دی گئی ہو۔اس طرح بہت سارے ایسے افسانے اور ناول وغیرہ بھی اسلامی ادب کے زمرے میں آئیں گے اور بجا طور پر آئیں گے جو کائنات کے راز ہائے سربستہ سے پردہ اٹھاتے ہیں، انسانی نفسیات کی گرہ کشائی کرتے ہیں، انسانیت کے فروغ میں اپنا سا واجبی کردار ادا کرتے ہیں، اب چاہے وہ اپنے پلاٹ، نفس مضمون اور کرداروں کے حوالے سے دور دور تک بھی

اسلامی رنگ وبو اور اسلامی خصوصیات، تہذیب اور ثقافت سے بالکلیہ ہم آہنگ نہ ہوں۔اور چاہے ان کو ضبط تحریر میں لانے والا خود بھی مسلمان نہ ہو۔مگر بس اس لیے کہ وہ ادبی شہہ پارہ بجائے خود منفی خیالات کا حامل نہیں، غیر انسانی اقدار اور بہیمی صفات کا داعی نہیں اور اپنے اندر ایسا کوئی پیغام نہیں رکھتا جو تعمیر انسانیت کے منافی ہو بلکہ وہ شعوری یا غیر شعوری سطح پر انسانیت کے فروغ کا حامی یا داعی ہے تو اسلامی ادب میں شمار کئے جانے کا بجا طور پر مستحق ہے۔

عربی میں یہ کتاب پچیس برس قبل وجود میں آچکی تھی، جو اس بات کی غماز ہے کہ خصوصا عرب اس حوالے سے کافی مستعد اور چوکس ہیں، انہوں نے ادب کی طاقت وقوت کو اور دلوں پر اس کی سحر آفرینی کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا لہذا انہوں نے بہت جلد فیصلہ کر لیا کہ افسانی ادب کو جو شاعری کے مقابلے میں کافی بعد کی چیز ہے مثبت اور تعمیری کام کے لئے استعمال کرنا ناگزیر ہے۔ایک طرف تو انہوں نے اس افسانی ادب کی قوت وتاثیر کو محسوس کیا، اس کے دور رس اور دیرپا اثرات کو جانا اور دوسری طرف اس کے ذریعہ کئے جانے والے انسانیت کش پروپیگنڈے اور بیگار کے عمل کو محسوس کیا اور یہ جانا کہ وہ نہ صرف محض انٹرٹینمنٹ کا ایک ذریعہ ہے، تھوڑی دیر کی مادی اور جسمانی انبساط کا باعث ہے بلکہ بڑے پیمانے پر اس کو ہاتھ کے رومال کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے ذریعہ انسانی طبیعتوں کو بہیمی صفات کا خوگر بنایا جا رہا ہے اور اس کا مقصد تھوڑی دیر کی خوشی، ذرا دیر کی واہ واہ اور محض مادی فوائد حاصل کرنا ہے۔تو انہوں نے اس کو بہتر رخ دینے کی کوشش کی اور اسلامی افسانوی ادب کے فروغ کی بات کہی۔اور دیکھتے دیکھتے ایک اچھا سلسلہ چل نکلا۔

اردو زبان میں بھی اس کو محسوس کیا گیا اور اس کے لئے کوششیں کی گئیں، اور اردو کے قارئین کے لیے بطور خاص مسلمان قارئین کے لیے ایسا افسانوی ادب تیار کیا گیا جو تعمیر انسانیت کا باعث بن سکے۔عبد الحلیم شرر، ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا، نسیم حجازی، صادق سردھنوی، فضل احمد فضلی، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، ایم اسلم، الیاس سیتاپوری وغیرہ سیکڑوں نام ہیں جنہوں نے اسلامی فکر وفلسفہ کو پیش نظر رکھ کر افسانوی ادب تیار کیا۔''اُردو ناولوں میں دینی پس منظر اور مذہبی فلسفہ'' کے نام سے خرم سہیل نے اچھا مضمون ترتیب دیا ہے۔انہوں نے وضاحت کی ہے کہ آزادی کے بعد بھی بہت سارے ناولوں میں کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر اسلامی فکر وفلسفہ اور دینی رجحان کی عکاسی ملتی ہے۔اور انہوں نے اپنے مضمون میں اس ضمن میں ایک پی ایچ ڈی کے مقالے کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے میری نظر سے پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی گزرا۔جس کا عنوان ''پاکستانی اردو ناولوں میں اسلامی فکر کی عکاسی'' تھا۔مقالہ نگار کا نام حافظ نعیم مظہر ہے۔انہوں نے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں ڈاکٹریٹ کی غرض سے یہ مقالہ لکھا۔انہوں نے بہت

اچھا اور معیاری کام کیا، مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس مقالے میں تمہیدی رویہ ترک کر کے تحقیق کا ایک بہت بڑا حصہ موضوع سے ہٹ کر نہ لکھتے، تو اس مقالے میں اور جان پڑ جاتی۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ کام قابل تعریف ہے، ایسے مقالہ جات کو کتابی شکل میں شائع ہونا چاہیے۔''

ماقبل تقسیم وطن کے متصل دور میں اسلامی ادب کے نام سے باقاعدہ ایک تحریک شروع کی گئی تھی جس سے مولانا مودودی اور ماہر القادری جیسے عبقری لوگ وابستہ تھے اور اس تحریک کا مقصد ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے ادب کے اثرات کو محدود کرنا تھا۔ بعد کے دور میں عربی زبان میں خاص طور پر اور اردو میں ضمنی طور پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے باقاعدہ تحریک شروع کی اور رابطہ ادب اسلامی کے نام سے ایک وسیع پلیٹ فارم فراہم کیا جس کے تحت عربی کے بڑے بڑے باکمال ادبا و شعراء اس سے وابستہ ہوئے اور عالم اسلام کے تمام قابل ذکر مقامات پر رابطہ ادب اسلامی کے تحت بڑے بڑے سیمینار منعقد کئے جانے لگے۔ مولانا علی میاں ندوی نے خود اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے تھے کہ اسلام پر تین حملے کئے گئے۔
پہلا حملہ یونانی فلسفے سے ہوا (اس کا جواب علماء نے علم کلام سے دیا) اسلام پر دوسرا حملہ صلیبی جنگوں سے کیا گیا (جس کا جواب سلطان صلاح الدین ایوبی نے دیا)۔
تیسرا حملہ اسلام پر ادب کے ذریعہ مستشرقین نے کیا۔ میں نے (علی میاں ندوی نے) رابطۂ ادب اسلامی کی تحریک کو اسلام پر ادب کے ذریعہ حملے کا جواب دینے کے لیے قائم کیا ہے۔''

یہ کتاب حتمی طور پر اس فکر کو اجاگر کرتی ہے کہ قرآن وسنت میں اس بات کی شہادت اور قرائن موجود ہیں کہ افسانوی ادب کو ایک فن کے طور پر نہ صرف یہ کہ قبول کیا جاسکتا ہے بلکہ اس میں جو قوت وتاثیر پائی جاتی ہے اس سے دین وایمان اور عمل صالح کے باب میں بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں، ایک خطیب اپنے خطاب سے، ایک مصنف اپنی تصنیف سے ایک عالم اپنے علم سے اور ایک درویش اپنی درویشانہ شان سے، ایک مجاہد اپنے جہاد سے، ایک حاکم اپنی انصاف پسندی سے اور ایک تاجر اپنی ایمانداری اور کریمانہ اخلاق سے دین وایمان اور انسانیت واخلاق کا جیسا اور جتنا کام لے سکتا ہے، کم وبیش اتنا ہی یا بسا اوقت اس سے بھی کہیں زیادہ ایک افسانہ نگار اور ایک ناول نویس اپنے افسانے اور ناول یا افسانوی ادب کی کسی دوسری صنف سے لے سکتا ہے۔

اس کتاب میں قرآن وحدیث میں وارد قصوں (جن کے لیے خود قرآن نے 'احسن القصص' کی تعبیر اختیار کی ہے) کا جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ بجائے خود بہت کارآمد اور مفید چیز ہے بلکہ وہ اس لائق ہے کہ اس کو ایک مستقل تصنیف یا رسالے کی شکل دے کر شائع کیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ کام بڑی

باریک بینی اور ژرف نگاہی اور مستعدی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مصنف کو اپنے موضوع پر مکمل عبور اور اپنے قلم پر پوری دسترس حاصل ہے۔ اس طرح کا فنی تجزیہ سید قطب شہید کی کتاب ''التصویر الفنی فی القرآن'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران آپ بجا طور پر محسوس کریں گے کہ جدید افسانوی ادب میں اور قرآن وحدیث میں وارد قصوں میں کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور دونوں اپنی فنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں۔ البتہ ایک چیز جو مجھے ان دونوں کے مابین متغایر نظر آئی بلکہ وہ تنہا ایک ایسی چیز ہے جو دونوں کے درمیاں بعد المشرقین یقین آسا دوریاں پیدا کر دیتی ہے، اور مصنف نے بھی اس نکتہ کو شرح وبسط کے ساتھ نہیں اٹھایا اور اس کا کافی وشافی جواب نہیں دیا اور وہ چیز یا نکتہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں وارد تمام قصے چاہے وہ ہماری اس جیتی جاگتی دنیا سے متعلق ہوں یا عالم بالا سے، چاہے وہ کسی کی آپ بیتی ہوں یا محض کوئی خواب، اب یہ خواب ایک عام آدمی کی خوابیدہ آنکھوں نے دیکھے ہوں یا کسی نبی یا ولی یا پھر کسی حاکم یا بادشاہ کی خوابیدہ یا جیتی جاگتی آنکھوں نے، ان سب سے متعلق یہ بات اپنی جگہ پر سچ ہے کہ وہ ایک سچ پر مبنی ہیں۔ حقیقت ایک ایسی چیز ہے جو قرآن وسنت میں وارد ہر حکم، ہر واقعہ اور ہر انذار اور تبشیر سے متعلق ہے، وہاں افسانویت کو اور خیال آرائی کو کچھ دخل نہیں، نہ نفس مضمون کے لحاظ سے، نہ واقعہ کے کسی جزو کے لحاظ سے۔ وہاں ایک ایک خیال، ایک ایک لفظ اور ایک ایک نکتہ حقیقت پر مبنی ہے۔ جبکہ افسانوی ادب کی دیگر اصناف میں سچ مکمل حقیقت نہیں ہے بلکہ یہاں 'خیال' ہی پہلی اور آخری حقیقت ہے، یہاں افسانویت ایک سچائی ہے باقی جو کچھ ہے وہ جھوٹ ہے، خیال ہے اور فریب ہے۔ یہاں خیال آفرینی کمالِ فن ہے۔ تو جن دو چیزوں کے درمیان حقیقت یا سچائی ہی بذات خود مابہ الامتیاز ہو وہاں کسی ایک کا موازنہ دوسرے کے ساتھ کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ پھر قرآن وحدیث میں وارد حقیقی قصوں کو کس طرح دلیل بنایا جاسکتا ہے ایسے قصوں اور کہانیوں کے لئے جو سرتاپا غیر حقیقی، افسانوی اور خیالی ہیں۔ اس کا جواب بہتر طور پر دینا چاہئے تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا افسانوی ادب کو اسلامی افسانوی ادب بننے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ کسی بھی طرح سے اسلام کے عمومی فکر ورجحان سے متصادم نہیں اور اگر کسی نہ کسی درجہ میں وہ اس کو پروان چڑھانے، اسے سہارا دینے یا کسی بھی حیثیت سے اس کا وکیل اور موئید بننے کے لئے تیار ہے تو یہ بہت کافی ہے کہ وہ اسلامی ادب کہلائے۔ خود زیر تبصرہ کتاب میں اسلامی ادب کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''وہ افسانوی ادب جس میں ناول نگار وافسانہ نویس کائنات وانسان اور انسانی زندگی کے ماضی وحال کے سلسلے میں اسلامی تصور کے مطابق اپنے خیالات کو تعبیرات کا جامہ پہنائے اسے اسلامی افسانوی ادب کہا جائے گا۔''

پھر اس تعریف کی وضاحت اس طرح ملتی ہے:

''اس تعریف سے جو بنیادی شرط ظاہر ہوئی وہ یہ کہ ناول وافسانہ اور کہانی کسی طور پر بھی اسلامی تصور کے خلاف نہ ہو، یہ ایسی فکری شرط ہے کہ جو تخلیق کار کے ہر اقدام پر عائد ہوتی ہے، خواہ وہ موضوع کا انتخاب ہو، یا اس کو برتنے کا طریقہ، یا شخصیات کی تصویر کشی، یہ شرط اس کو کائنات میں جاری اللہ تعالیٰ کے قوانین سے مرتبط کرتی ہے، اس بنیادی شرط کو پورا کرنے کے بعد وہ اپنی پسند کی شخصیت اور اپنی پسند کا پلاٹ تیار کرتا ہے۔''

آگے ہے:

''اس تعریف سے ہمارے لیے تخلیق اور تخلیق کار کے درمیان تمیز کرنا بھی آسان ہے، چنانچہ ہر مسلم تخلیق کار کی ہر ناول اور اس کا ہر افسانہ اسلامی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اسلامیت کی عدم موجودگی سے وہ حدود اسلام سے باہر نکل جائے گا۔''

اور اگلے پیرا گراف میں ہے:

''شیخ محمد قطب نے غیر مسلموں مثلاً ٹیگور وغیرہ کی بھی بعض چیزوں کو یہ کہتے ہوئے اسلامی ادب میں شامل کیا ہے کہ یہ تصور عالمی اور انسانی ہے اور پوری بشریت اس کو اپنانے میں آزاد ہے۔''

عربی کی تو خیر بات ہی الگ ہے، اس میں پہلے ہی سے کافی کام ہو رہا ہے اور اب مولانا علی میاں ندوی مرحوم کی کوششوں سے اس کو رابطہ ادب اسلامی کا ایک وسیع پیلٹ فارم بھی مل گیا ہے تاہم اردو میں اس ضمن میں پہلے کچھ کوششیں ہوئی تھیں مگر بعد میں ان کا سلسلہ رک گیا، عبدالحلیم شرر، مولوی ذکا ءاللہ اور مولوی نذیر احمد، نے جو بنا ڈالی تھی تقسیم وطن کے بعد وہ جیسے ڈھے سی گئی یا اس کی اٹھان رک گئی، باوجودیکہ اس کے بعد لکھے جانے والے افسانوں، کہانیوں اور ناولوں میں کم از کم قومی مسائل کا احاطہ کیا گیا، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلامی تہذیب اور نظریات کی عکاسی کی گئی تاہم یہ سب کچھ بہت ڈھکا چھپا اور محدود پیمانے پر ہی ہوسکا۔ بلکہ اس کے برعکس ادب عمومی طور اجنبی تہذیبوں کا علمبردار اور غیر اسلامی تحریکات کا آلہ کار رہا اور اسلام، مسلمان، اسلامی اقدار سے جیسے اسے چڑھ رہی چنانچہ اس نے کبھی ببانگ دہل اور کبھی خفیہ طور پر اسلام، اسلامی اقدار اور تہذیب وثقافت کا خاکہ اڑایا اور اسلامی شخصیات کو اسلامی تحریکات کو بلکہ اسلام سے متعلق اور وابسطہ ہر شناخت اور ہر چہرے کو اپنے باغی وشرکش اور دریدہ دہن قلم کی نوک پر رکھ لیا۔ اور ادب بحیثیت مجموعی اسلام کی رسوائی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ سبب بنا۔

یہ کتاب ادب کے اسی مکروہ چہرے سے نقاب اتارنے کے مقصد سے ترتیب دی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کے اسی زرخیز زمانے کو بازیاب کرنے کا باعث بنے گی جو مذکورہ معروف ادبی شخصیات کا

زمانہ رہا ہے۔ یہ کتاب ایک طرف ان ادباء کے لئے راہنما ثابت ہوگی جو پہلے سے ادب سے وابسطہ ہیں مگر محض اس حد تک کہ ادب محض انٹرٹین کرنے اور پیسہ وناموری کمانے کا ایک ذریعہ ہے کوئی بہت آگے بڑھا تو اس کی نظر ملکی اور غیر ملکی ایوارڈز پر رہی اور ادب کا نوبل پرائز حاصل کرنا تو گویا جنت کا ٹکٹ حاصل کرنے سے بھی بڑی بات ہوئی۔ اسلامی فکر ورجحان ان کے پیش نظر نہ کبھی رہا اور نہ وہ اس رجحان کی طرف مائل ہونا چاہتے ہیں، مبادا ان کے ادب پر قومی ادب کا ٹیگ لگ جائے اور وہ عالمی ادیب کے طور پر اپنی شناخت کو بنا سکنے سے پہلے ہی کہیں گم کر دیں۔

اور دوسری طر یہ کتاب ان تمام اہل علم کے لیے بھی راہنما ثابت ہوگی جو تصنیف وتالیف، صحافت، قرآن وسنت کی تشرح وتوضیح اور تبلیغ اور درس وتدریس کے اپنے جیسے طور طریقوں میں تو مشغول ہیں مگر ادب کو اظہار مافی الضمیر اور قرآن وسنت کی تشریح وتوضیح کیلئے بہتر اور مؤثر ہتھیار اور ذریعہ تسلیم نہیں کرتے یا کرتے بھی ہیں تو انہوں نے خود اس میدان میں آنے کا کبھی نہیں سوچا اور اگر کسی نے کبھی سوچا بھی تو پہلے سے رہنما خطوط نہ ہونے یا افراد نہ ہونے کے باعث ہمت جٹا پانے سے قاصر رہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یقیناً ان لوگوں کو بھی راہ ملے گی۔ کہ جس طرح ان میں بے شمار لوگوں نے صحافت کو، شاعری کو اور انشا پردازی کو اظہار مافی الضمیر کے لیے قوی اور مؤثر ذریعہ جان کر اختیار کیا اسی طرح وہ اسلامی افسانوی ادب کو بھی قابل اعتنا گردانیں گے اور آنے والے دنوں میں اس میدان میں بھی اپنی طبیعتوں کی جولانیاں دکھائیں گے۔ اور پھر اس طرح ایک طرف بیش قیمت اسلامی ادبی شہہ پارے وجود میں آئیں گے اور دوسری طرف ادب کی راہ سے جو الحاد اور مادیت کا سیلاب بلا اٹڈا چلا آرہا ہے اس پر بھی کسی نہ کسی درجہ میں روک لگے گی۔

مجموعی طور پر کتاب عمدہ ہے، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی تشفی بخش ہے، کتاب میں کتابت اور املا کی کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور ترجمانی میں کہیں کہیں عربی الفاظ اور عربی پیرایہ بیان در آیا ہے جس سے اردو کی سلاست اور چاشنی میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ تو اس ضمن میں مصنف سے بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اگلے ایڈیشن میں اس طرف دھیان دیں گے۔ اور اس کی طباعت کو مزید بہتر بنانے کے لیے مزید کوشش کریں گے۔

◀◀ ● ▶▶

B-80, G/F, JOHRI FARM,
JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

600_53227607
not found.

● ڈاکٹر ریاض توحیدی

متن اور تجربہ

پروفیسر حامدی کاشمیری شاعری کے طلسماتی عالم میں بھی اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں اور تنقید نگاری میں بھی ایک معتبر نقاد اور نظریہ ساز کی حیثیت سے عالم شہرت کے حامل ہیں۔ پروفیسر موصوف کے تنقیدی مقالات پر مشتمل کتاب 'متن اور تجربہ' محترمہ مصرہ مریم نے مرتب کی ہے۔اس کتاب میں سترہ مقالات شامل ہیں جن کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ حامدی کاشمیری نے ادبی متون کی تفہیم وتحسین کے لئے اپنے مخصوص تجزیاتی عمل سے کام لیا ہے۔اکتشافی تنقید پر گفتگو کرتے ہوئے حامدی صاحب کہتے ہیں کہ یہ شعر سے شاعر کے اخراج، شعر ہی کو مرکز توجہ بنانے اور اس کی لسانی ساخت پر متوجہ ہونے اور اس کے تجزیاتی عمل سے مربوط ہے۔زیر تبصرہ کتاب کا پہلا مقالہ 'جدوجہد آزادی اور علاّمہ اقبالؔ' ہے۔اس مقالے میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے تعلق سے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی حب الوطنی کے تاریخی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے علاّمہ اقبالؔ کے تصور آزادی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔علاّمہ اقبالؔ کی عظمت کو اجاگر کرتے ہوئے حامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اقبال بنیادی طور پر انسان کی آزادی کے طلب گار اور رجز خواں ہیں۔یہی جزبہ اُن کے افکار اور ان کے سماجی، ملکی اور تہذیبی اقدار و سرکار کا محرک ہے......اقبالؔ کی عظمت اس بات میں بھی مضمر ہے کہ وہ ملکی مسائل کو بھی تخلیقی آب ورنگ عطا کرنے کی سعی کرتے ہیں'' ص۱۲

تفہیم غالبؔ کے حوالے سے تین مقالے شامل کتاب ہیں۔غالبؔ کی شعری کائنات کی وسعت کو موضوع بحث بناتے ہوئے مقالہ نگار رقمطراز ہیں کہ غالبؔ ایک بڑے تخلیق کار ہیں،انہوں نے لسانیاتی عمل سے معجزہ کاری کی ہیں اور انہوں نے اپنے باطنی وجود سے پھوٹنے والے لاتعداد تجربات کی ایک نادرہ کار ،ثروت منداور رنگارنگ کائنات خلق کی ہے......ان کی شعری کائنات یکسانیت اور تکراریت سے مبرا ہے۔یہ ہر پل بدلتے وقوعات کی تماشا گاہ ہے،یہی خودگر و خودآ گاہ کائنات غالب کی بے پایاں تخلیقی قوتوں کا علامتی اظہار ہے اور اس میں باریابی کے لئے شعری لسانیات کی کارگزاری سے بھرپور واقفیت لازمی ہے۔(ص۲۳) اپنے تجزیاتی عمل کو بطور ثبوت پیش کرتے ہوئے حامدی کاشمیری نے غالبؔ کی ایک غزل کا اکتشافی تجزیہ بھی کیا ہے، جس میں غالبؔ کے تخلیقی شعور کی کارگزاری اور لفظوں کی معجزہ کاری کے ساتھ ساتھ شعر غالب کی علامتی تہہ

داریوں کو اُجاگر کیا گیا ہے،جس کو پڑھنے کے دوران قاری شعر غالبؔ کے امکان خیز تجربے سے آشنا ہوجاتا ہے۔

سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے ۔۔۔ باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے

ایک مقالہ ترنم ریاض کی افسانہ نگاری پر بھی کتاب میں شامل ہے۔اس مقالے میں ترنم ریاض کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے صاحب مقالہ لکھتے ہیں کہ ترنم ریاض کے افسانوں میں زندگی کے گوناگوں مسائل و واردات کی تخیلی باز یافت ملتی ہے۔بعنوان'' نیا آہنگ'' میں اخترالایمان کے شعری محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے حامدی صاحب لکھتے ہیں کہ خارجی زندگی میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ جو انسانی صورت حال پر اثر انداز ہوتا ہے انہیں جھنجھوڑ کے رکھتا ہے اس طرح سے خارجی زندگی اُن کے لئے شعری محرکات کا ایک غیر مبہم سلسلہ بن جاتی ہے۔

طارق چھتاری کے افسانے 'نیم پلیٹ' کا تجزیہ کرتے ہوئے افسانے کی شناخت کے بارے میں حامدی صاحب لکھتے ہیں کہ ایک بلند پایہ افسانہ،نظم کی طرح اپنا ناقابل تقسیم تخلیقی وجود رکھتا ہے اور یہی اس کے ہونے کا جواز ہے......افسانہ مصنف کی تخلیقی شخصیت کی ساری توانائی ،تابنا کی اور نزاکت اور اسراریت کو اپنے اندر سمو کر ایک ناگزیر لسانی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔'نیم پلیٹ' کا تجزیہ کرتے ہوئے حامدی صاحب لکھتے ہیں کہ نیم پلیٹ بلاشبہ اپنے خالق کی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے اس کی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ افسانہ جامد حقیقت سے انقطاع کر کے اپنی ایک متحرک تخیلی دنیا واضع کرتا ہے۔

'رفیق راز کی شاعری' کے نام سے ایک مقالہ شامل کتاب ہے۔رفیق راز کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے حامدی صاحب لکھتے ہیں کہ رازؔ کی شاعری میں ایک ایسی متغیر جلوہ گری ملتی ہے جس میں نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ہے۔یہ لمحہ بہ لمحہ صاعقہ بہ صاعقہ وشعلہ وسیماب کی دنیا ہے جو قاری کی حسیاتی اور جمالیاتی تشفی کا باعث بنتی ہے۔

آگے تھیں فقط خستہ فصیلیں ہی فصیلیں ۔۔۔ تحریر کہیں کوئی عبارت بھی نہیں تھی

جموں وکشمیر کے جو افسانہ نگار ادبی دنیا میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں اُن میں نور شاہ صاحب کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔زیر تبصرہ کتاب میں 'نور شاہ کی افسانوی انفرادیت' کے نام سے بھی ایک مقالہ شامل ہے۔اس مقالے میں پروفیسر حامدی کاشمیری نور شاہ کی افسانہ نگاری پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بات باعث طمانیت ہے کہ ریاست میں نور شاہ اہم افسانہ نگار ہے جو تجربہ پسندی اور جدت کاری کو بروئے کار لاتے ہیں۔

بہر کیف 'متن اور تجربہ' میں شامل سبھی مقالات نہ صرف قاری کو ایک نئے تجربے اور نئی سوچ سے آشنا کرتے ہیں بلکہ تفہیم وتحسین کے نئے امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

Wadipora ‹Handwara‹ Kupwara Kashmir(india)193221

● اقبال حسن خان

ڈھکنے

ابا جی نے زور سے کھنکھار کے تھوک صحن کے بیچوں بیچ گزرتی نالی میں پھینکا اور پتہ نہیں اُس طرف چند لمحوں تک غور سے کیوں دیکھا اور شانے پر پڑے پرنے سے ہونٹوں کے گوشے پونچھ کر اپنی وہ گفتگو پھر جاری کر دی جس کے ختم ہونے کے لئے میں مرا جا رہا تھا۔اس بار ابا کی مخاطب اماں تھیں جو سفید دوپٹہ پورے سر سے اوڑھے حسب دستور خاموش کھڑی تھیں۔

''زندگی بن جائے گی اس کمینے کی.....ساجدہ کے تین بھائی ولیت میں کاروبار کرتے ہیں.....اپنا ہوٹل چلاتے ہیں.....پانچ میمیں کام کرتی ہیں وہاں.....''

یہ پہلی بار نہیں تھا کہ ابا جی نے مجھے ساجدہ کے تینوں بھائیوں کی دولت اور بریڈفورڈ میں واقع پاکستانی ریسٹورنٹ کا قصہ سنایا تھا۔ابا جی شاید مجھے بیرون ملک شادی کرنے کو نہ کہتے اگر میں ایم اے کرنے کے بعد ریلوے میں کلرک بھرتی ہو جاتا یا پھر اُن کے ساتھ خشک سبزیوں کی آڑھت کا کاروبار سنبھال لیتا۔ابا جی کے نزدیک ریلوے میں نوکری کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ پاس بننے پر آدمی طویل سے طویل سفر تقریباً مفت کر لیتا تھا۔ابا جی کے بچپن میں اُن کے کوئی ماموں ریلوے میں ملازم تھے اور اس سہولت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے میں مشاق بھی کیونکہ وہ پورے خاندان کو مختلف حیلوں حربوں سے مفت سفر کروایا کرتے تھے۔ یا پھر ابا جی مجھے اپنے ساتھ آڑھت میں لگانا چاہتے تھے۔میں شاید ریلوے میں تو بھرتی ہو بھی جاتا لیکن آڑھت کے کاروبار سے خود کو منسلک کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ابا جی جب شام ڈھلے گھر آتے تھے تو گلی کے نکڑ سے ہی لوگ بتانا شروع کر دیتے تھے کہ لو جی سراج دین واپس آ گیا ہے اس لئے کہ اُن کا تعارف کراتی، پیاز لہسن کی ملی جُلی بُو اُن سے دس قدم آگے چلا کرتی تھی۔

''ناں.....تُو آخر چاہتا کیا ہے؟ شادی کیوں نئیں کرتا یا پھر اپنے ماموں کی طرح رنڈی بازی کرے گا ساری حیاتی؟'' ابا جی دھوتی سنبھال کر اس احتیاط سے بیٹھے کہ ستر پوشی برقرار رہے۔ابا جب بھی یوں بیٹھتے تھے میں سمجھ جاتا تھا کہ اب یہ سیشن تا دیر چلے گا اور تب تک چلے گا جب تک اُن کا واحد جگری یار سلطان کلچہ فروش اپنے بیٹوں کو دکان پہ بٹھا کے اُن سے ملنے نہیں آ جاتا۔اماں اپنے بھائی کے بارے میں ابا کی حقیقت بر مبنی بات سن کے قدرے تیزی سے بولیں۔

''حیا کرو.....بچے کے سامنے ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟''

ابا جی کی ماموں سے اُس وقت سے مخالفت چلی آ رہی تھی جب ابا اور اماں کے نکاح کے عین وقت ماموں حق مہر پانچ ہزار کرانے پر اڑ گئے تھے۔حق مہر تو دادا نے اتنا ہی لکھوا دیا تھا لیکن یہ پھانس ابا کے دل سے نہ نکل سکی۔ویسے یہ سچ تھا کہ ماموں کی جوانی خاصی رنگین گزری تھی مگر کوئی پانچ سال پہلے، جب سے اُنہوں نے دونوں بیٹیوں کی شادیاں کی تھیں اور حج کر آئے تھے، سیڑھیاں چڑھنے سے توبہ کر لی تھی، حالانکہ ابا کا اس بارے میں خیال تھا کہ اب اُن کے گھٹنے بے دم ہو چکے تھے۔گھٹنوں کے دم کے حوالے سے ابا نے ایک بار اماں کے سامنے تشریح کرنے کی کوشش بھی کی تھی، مگر اماں توبہ توبہ کرتی کمرے میں چلی گئی تھیں۔

''ناں.....کیا خرابی ہے ساجدہ میں؟'' ابا نے حقے کا کش لگایا اور گاڑھا بدبودار دھواں مجھے اپنے حلق سے اُترتا محسوس ہوا۔

''ابا جی.....میں ابھی شادی نئیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کئی بار کا دہرایا، مختصر سا جواب دیا۔ابا سنبھل کر بیٹھے اور آنکھیں سکیڑ کر بولے۔

''وجہ؟.....کوئی ترابلم ہے تیرے ساتھ؟''

ابا نے ہمیشہ پرابلم کو ترابلم ہی کہا۔یہ لفظ اکثر اُن کا یار سلطان کلچہ فروش استعمال کیا کرتا تھا اور ابا نجانے کس لمحے میں اسے لے اُڑے تھے اور اب ڈنکے کی چوٹ اس کا استعمال کرتے تھے۔

''پرابلم کیا ہونی ہے؟'' میں نے ہمیشہ کی طرح، بہت واضح اور صاف لہجے میں، ٹھہر کر یہ لفظ ادا کیا کہ ابا جی تصحیح کر لیں مگر اُنہوں نے پھر گرج کے اور پورے اعتماد سے یہ لفظ غلط ادا کیا۔

''ہے کچھ ترابلم اسی لئے تُو شادی سے بھاگتا ہے۔اوئے تیری عمر ہو گئی ہے چھبیس سال اور اس عمر میں، میں نے تین بال پیدا کر دیئے تھے۔''

ابا نے اماں کے سامنے سارا کریڈٹ اکیلے لینے کی کوشش کی اور میچی ہوئی آنکھوں سے اماں کو تائید کے لئے دیکھا تو اماں بجائے جواب دینے کے توبہ توبہ کرتی کمرے کے اندر چلی گئیں۔

''ہاں بول۔'' ابا نے پھر زور سے کھنکھار کر اس مرتبہ بلغم سینے میں دفن کر لیا اور ایسا کرنے سے ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔اب میں ابا کو کیسے بتاتا کہ میں ساجدہ سے یا کسی بھی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر سکتا تھا۔

میں یونیورسٹی کے آخری سال سے نگار کے عشق میں مبتلا تھا۔یہی حال نگار کا بھی تھا۔ہم ہفتے میں دو تین بار ملا کرتے تھے اور ہمارا ایک ہی موضوع ہوا کرتا تھا کہ ہم کیسے شادی کر سکتے ہیں۔نگار کی ماں کسی حکومتی ادارے میں درمیانے درجے کی افسر تھی۔نگار کے باپ کو مرے آٹھ برس ہو چلے تھے اور نگار اپنی ماں کے ساتھ بنگلہ نما ایک گھر میں رہتی تھی۔اُس گھر کی چار دیواری نہیں تھی، بلکہ جگہ جگہ مناسب فاصلوں

سے پختہ ستون کھڑے کہ اُن پہ سنتھا اور گل عباسی لگا دیا گیا تھا جس کی وجہ سے کم از کم اتنا پردہ ضرور بن گیا تھا کہ برآمدے میں بیٹھے لوگ سڑک سے خصوصی کوشش کے بعد ہی دکھائی دے سکتے تھے۔ مجھے کبھی نگار کے گھر کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا حالانکہ میں کتنی ہی بار نگار کو اپنی موٹر سائیکل پر اُس کے گھر پہنچانے جا چکا تھا۔ ہم آج دوپہر بھی ملے تھے اور یہی موضوع زیر بحث آیا تھا۔ نگار ایک سال بیماری کی وجہ سے امتحان نہیں دے سکی تھی اور دو سال مجھ سے پیچھے تھی لہٰذا اس سال وہ فائنل کا امتحان دے رہی تھی اور بقول اُس کے اُس کی اماں امتحان ہوتے ہی اُس کی کہیں بھی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

ابا جی میری شادی ساجدہ سے کر دینے پر مُصر تھے۔ ساجدہ وغیرہ کا گھر ہمارے گھر سے تین گھر چھوڑ کر تھا اور اُس کے ولیتی بھائیوں کی دولت نے اُسے چار منزلہ کر دیا تھا۔ میں ساجدہ کو بچپن سے جانتا تھا۔ معمولی صورت کی لڑکی تھی۔ بس اُس کا نچلا ہونٹ پتہ نہیں کیسے بہت مناسب طریقہ پر تراشا گیا تھا کہ اُس کا چہرہ اُس کی وجہ سے قدرے دلکش دکھائی دیتا تھا۔ لیکن آپ کسی عورت کے محض نچلے ہونٹ کے ساتھ تو زندگی نہیں گزار سکتے۔ نگار کی رنگت چمپئی تھی۔ وہ جب کھلی بانہوں کی قمیص پہنتی تو اُس کا سنہرا رُواں یوں دکھائی دیتا جیسے خوبانی کی شاخ۔ جبکہ ساجدہ کی رنگت اگر کالی نہیں تو گہری سانولی ضرور تھی۔ ساجدہ گھر سے باہر جاتے وقت ایک بڑی سی سفید چادر اپنے گرد لپیٹ لیا کرتی تھی۔ اُس کے خطوط یقیناً من موہ لیتے تھے لیکن عورت کو برتنے کے لئے چادر اُتارنا چونکہ ضروری ہوتا ہے اس لئے میری شدید خواہش تھی کہ یہ چادر کم از کم میں تو نہ اُتاروں۔

''اوئے بولتا کیوں نئیں؟'' ابا جی نے ایک بار پھر دھوتی سنبھالی جو جذباتی گفتگو کے دوران رانوں سے ڈھیلی ہوگئی تھی اور پھر جیسے میرا مقدر جاگ گیا۔ سلطان کلچوں والے کی مخصوص آواز سنائی دی۔

''اوئے ساجے......گھر ہی ہے نا؟'' یہ آواز سن کر لمحہ بھر کو ابا جی کے چہرے پر رونق سی آ گئی اور ضد کی وہ نحوست ختم ہوگئی جسے وہ ایک گھنٹے سے طاری کئے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے بلند آواز میں کہا۔

''آ جا! اوئے۔'' سلطان سے چونکہ اماں پردہ نہیں کرتی تھیں اور وہ اس وقت گھر میں بھی نہیں تھیں کہ ہماری گفتگو کے دوران وہ اطلاع نما اجازت لے کر گھر سے نکل گئی تھیں کہ حکیم صاحب کی بہو کو پھر جن چڑھ گئے ہیں اور وہ وہاں جا رہی ہیں۔ سلطان گرمیوں میں قمیص پہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا اور صرف کپڑے کی ایک بنڈی شلوار پر پہن لیا کرتا تھا اور اُس کی بیوی کے ہاتھ کا بنایا ہوا سرخ ناڑہ اُس کی رانوں کے بیچ بے تکلفی سے جھولتا رہتا تھا۔

میرا مقدمہ چونکہ چل رہا تھا اس لئے سلطان کے سامنے بھی چُست ہو گیا۔ سلطان نے چند لمحوں میں فیصلہ کر دیا اور اپنی رانوں کے بیچ ہاتھ ڈال کے انتہائی لچر انداز میں کھجایا اور ہنس کے بولا۔

''اوئے ویاہ کیوں نئیں کرا لیتا پترا؟ ٹھیک ٹھاک لوگ ہیں وہ۔ تجھے ولیت بھی بلوا رہے ہیں۔ اچھی بچی ہے ساجدہ۔ تو راضی رہے گا اُس کے ساتھ۔'' ابا جی نے ایک ہوائی گالی دی جو اتنی ہوائی تھی

کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ میرے ننھیال پر پڑی کہ ددھیال پر اور پھر تھوک کے بولے۔

''بس فیصلہ ہو گیا۔ اوئے میں نے تجھے جمایا ہے کہ تو نے مجھے جمایا ہے؟ سب تیاری ہے۔ اس جمعرات میں ساجدہ سے تیری منگنی کر رہا ہوں......نہ نہ نہ......اب انکار کرنے والے پر ماں کی گالی پڑے گی''۔ ابا جی مجھے گلیوں محلوں کے مخصوص کلچر سے پھوٹنے والی وہ لایعنی غیرت دلا کر شاید مطمئن سے ہو گئے تھے جسے دلانے کا یہ بھونڈا طریقہ صدیوں سے وہاں مروج چلا آ رہا تھا۔ سلطان نے سر ہلا کر گویا تائید کی اور تب میں پھوٹ پڑا۔

''ابا جی۔ آپ یہ قسمیں دلانے اور دھمکیاں دینے والے فرسودہ طور طریقے اپنے پاس رکھیں۔ میں ساجدہ جیسی اُجڈ اور میٹرک پاس لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کر سکتا۔ میں کسی سے وعدہ کر چکا ہوں اور اپنا وعدہ ہر قیمت پر نبھاؤں گا۔''

شاید میں زندگی میں پہلی مرتبہ ابا جی کے سامنے اُونچا بولا تھا اور اُن کے ایک دوست کے سامنے بولا تھا اس لئے ابا جی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ سلطان بھی پریشان تھا۔

ابا جی ہمیشہ کھڑے ہوتے وقت دھوتی سنبھالا کرتے تھے لیکن اُس روز اُنہوں نے ایسا نہیں کیا اور صرف قدرت نے ہی اُن کی ممکنہ برہنگی کی لاج رکھی۔ اُن کے پاس اُس وقت مارنے کو کوئی چیز نہیں تھی اور اُنہیں اس سلسلے میں تھوڑی سی کوشش کرنی پڑی اور جلدی میں جو ملا وہ لے کر میری طرف بڑھے۔ اُنہوں نے اماں کو ایک بازاری عورت سے تشبیہ دے کر مجھے اُس کی اولاد قرار دیا اور مجھے ماں بھین کی ننگی گالیاں دے کر اپنے اگلے ارادے کا اظہار بھی کر دیا کہ جس کی رُو سے مجھے ابا جی کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے، سوائے ایک ناگفتنی شئے کے اور کچھ نہیں ملنے والا تھا! سلطان کلچے والے کے سامنے مجھ سے یہ بے عزتی برداشت نہ ہو سکی۔ لمحہ بھر کو تو میرا بھی جی چاہا کہ میں جواب دوں لیکن پھر ہمت نہ پڑی۔ ابا جی نے مجھے جوتے سے مارتے ہوئے برآمدہ، اور پھر صحن عبور کیا اور وہ شاید مجھے گلی میں بھی مارنا چاہتے تھے لیکن سلطان نے اُنہیں گھسیٹ لیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کے باوجود، دروازے کے ساتھ کھڑی اپنی موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے وقت تک میں ابا جی کی وہ پاٹ دار آواز سن سکتا تھا کہ جس میں دی جانے والی گالیوں میں اب وہ مجھے اماں کے ساتھ ببانگ دہل اپنے اُن جنسی نوعیت کے ارادوں کی تکمیل کی دھمکیاں دے رہے تھے، جن پر عمل درآمد کرتے اُن کی عمر گزر گئی تھی!

جب میں سڑک پر نکلا تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا کسی بھی لمحے بارش شروع ہو جائے گی۔ موسم بلاشبہ بڑا خوبصورت تھا لیکن میرے دماغ میں چند منٹوں پہلے رونما ہونے والے واقعے کے غصے کی سفید دُھند سی بھری ہوئی تھی۔ ایک سگنل پر موٹر سائیکل روکنا پڑی تو مجھے احساس ہوا کہ میں موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ پھر غصہ کم ہوتا چلا گیا۔ میں نے سڑک سے ذرا ہٹ کے ایک درخت کے نیچے موٹر

سائیکل روک دی اور گھاس پر بیٹھ کر سوچنا شروع کیا۔ایسے باپ کا مزید احسان لینا میری مردانگی کو چیلنج تھا۔میں نے سوچا اب تا عمر اُس گھر واپس نہیں جاؤں گا۔یہ ذرا مشکل فیصلہ تھا کیونکہ مجھے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ جب یہ سارا واقعہ سنیں گی تو اُنہیں کتنی تکلیف ہوگی۔پھر میں ماں سے کیسے ملا کروں گا؟ دیکھا جائے گا۔فی الحال مجھے دو کام کرنے تھے۔ایک تو کہیں ملازمت کرنی تھی اور دوسرے نگار سے شادی۔ملازمت کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔میرا ایک جگری یار اسی شہر میں تین جگہ ٹیوشن سینٹرز چلا رہا تھا اور مجھے کتنی ہی دفعہ معقول تنخواہ پہ وہاں نوکری دینے کی پیش کش بھی کر چکا تھا۔نگار سے شادی البتہ مشکل کام تھا اور مجھے اس سلسلے میں اُس کی ماں سے ملنا ضروری تھا۔میں اُس شام اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے میں ایک عجیب سی خود اعتمادی جاگتی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ خود اعتماد لوگ جذباتی طور پر بڑے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

اگر نگار کی ماں ویسی ہی تھی جیسا کہ نگار بتایا کرتی تھی تو پھر یہ شادی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔نگار کہتی تھی کہ اُس کی ماں بہت مختلف عورت ہے۔اگر میں اُس کی نظر میں بچ گیا تو پھر وہ ایک گھنٹے میں ہماری شادی کرا دے گی۔نگار کی یہ بات یاد آتے ہی میں نے سوچا کہ اب جب کہ میں سارے بندھنوں سے آزاد ہوں تو کیوں نہ اس قصے کا فیصلہ بھی آج ہی کر لیا جائے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، نگار کے گھر کی کوئی چار دیواری نہیں تھی اور نہ ہی کوئی گیٹ۔میں موٹر سائیکل اندر لیتا چلا گیا۔مختصر سے برآمدے کے سرے پر گھر کا اندرونی دروازہ تھا لیکن گھنٹی بجانے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔وہ یقناً نگار کی ماں تھی۔اس سے پہلے کہ میں اپنا تعارف کرواتا وہ مسکرا کے بولی۔

''تم رفیق ہو۔نگار بڑا ذکر کرتی ہے تمہارا۔تم کئی دفعہ اُسے گھر پہنچانے بھی آ چکے ہو۔آ جاؤ۔''

میں نگار کی ماں کے پیچھے مختصر سے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو بادل زور سے گرجا اور ساتھ ہی زوردار بارش ہونے لگی۔نگار کی ماں شاید ابھی ابھی نہا کے نکلی تھی اور ایک سنہری دستے والے برش سے اپنے بال سُلجھا رہی تھی۔وہ پینتالیس کے پیٹے میں رہی ہوگی۔وہ اُن عورتوں میں سے تھی جو اپنا بڑا خیال رکھتی ہیں۔اُس کی رنگت نگار کی طرح چمپئی تو نہ تھی لیکن کھلتی ہوئی گندمی ضرور تھی۔پیٹ سُتا ہوا تھا اور جسم کی کسی حصے پر چربی کا نشان تک نہ تھا۔وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو اُس کے سرخ مسوڑھوں میں مجھے گلاب کی کلیاں سی ٹانکی سے دکھائی دیں۔

''نگار ٹیوشن پڑھنے گئی ہے۔بس آنے ہی والی ہوگی۔دو گھر چھوڑ کے جاتی ہے۔'' نگار کی ماں نے برش کو غور سے دیکھا۔اُس کے چہرے پر تردد کا ہلکا سا پرتو تھا۔وہ شاید اپنے بال ٹوٹنے پر فکر مند تھی۔بارش کی بوچھاڑ کے چند قطرے نگار کی ماں پر پڑے تو وہ کھڑکی بند کرنے کو اُٹھی۔چٹخنی لگاتے اُس کے ہاتھوں کی پشت پر کہیں کہیں نیلی رگیں اُبھرنے لگی تھیں۔بس انہی رگوں سے اُس کی عمر کا کچھ اندازہ ہو سکتا تھا ورنہ وہ نگار کی بڑی بہن لگتی تھی۔وہ مجھ سے معذرت کر کے چند لمحوں کو گھر کے اندرونی حصے میں گئی۔میں کھڑا ہو کر مختصر سے لان میں بارش اور ہوا سے جھومتے پودوں اور پھولوں کو دیکھنے لگا۔اگر ابا جی نے میرا موڈ نہ

برباد کر دیا ہوتا تو آج کی شام کس قدر حسین تھی۔میں نے سوچا اور اُسی لمحے نگار کی ماں کسی گہرے سبز مشروب کے دو گلاس لئے کمرے میں آ گئی۔میں پھر بیٹھ گیا۔مشروب بہت لذیذ تھا اور میں اُس وقت اُس کے دو گلاس پی سکتا تھا۔نگار کی ماں نے اپنے کھلے بالوں کو ایک موٹی سی چٹیا میں بدلا اور مہین دوپٹہ چھاتیوں پر پھیلا کر گھونٹ بھرا۔بارش اب بھی شدت سے ہو رہی تھی لیکن لگتا تھا ہوا کا زور ٹوٹ گیا تھا۔مجھے خاموشی سے وحشت ہو رہی تھی۔میں وہ مناسب الفاظ سوچنے لگا جن میں مجھے نگار کی ماں سے نگار کی اور اپنی شادی کی بات کرنا تھی۔میں نے گلا صاف کیا اور نگاہیں چُرا کر بولا۔

''آنٹی..... بات یہ ہے.....''

نگار کی ماں نے مجھے ٹوکا۔

''مجھے یہ آنٹی، بھابی قسم کے کمرشل الفاظ بالکل پسند نہیں.....تم مجھے آپی کہہ سکتے ہو۔میرے دفتر میں بھی سبھی مجھے آپی کہتے ہیں۔'' یہ لفظ مجھے اچھا لگا۔

''آپی میں..... میں نگار سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ہم دونوں ایک دوسرے کو.....''

آپی نے ایک اور گھونٹ بھرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اُس کے چہرے کی مسکراہٹ گہری سنجیدگی میں بدل گئی۔

''میں جانتی ہوں۔نگار کئی دفعہ تمہارا ذکر کر چکی ہے۔میں تمہیں کئی دفعہ اس کھڑکی سے دیکھ بھی چکی ہوں۔میں چاہتی تھی کہ تم سے اس سلسلے میں بات بھی کروں۔اچھا ہوا آج تم خود آ گئے۔'' آپی نے یہ ساری باتیں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گہرے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کیں۔

''جی.....آپی میں نگار سے بہت۔'' وہ عورت بات کاٹنے میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔

''تم نگار سے بہت محبت کرتے ہو.....یہی نا؟ لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نگار سے کیوں محبت کرتے ہو؟'' کس قسم کا سوال ہے یہ؟ میں نے جی ہی جی میں حیران ہو کر سوچا۔لیکن مجھے کوئی جواب تو دینا تھا۔

''کیوں محبت کرتا ہوں؟ وہ خوبصورت ہے، پڑھی لکھی ہے، اچھی ماں بن سکتی ہے وغیرہ۔'' آپی مسکرائی اور میں اُس وقت اُس مسکراہٹ کو کوئی نام نہ دے سکا۔

''یہ خوبیاں تو اس ملک کی لاکھوں لڑکیوں میں ہوں گی، پھر نگار ہی کیوں؟'' مجھے کچھ کچھ غصہ آنے لگا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا؟'' شاید میرا لہجہ کچھ تیز ہوا تھا جس کا مجھے فوراً ہی احساس بھی ہو گیا۔میں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''میرا مطلب ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

آپی اُٹھی اور اُس نے کھڑکی ذرا سی کھول دی۔تازہ ہوا کا بھیگا جھونکا کمرے میں آیا تو مجھے اچھا لگا۔وہ پھر بیٹھی نہیں اور کھڑکی کے پردوں کو یونہی بل دینے لگی جیسے اُن کی شکنیں درست کر رہی ہو۔پھر اُس

نے اپنی چمکیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''نگار بتا رہی تھی کہ تم نے نفسیات میں ماسٹرز کیا ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے یونیورسٹی میں چوتھی پوزیشن لی تھی اس کا تذکر شاید نگار نے اُس سے نہیں کیا تھا۔

''جی..... میری چوتھی پوزیشن تھی۔'' میں اسے شادی سے پہلے ہونے والے روایتی انٹرویو کا پہلا سوال سمجھا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ آپی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔ نفسیات کا ایک بڑا حصہ جنسیات پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک مرد اور عورت کی ایک دوسرے کے لئے خواہش محض جنسی آرزو کی تکمیل کے لئے ہوتی ہے۔'' آپی بے تکان بولی۔ اپنی ہونے والی ساس کے منہ سے یہ گفتگو سن کر میری گردن کے بال اتنی شدت سے کھڑے ہوئے کہ مجھے اُس وقت یقین تھا کہ اگر میں اُنہیں چھوتا تو میری اُنگلیاں زخمی ہو جاتیں۔

''جی..... لیکن..... میں..... دیکھئے میں سمجھا نہیں.....'' میں فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

آپی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھی اور اپنی چٹیا اپنے سینے پر ڈال کر اُس سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''دیکھو! میں مانتی ہوں کہ ایک مرد اور ایک عورت جب شادی کے نام پر بہت دنوں تک ساتھ رہتے ہیں تو اُنہیں ایک دوسرے کی عادت ہو جاتی ہے جسے لوگ محبت بھی کہتے ہیں لیکن میرے خیال میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ جو جذبہ باندھے رکھتا ہے، وہ جنسی جذبہ ہوتا ہے۔ تم کبھی جنسی تجربے سے گزرے ہو؟''

اب یہ سب ناقابل برداشت تھا اور میں فوراً ہی وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میں نے آپی کے چہرے کو غور سے پڑھنے کی کوشش کی کہ شاید وہ مجھ سے مذاق کر رہی تھی، مگر وہاں یک سنگی سنجیدگی تھی۔ آپی پھر بولی۔

''میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم کبھی جنسی تجربے سے گزرے ہو؟'' اول تو ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ میں جس ماحول کا پروردہ تھا وہاں ہر عورت یا تو خالہ تھی یا چچی تھی یا پھر آپا اور باجی تھی۔ اور اُن کے بارے ایسا سوچنا بھی گلی محلے کی روایت کی رُو سے گناہ تھا۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہوتا تو میں آپی کے سامنے کبھی اس کا اعتراف نہ کرتا۔ میں نے گردن نفی میں ہلا دی۔ آپی مسکرائی تو اُس کے مسوڑوں سے گلاب کی ننھی ننھی کلیوں نے پھر جھانکا۔ وہ پھر کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی، چند لمحوں تک باہر دیکھتی رہی اور پھر گھوم کر بولی۔

''دیکھو میں سمجھاتی ہوں تمہیں۔ نگار کے لئے تمہاری محبت وحبت سب بکواس ہے۔ کسی بھی عورت اور مرد کے درمیان اس جذبے کو میں مانتی ہی نہیں۔ یہ جو احمق شاعر اور ادیب ہوتے ہیں نا، انہوں نے یونہی بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ چلو مان لیا، تمہاری شادی نگار سے ہو جاتی ہے اور شرط یہ ہوتی ہے کہ نگار کبھی تمہارے ساتھ جنسی تجربہ نہیں کرے گی، تمہیں یہ رشتہ اس صورت میں قبول ہوگا؟''

میری آنکھوں کے سامنے دھواں سا چھا گیا۔ آپی تو پھر نگار کی ماں تھی، مجھ سے کوئی بھی عورت ایسی باتیں کرتی تو میری یہی کیفیت ہوتی۔ آپی مسلسل بول رہی تھی۔

''نگار بتاتی ہے کہ تم اندرون شہر میں رہتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ وہاں کا ماحول بڑا مختلف ہے کیونکہ میں بھی اپنی شادی سے پہلے وہیں رہتی تھی۔ تم ایک گھٹے ہوئے ماحول کے پروردہ ہو۔ ایک ایسا ماحول جس میں جذبات اور خیالات پر طرح طرح کے ڈھکنے لگے ہوتے ہیں۔ اماں ابا کی عزت کے خیال کا ڈھکنا، محلے والوں کی تیز نگاہوں کا ڈھکنا، مسجد کے مولوی کے اپنے میعار گناہ اور اُس کی ممکنہ سزاؤں کے خوف کا ڈھکنا..... ہے نا؟''

میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ وہ جو بھی کہہ رہی تھی، درست کہہ رہی تھی۔ مجھے اس بھیگی شام کے ان لمحوں میں اُس عورت نے احساس دلایا تھا کہ میرے وجود پر کتنے ڈھکنے رکھ دیئے گئے تھے۔ ایسے ڈھکنے جو میرے اندر پکنے، اُبلنے، بھڑکنے والے جذبوں کو چاروں طرف سے بند کئے ہوئے تھے جیسے مرغ کو یوں دم پخت کیا جاتا ہے کہ بھاپ کی ایک ہلکی سے رمق بھی دیگ سے باہر نہیں آپاتی، صرف کھد بدکھد بد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں نے آج سے پہلے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میرے وجود میں یہ شور سا جو مچا رہتا ہے، یہ کھد بدسی جو ہوتی ہے، اس کا سبب کیا ہے؟

''نگار تمہاری زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے اور تم ایک شدید دباؤ میں ہو۔ تم نے تو نفسیات پڑھ رکھی ہے۔ تم سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے کہ انسان دباؤ کی حالت میں کوئی فیصلہ درست نہیں کر سکتا۔ تمہیں پہلے اپنی ذات سے بہت سے ڈھکنے اُتار کے خود کو درست فیصلہ کرنے کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

آپی اس بار دیر تک مسکرائی اور اُس کے مسوڑوں کی گلابی کلیوں کی مہک نے دیر تک میرے وجود کا احاطہ کئے رکھا۔

ساون کی اُس شام جب میں ٹھنڈی ہوا میں دھیرے دھیرے موٹر سائیکل چلاتا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ آپی جیسی کسی عورت کا وجود میرے لئے کتنا ضروری تھا۔ ایک ایسی عورت کا وجود جس نے میری ذات سے وہ سارے ڈھکنے اُتار دیئے تھے جن کی کھد بد اور شاں شاں نے اس سے پہلے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ نگار کا تصور اب تقریباً ماند پڑ چکا تھا۔ اگر عورت وہی تھی، جیسا کہ اُس شام اپنے مختصر سے ڈرائنگ روم میں آپی نے مجھے سمجھایا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ نگار ہو یا ساجدہ۔ مجھے ابا جی سے اپنے رویئے کے حوالے سے خود پر غصہ آنے لگا۔ میں نے موٹر سائیکل کی رفتار تیز کی اور گھر جاتے ہی سب سے پہلے ابا جی سے معافی مانگ کر آنے والی جمعرات ساجدہ سے منگنی کا عندیہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

◀◀ ● ▶▶

C/o Dr. Rehana Iqbal
Hazara Road، Hasan Abdal
Distt. Attock47000 Pakistan

● قاضی طاہر حیدر

تین انچ کا سُورما

شیدے کَن ٹُٹّے کو شیدا رُستم اور میدے کھڑ کَنّے کو ماسٹر حمید بننے میں پندرہ برس لگے تھے لیکن بگر وٹے پیر کی کچی قبر کو ایک با قاعدہ مزار بننے میں لگ بھگ بیس برس کا عرصہ لگا۔ بیس برس تو صرف کہنے کی حد تک ہیں ورنہ حقیقت یہ تھی کہ با قاعدہ مزار کی تعمیر و تکمیل میں پانچ سال سے کچھ کم عرصہ ہی لگا ہوگا۔ ان پانچ برسوں سے پہلے کے پندرہ برس بھی ماسٹر حمید کو پوری طرح یاد تھے۔ وہ چند برس بھی جب وہ ماسٹر حمید یا میدے کھڑ کَنّے کی بجائے محض میدا ہوا کرتا تھا اور شیدا بھی محض شیدا ہی تھا کَن ٹُٹّا یا رُستم نہیں......دس بارہ سال کے ہی تو تھے دونوں جب پہلی مرتبہ بگر وٹے پیر کی کچی قبر کے سامنے سے اکیلے گزرے تھے۔ یوں تو اُس سے بھی پچھلے چار پانچ برس سے وہ روزانہ اسی رستے سے سکول آتے جاتے رہے تھے۔ لیکن! اکیلے نہیں......

معمول یہ تھا کہ نورا کمہار اُنہیں روز اپنی گدھا گاڑی پر بٹھا کر اسی راستے سے گزارتے ہوئے گاؤں سے تین میل دور واقع چھوٹے سے قصبے میں قائم واحد سکول تک پہنچاتا تھا اور پھر سکول کے باہر ہی، چھٹی ہونے تک گدھا گاڑی پر لدے اپنے ہاتھوں سے بنائے برتن بیچنے میں مصروف ہو جاتا۔ کبھی اُس کے بنائے ہوئے برتن بکتے اور کبھی نہیں بھی بکتے، لیکن سکول کی چھٹی ہوتے ہی شیدا اور میدا دونوں اُس کی گدھا گاڑی پر جا کر سوار ہو جاتے اور نورے کمہار کے کانوں میں بھی چھٹی کی گھنٹی بجنے لگتی۔ فوراً ہی دکان سمیٹ لی جاتی اور نورے کی گدھا گاڑی گاؤں کی طرف جانے والے اُسی جانے پہچانے رستے پر گامزن ہو جاتی۔ یہ معمول تب سے تھا جب پینتیس مربع میل پر پھیلے چھوٹے بڑے پچاس دیہات کے عین وسط میں واقع اس چھوٹے سے قصبے میں حکومت نے یہ واحد سکول قائم کیا تھا۔ سکول کے قیام کے پہلے سال اُن پچاس دیہات میں سے کل پندرہ بچے سکول میں داخل ہوئے جن میں شیدا اور میدا بھی شامل تھے۔ سکول کا انتظام سنبھالنے کے لئے حکومت نے ایک استاد بھی تعینات کیا جو بڑے شہر سے روزانہ بذریعہ بس سکول آتا اور چھٹی کے بعد بس پر ہی واپس چلا جاتا۔

میدے کا باپ امام دین حلوائی پہلی مرتبہ جب میدے اور شیدے کو سکول میں داخل کروانے کے لئے لایا تو کلف لگے سفید کاٹن کے نفیس شلوار کُرتے میں ملبوس اُستاد صاحب کی بارُعب شخصیت سے میدا بہت متاثر ہوا تھا۔ شاید اُسی روز اُس کے دماغ کے کسی گوشے میں اُستاد بننے کی خواہش جڑ پکڑ گئی تھی لیکن اس خواہش کے ایک تناور درخت بننے میں بہت سے دیگر عوامل نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ مثال کے طور

پر یہ کہ بہت تھوڑے سے عرصے میں علاقے میں بسنے والے ہر کس و ناکس نے استاد صاحب کی عزت کرنا اپنے بنیادی فرائض میں شامل کر لیا۔ سکول میں آنے جانے والے بچوں میں سے کسی کے گھر میں اگر مکھن نکالا جاتا تو ایک حصہ استاد صاحب کے لئے ضرور روانہ کیا جاتا۔ دیسی گھی، انڈے، مرغیاں، سبزی ترکاری، فصلوں کی کٹائی پر اناج، خشک میوہ جات غرضیکہ ہر وہ شے جو ایک دیہاتی کسی کو خیر سگالی کے جذبے کے تحت دے سکتا ہے استاد صاحب کی خدمت میں پیش کی جاتی۔ علاقے کے لوگوں میں سے کسی کو کوئی مشورہ لینا ہوتا تو وہ استاد صاحب کے پاس ہی جاتا۔ جس بس میں سوار ہو کر استاد صاحب شہر سے قصبے اور قصبے سے شہر تک آتے جاتے تھے اُس کے کنڈیکٹر کا تعلق چونکہ اسی علاقے سے تھا اس لئے استاد صاحب کو بس کا کرایہ بھی ادا نہ کرنا پڑتا۔ یہ اور اس جیسی دیگر بہت سی باتیں جیسے جیسے میدے کے علم میں آتی گئیں اُستاد بننے کی اُس کی خواہش میں بھی ویسے ہی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

شیدے کا معاملہ جدا تھا۔ وہ اُستاد صاحب سے متاثر ہوا، نہ سکول اُسے پسند آیا اور نہ ہی پڑھنے لکھنے میں کبھی اُس کی دلچسپی بڑھی۔ اُس کے باپ گامے لوہار کو بھی اُس کی پڑھائی لکھائی سے کوئی خاص غرض نہیں تھی۔ امام دین نے اگر اُسے شیدے کو میدے کے ساتھ سکول میں بھرتی کروانے پر مجبور نہ کیا ہوتا تو اُس کے دماغ میں کبھی یہ خیال بھی نہ آیا ہوتا۔ اُستاد صاحب کی عزت گاما علاقے کے باقی لوگوں کی طرح ہی کرتا تھا لیکن اپنے بیٹے کے بارے میں اُس کی اٹل رائے تھی کہ لوہار کا بیٹا ہے لوہار ہی بنے گا۔ شیدا اُس وقت تک اپنے بارے میں اپنے باپ کی اس رائے سے اتفاق یا اختلاف کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا لہذا جو ہو رہا تھا جیسے ہو رہا تھا ہوتا چلا گیا۔

دونوں صبح سویرے تیار ہو کر اپنے اپنے بستے گلے میں لٹکاتے اور نورے کمہار کی گدھا گاڑی پر سوار ہو کر سکول پہنچتے۔ سکول میں میدا استاد صاحب کے پڑھائے ہوئے سبق کو اپنے دل و دماغ پر نقش کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتا اور شیدا چھٹی کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ سکول سے واپسی پر دونوں اپنے اپنے گھر جاتے، کھانا کھاتے اور پھر باہر کھیتوں میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ شام تک کھیل کود میں مصروف رہتے۔ شام ہوتے ہی دونوں واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے، کھانا کھاتے اور پھر میدا سکول میں پڑھا سبق دہرانے بیٹھ جاتا جبکہ شیدا سونے سے کچھ دیر پہلے تک اپنے باپ کے اوزاروں کے ساتھ بیٹھا کھیلتا رہتا۔

شیدے کو اپنے باپ کے پیشے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن جب کبھی وہ اپنے باپ کو بھاری بھرکم ہتھوڑے سے گرم لوہے پر ضربیں لگاتے ہوئے دیکھتا تو اُس کو اپنی رگوں میں ایک عجیب قسم کی توانائی دوڑتی محسوس ہوتی۔ گامے کا پسینے میں شرابور جسم اور بازوؤں کی تنی ہوئی مچھلیاں شیدے کو لازوال قوت کا سرچشمہ لگنے لگتیں۔ اُس کے دل میں یہ خواہش شدت کی ساتھ مچلنے لگتی کہ وہ جلد از جلد بڑا ہو جائے اور اُس کے جسم سے بہنے والے پسینے اور بازوؤں کی تنی ہوئی مچھلیوں سے بھی ایسی ہی لازوال قوت کے سرچشمے پھوٹیں۔ اُس کے دماغ میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا کہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، ایسا شاید اُس وقت

تک ممکن نہ ہو جب تک کہ وہ اپنے باپ کی طرح ایک پیشہ ور لوہار نہیں بن جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ روز سونے سے کچھ دیر پہلے تک بیٹھا اپنے باپ کے اوزاروں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اگلی صبح پھر یہی معمولات دہرائے جاتے اور یہ سلسلہ چار پانچ سال تک ایسے ہی چلتا رہا۔

شیدا اور میدا دس بارہ سال کے تھے جب نورے کمہار کی بیوی نے فجر کے وقت ساتویں بیٹی کو جنم دیا اور نورا اس صدمے کی شدت سے بے حال ہو کر ایسا بستر پر پڑا کہ اگلے دو دن تک نہ اُٹھ سکا۔ اُس دن شیدا اور میدا پہلی بار پیدل سکول جانے کی لئے اکیلے روانہ ہوئے تھے۔ بغر وٹے پیر کی کچی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ جان بوجھ کر تھوڑی دیر کے لئے ستانے کو رکے تا کہ اُس قبر کو قریب سے دیکھ سکیں جو علاقے میں موجود دیگر قبروں کے برعکس ہر وقت ایک سبز رنگ کی چادر سے ڈھکی رہتی تھی اور جسے وہ ہر روز نورے کمہار کی گدھا گاڑی پر بیٹھ کر ادھر سے گزرتے ہوئے حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔ میدے نے ایک دفعہ نورے کمہار سے اس بابت پوچھا بھی تھا جس کے جواب میں نورے نے کہا تھا کہ.....

''یہ بغر وٹے پیر کی قبر ہے۔ پتہ نہیں اللہ لوک تھا، سائیں تھا یا پیر۔ لوگوں کے منہ میں تو جو آتا ہے کہہ دیتے ہیں حالانکہ کوئی یہ تک نہیں جانتا کہ اُس کا اصلی نام کیا تھا اور آیا کہاں سے تھا۔ بس یہیں پر پڑا رہتا تھا جہاں پر یہ قبر ہے۔ بدن پر جو کپڑے تھے بس وہی تھے، اگر کہیں سے پھٹ گئے تو اُس نے ٹاکی نہیں لگائی، نہ کبھی اُن کو دھویا اور نہ کبھی خود نہایا۔ کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ شروع شروع میں گاؤں والوں نے ترس کھا کر گھر کا بچا کھچا کھانا اُس کے آگے لا کر ڈالنا شروع کر دیا۔ لیکن مجال ہے جو اُس نے کبھی ایک نوالہ تک لیا ہو۔ فیقے قصائی کی بکری کا دوماہ کا بغر وٹا جب ٹھنڈ لگنے سے مرا تو فیقے نے اُس کو یہاں لا کر پھینک دیا۔ فیقے کا کہنا ہے کہ جیسے ہی اُس نے مردہ بغر وٹا پھینکا بغر وٹے پیر ایک گدھ کی طرح مُردے پر جھپٹا اور لگا اُس پر دانت چلانے۔ فیقا ڈر کر اُلٹے پاؤں بھاگا اور سارے گاؤں کو اکٹھا کر کے لے آیا لیکن جب تک گاؤں والے یہاں تک پہنچتے کھیل ختم ہو چکا تھا۔ بغر وٹے پیر کا پیٹ پھولا ہوا تھا اور اُس کے سامنے کھال اور ہڈیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اُس سے اگلے روز بغر وٹے پیر یہیں پر مردہ پڑا پایا گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اُسے یہیں دفن کر دیا اور گاؤں کی کسی عورت نے عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سبز رنگ کی چادر قبر پر چڑھا دی۔ کسی کو اُس کا اصلی نام تو معلوم نہیں تھا اس لئے سب اُسے بغر وٹے پیر کہنے لگے۔'' اتنا کہنے کی بعد نورا بے اختیار ہنس پڑا تھا لیکن شیدے اور میدے کو نہ تو اس کہانی کی کوئی سمجھ آئی اور نہ ہی نورے کی ہنسی کی۔ البتہ میدا اپنے دماغ میں کئی دن تک یہ معمہ سلجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ آخر گاؤں والوں کے پہنچنے سے پہلے بغر وٹے پیر نے سالم بغر وٹے کا کچا گوشت کیسے ہڑپ کر لیا؟''

اُس روز بغر وٹے پیر کی قبر کے سامنے بیٹھ کر شیدا اور میدا جب ستانے کے بہانے اُس کچی قبر کا تفصیلی معائنہ کرنے میں مصروف تھے تو ماسی رسولاں نجانے کہاں سے اچانک ٹپک پڑی۔

''اوئے تم دونوں اس وقت یہاں پر اکیلے کیا کر رہے ہو؟'' ماسی رسولاں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''ماسی سکول جا رہے تھے تھوڑی دیر ستانے کو رُکے ہیں۔'' میدے نے فوراً جواب دیا تھا اور ماسی رسولاں کو بھی شاید فوراً ہی یاد آ گیا تھا کہ آج نورا کمہار قصبے میں نہیں جا رہا۔

''پہلی دفعہ پیدل جا رہے ہو اسی لئے تھک گئے ہو۔'' ماسی رسولاں بھی نورے کی طرح بے اختیار ہنسی اور پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

''کھوتا ریڑھی کا راستہ الگ ہوتا ہے اور پیدل چلنے والوں کا راستہ الگ..... یہ جو بغر وٹے پیر کی قبر کے کنارے پر ایک پگڈنڈی دور تک چلی جا رہی ہے نا اس پر چڑھ جاؤ جلدی سکول پہنچ جاؤ گے۔'' اتنا کہنے کے بعد ماسی رسولاں پھر ہنس پڑی اور اُن دونوں کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اُس کی بات کو مانیں یا مذاق سمجھ کر رد کر دیں۔ شیدا ماسی کی بات کو مانتے ہوئے اس نئے راستے پر چلنے کے لئے تیار نہیں تھا لیکن میدے نے جب یہ کہا کہ پہلی بار ہی تو اکیلے جا رہے ہیں سکول، نہ بھی پہنچے تو کس نے کہنا ہے کہ ہماری غلطی ہے۔ اور ویسے بھی تو نے سکول جا کر چھٹی کی گھنٹی بجنے کا انتظار ہی تو کرنا ہے۔ سمجھ لے چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ شیدا فوراً تیار ہو گیا، دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے کہ میدے کا کہنا سچ ہی ہو اور وہ کبھی سکول نہ پہنچیں۔

سکول تو خیر وہ پہنچ ہی گئے اور وہ بھی تین میل کے بجائے محض ڈیڑھ میل کا پیدل فاصلہ طے کر کے، لیکن سکول پہنچنے سے آدھا میل پہلے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا، آباد اور پُر رونق اکھاڑا دیکھا۔ اکھاڑے کا منظر دیکھتے ہی شیدے کا پورا جسم جیسے ایک لمحے کے لئے پتھر کا ہو گیا۔ اکھاڑے میں اُس وقت لنگوٹ کسے یہی کوئی دس بارہ پہلوان ہوئے ہوں گے لیکن شیدے کو اُن میں سے ہر ایک کے، سر تا پا پسینے میں شرابور بدن کے، ایک ایک پٹھے سے لازوال قوت کے وہ سرچشمے پھوٹتے دکھائی دیئے جو گامے جیسے بیسیوں لوہاروں کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں۔ میدے کے لئے بھی یہ منظر حیرت اور دلچسپی کا باعث تھا لیکن اس حیرت اور دلچسپی سے کہیں زیادہ پریشانی اُسے شیدے کی حالت دیکھ کر ہو رہی تھی۔ میدے کی تشویش اُس وقت مزید بڑھ گئی جب شیدے کے قدم بے اختیاری کے عالم میں اکھاڑے کی طرف بڑھنے لگے۔ میدے نے فوراً بازو پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کی لیکن شیدے نے سختی سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ شیدا گویا اُس وقت کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ اُس کے قدم اکھاڑے کی طرف اُٹھ رہے تھے اور اُس کی آنکھیں مُگدر گھماتے، ڈنڈ پیلتے، بیٹھکیں نکالتے اور ایک دوسرے کے ساتھ زور کرتے پہلوانوں کے جسموں کا طواف کرنے میں مصروف تھیں۔ میدے کو جب معاملہ ہاتھ سے نکلتا محسوس ہوا تو وہ شیدے کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور اُس کے کندھوں کو مضبوطی سے تھام کر اُسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''اوئے ہوش کر، سکول نہیں پہنچنا کیا؟'' شیدا پہلے تو کئی لمحوں تک خالی خالی نظروں سے میدے

کی طرف دیکھتا رہا پھر للچائی ہوئی نظروں سے اکھاڑے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یار تو نے ہی تو کہا تھا کہ سکول نہ بھی پہنچے تو کس نے کہنا ہے کہ ہماری غلطی ہے؟ دیکھ! ایسا شغل روز روز دیکھنے کو نہیں ملے گا۔'' میدے کو شاید پہلے سے ہی علم تھا کہ شیدے نے یہی بات کرنی ہے لہٰذا جھٹ سے بولا۔

''دیکھ! اگر آج ہم سکول نہ پہنچے، تو کسی نے یہ تو نہیں کہنا کہ ہماری غلطی ہے لیکن پھر دوبارہ کسی نے ہمیں اکیلے سکول جانے بھی نہیں دینا اور پھر یہ شغل بھی ہمیں روز روز دیکھنے کو نہیں ملے گا۔'' شیدا عجیب سی نظروں سے میدے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تیرا؟''

''مطلب یہ ہے کہ اگر آج ہم اکیلے سکول اور سکول سے گھر، ٹھیک ٹھاک پہنچ گئے تو آئندہ کسی نے ہمیں اکیلے آنے جانے سے نہیں روکنا۔ پھر ہم روز گھر سے جلدی نکلا کریں گے، یہاں بیٹھ کر تھوڑی دیر یہ شغل دیکھا کریں گے اور وقت پر سکول بھی پہنچ جایا کریں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔'' میدے کی بات فوراً ہی شیدے کے دل و دماغ میں گھر کر گئی اور یہ معاملہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔

اُس دن کے بعد جیسا کہ میدے نے کہا تھا دونوں کا معمول کم از کم اگلے ایک دو سال تک کے لئے بدل گیا۔ وہ دونوں روز اکھاڑے کے پاس آدھا گھنٹہ بیٹھتے، پہلوانوں کو کسرت اور زور کرتے ہوئے دیکھتے، پھر سکول کی طرف چل پڑتے۔ سکول سے واپسی پر اپنے گاؤں میں ایک بوڑھے برگد کے پیڑ کے پاس، زمین کے ایک خالی ٹکڑے پر وہ سہ پہر سے شام تک اپنا اکھاڑا آباد کرتے اور گاؤں کے دوسرے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ مل کر پہلوان پہلوان کھیلتے۔ گاؤں کے دیگر لڑکوں کے لئے بھی یہ کھیل نیا اور دلچسپ تھا جس میں اول اول میدے کو سب پر برتری حاصل رہتی۔ اس کی بنیادی وجہ میدے کی قوت مشاہدہ اور تر دماغی میں پوشیدہ تھی جس کا اس وقت تک شیدے اور میدے دونوں کو ادراک نہیں تھا۔ میدا جب اکھاڑے میں موجود پہلوانوں کی حرکات و سکنات کا باریک بینی سے مشاہدہ کر رہا ہوتا تو اس وقت اُس کا دماغ غیر ارادی طور پر ان حرکات و سکنات کے باہمی ربط، ان کے پس پشت کارفرما میکنیزم اور ان سے برآمد ہونے والے نتائج کو پراسس کرنے میں مصروف ہوتا۔ شیدے اور دیگر گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ پہلوان پہلوان کھیلتے ہوئے اسی مشاہدے اور تر دماغی کی بدولت وہ اپنے مدمقابل کو منٹوں میں چت کر دیتا۔ شیدے کو اس بات سے بڑی چڑ ہوتی اور شام کو گھر جاتے ہی وہ اپنے باپ کے بھاری بھرکم ہتھوڑے اُٹھا کر اُنہیں مگدروں کی طرح گھمانے کی مشق کرنے لگ جاتا۔ البتہ میدے کے شام کے بعد کے معمول میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اُدھر سکول میں ہر گزرتے سال کے ساتھ بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اسے سنبھالنا اکیلے اُستاد صاحب کے بس کی بات نہ رہی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حکومت نے چند اہم اقدامات بھی کئے جن کے تحت سکول کی عمارت میں توسیع کر دی گئی، سکول کو پرائمری سے مڈل کا درجہ دے دیا گیا اور اساتذہ کی

تعداد بڑھا دی گئی جبکہ پہلے اُستاد صاحب بطور ہیڈ ماسٹر بدستور اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

میدا اور شیدا اُس وقت پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھے جب اُن کے جسموں میں وہ تبدیلیاں نمایاں ہونی شروع ہوئیں جن کی وجہ سے آنے والے کئی برسوں تک ہر کسی نے اُنہیں میدا کھڑ کنّا اور شیدا کَن ٹُٹّا کہہ کر ہی بلانا تھا۔

میدے کے کان یوں تو بچپن سے ہی اُس کے چہرے کی مناسبت سے قدرے بڑے اور باہر کو نکلے ہوئے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرق مزید نمایاں ہوتا چلا گیا۔ ہوا یوں کہ میدا سکول میں استاد کے ہر سوال کا جواب دینے میں ہمیشہ سب سے آگے رہتا تھا اور یہ بات اُس کے دیگر ہم جماعتوں میں سے کئی ایک کو پسند نہیں تھی۔ ایک دن جب اُس نے سوال کا جواب دیا تو اُستاد صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

''شاباش! اسے کہتے ہیں شاگرد جو اپنے استاد کی بات کان کھول کر سنتا ہے۔''

اُستاد کی اس بات پر ایک لڑکا فوراً بول اُٹھا۔

''کھڑ کنّا ہے نا جی...... یہ نہ بھی سننا چاہے تو بات اس کے کانوں میں پڑ ہی جاتی ہے۔'' یہ بات سنتے ہی تمام لڑکے ہنس پڑے اور استاد نے بھی بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکتے ہوئے سب کو ڈانٹ کر چپ کروایا۔ میدے کو تو یہ بات بری لگی سو لگی لیکن شیدے کا خون کھول اُٹھا۔

سکول کی چھٹی ہوتے ہی شیدے نے اپنے جگری دوست کی شان میں گستاخی کرنے والے لڑکے کو دھر لیا۔ وہ لڑکا اُس کے ایک اڑنگے کی مار نکلا۔ سیدھا زمین پر جا لیٹا اور شیدا اُس کی چھاتی پر سوار ہو کر بڑے بے رحمانہ انداز میں اُسے دونوں کانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''اب بتا......کون کھڑ کنّا ہے؟ اللہ کی قسم ابھی تیرے کان کھینچ کر سر سے جدا نہ کر دوں تو کہنا۔''

شیدا شاید سچ مچ ایسا کر بھی گزرتا لیکن خیریت گزری کہ میدا وقت پر وہاں پہنچ گیا اور اُس لڑکے کو شیدے کے غضب سے نجات دلائی۔

اُن کے گاؤں کا ایک اور لڑکا ایک سال پہلے ہی سکول میں داخل ہوا تھا، جو اب نورے کمہار کے ساتھ ہی سکول آتا جاتا تھا۔ اُس نے سارا ماجرا دیکھا اور اُن کے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی یہ بات تازہ خبر کی طرح ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھی۔ بس اُس دن کے بعد سے میدا ''کھڑ کنّا'' اور شیدا ''کَن ٹُٹّا'' مشہور ہو گئے۔

اس واقعے کے چند ماہ بعد ہی شیدے نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ پڑھائی لکھائی سے اُسے شروع سے ہی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور پہلوانی کا شوق اُس کے جسم کے ریشے ریشے میں ایک انجانا نشہ بن کر سرایت کر چکا تھا۔ اُس نے گاؤں کے چند ہم خیال لڑکوں کے ساتھ مل کر پہلوانوں کے اکھاڑے میں ایک استاد پہلوان کی شاگردی اختیار کر لی۔ فجر کے وقت وہ سب مل کر اکھاڑے میں پہنچ جاتے، دو تین گھنٹے کسرت کرتے، استاد سے داؤ پیچ سیکھتے، جسم کو تندرست اور چاق و چوبند رکھنے کے نسخے ذہن نشین کرتے،

ایک دوسرے کے ساتھ زور کرتے اور پھر واپس اپنے گاؤں کی طرف لوٹ جاتے۔ میدا سکول جاتے ہوئے اب بھی آدھا گھنٹہ اکھاڑے کے پاس رکتا، ان سب کو دیکھتا اور پھر سکول کی طرف چل پڑتا۔ شیدا اکھاڑے سے واپسی پر اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر اپنا آبائی پیشہ سیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے کی بھی کوشش کرتا۔ شام کے وقت وہ دوبارہ اپنے گاؤں میں برگد کے پیڑ کے پاس اپنا چھوٹا سا اکھاڑا آباد کرتے جس میں میدا بھی موجود ہوتا۔ لیکن پہلوانی کے اس کھیل میں شیدا اب سب سے آگے تھا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد میدے کے اصرار اور اُس کے اُستاد صاحب کی سفارش پر امام دین نے اُسے بڑے شہر کے سرکاری ہائی سکول میں داخل کروا دیا جہاں آنے جانے کے لئے میدے کو روزانہ تین گھنٹے بس پر سفر کرنا پڑتا۔ گھر واپسی پر ایک تو تھکاوٹ بہت ہوتی دوسرا سکول کا کام بھی کرنا پڑتا جس کی وجہ سے وہ شیدے کے اکھاڑے میں بہت کم جایا کرتا۔ جس سال میدا ہائی سکول میں داخل ہوا اُسی سال ملک صاحب نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی تھی لیکن اگلے تین سال تک جب اُس کے گھر کوئی اولاد نہ ہوئی تو ملکانی کو تشویش ہونے لگی۔ ملکانی کی اس پریشانی سے پورا گاؤں واقف تھا لیکن کوئی ملکانی سے کچھ نہ کہتا۔ ماسی رسولاں جو پورے گاؤں میں منہ پھٹ مشہور تھی رہ نہ سکی اور ایک دن ملکانی کو مشورہ دے بیٹھی کہ اُسے بغر وٹے پیر کی قبر پر حاضری دینی چاہئے اور منت ماننی چاہئے۔ ملکانی پریشان تو تھی ہی ماسی رسولاں کی بات سن کر حیران بھی ہوئی اور تجسس کے مارے پوچھ بیٹھی۔

''لے اُس پگلے کی قبر پر حاضری دینے سے اور منت ماننے سے کیا ہوگا بھلا؟'' ماسی رسولاں کے پاس جواب پہلے سے تیار تھا۔

''ملکانی جی! لوگوں کی باتوں پر نہ جائیں۔ لوگ تو جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ بُغر وٹے پیر بڑی پہنچی ہوئی ہستی تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر جب کبھی کوئی مصیبت آئی میں نے بُغر وٹے پیر کی قبر پر ایک دیا جلانے کی منت مانی اور یقین کریں کہ بس منت ماننے کی دیر ہوئی اور مصیبت غائب۔ یہ میں کوئی سنی سنائی نہیں بتا رہی میرا آزمایا ہوا ہے۔'' ماسی رسولاں کی اتنی سی بات ہی ملکانی کے لئے کافی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کسی تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ اگلے ہی دن بغر وٹے پیر کی قبر پر حاضر ہوئی اور منت مانی کہ اگر اُس کے گھر پوتا ہوا تو وہ بغر وٹے پیر کی کچی قبر پر ایک باقاعدہ مزار بنوائے گی۔ اب معلوم نہیں کہ بغر وٹے پیر کی کرامت تھی یا حکیم کی کوئی دوا اثر کر گئی، جو ملکانی کا بیٹا بلا ناغہ کھاتا تھا، کہ سال کے اندر اندر ملکوں کا گھر پہلے پوتے کی پیدائش کی خوشی سے بھر گیا۔ پوتے کی خوشی میں ملکانی اپنی منت کو نہیں بھولی تھی اُس نے ملک صاحب کو یہ بات اتنا زور دے کر کہی کہ وہ جلد سے جلد بغر وٹے پیر کا مزار تعمیر کروانے پر مجبور ہو گئے۔

ملک صاحب نے مزار کی تعمیر کا کام تو شروع کروا دیا لیکن اُن کے دماغ میں اس خرچ کی سود سمیت واپسی کا منصوبہ بھی پرورش پانے لگا۔ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی شروعات انہوں نے

گھر میں پوتے کی پیدائش پر مبارک باد دینے کے لئے آنے والوں سے کی۔ ہر ایک کو اپنی ناامیدی، بیوی کی منت، بغر وٹے پیر کی کرامت اور اپنی دریا دلی کا قصہ سناتے ہوئے وہ یہ کہنا کبھی نہ بھولتے کہ اللہ والوں کو ہمارے مال کی ضرورت نہیں لیکن اُن کی کرامت وہ کر دکھاتی ہے جو ہم اپنے مال کے زور پر نہیں کر سکتے، تو اپنے مال کو ہم ان اللہ والوں پر کیوں نہ خرچ کریں؟

ملک صاحب کی یہ مہم اتنی کارگر رہی کہ اردگرد کے پچاس دیہات میں بسنے والے ہر صاحب حیثیت نے اپنی استطاعت کے مطابق مزار کی تعمیر پر اُٹھنے والے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔ اس فوری کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک صاحب نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی غرض سے سوچ بچار شروع کر دی۔ شیدے اور اس کی پہلوانی کے چرچے انہوں نے سُن رکھے تھے اور اس بات سے بھی واقف تھے کہ اردگرد کے پچاس دیہات میں سے کم از کم بیس دیہات میں ایسے چھوٹے بڑے اکھاڑے موجود تھے اور سال میں ایک دو مرتبہ یہ سب مل کر پہلوانوں کے درمیان بڑے مقابلوں کا اہتمام بھی کرتے تھے جنہیں دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے۔ شیدے کا اکھاڑا اُس وقت تک کوئی باقاعدہ اکھاڑا نہیں تھا۔ وہ ابھی تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ روز صبح دوسرے گاؤں کے بڑے اکھاڑے میں جا کر ہی کسرت کرتا تھا۔ بغر وٹے پیر کے مزار کو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانے کی غرض سے ملک صاحب نے مزار سے کچھ فاصلے پر شیدے اور اُس کے ساتھیوں کے لئے ایک باقاعدہ اکھاڑا تعمیر کروانے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ شیدا یا اُس کے ساتھیوں میں سے کوئی، اس سال کے پہلوانی کے بڑے مقابلوں میں حصہ لے اور جیت کر دکھائے۔ یہ شرط تھی تو بہت کڑی لیکن شیدے کو محسوس ہوا کہ وہ اسے پورا کر سکتا ہے اگر اُسے مناسب خوراک، کسرت کرنے کے لئے وقت اور ضروری آلہ جات میسر ہوں۔ اس بات کا اظہار اُس نے فوراً کیا اور ملک صاحب نے اُس کی خوراک کا ذمہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ کسرت تم اپنا اکھاڑا بننے تک دوسرے گاؤں کے اکھاڑے میں کر سکتے ہو۔ شیدا بخوشی راضی ہو گیا۔

شیدے نے بڑے مقابلے کی تیاری کرنے میں دن رات ایک کر دیئے۔ تمام پہلوانوں کے اکھاڑے سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی وہ گھنٹوں کسرت کرتا رہتا۔ ملک صاحب کے ڈیرے پر اُس کے لئے خاص طور پر خوراک تیار کی جاتی اور ملک صاحب کے حکم پر ہی حکیم صاحب بدن کو چاق و چوبند اور توانا بنانے والے یونانی نسخے تیار کر کے شیدے کو کھلاتے۔ شام کو کسرت کے بعد تازہ نائی زیتون کے تیل سے شیدے کے پورے بدن کی مالش کرتا جس سے پٹھوں کی اینٹھن جاتی رہتی۔

میدا ابھی شیدے کی کارکردگی سے بہت خوش تھا اور اُسے پوری اُمید تھی کہ اگر شیدا ایسے ہی محنت کرتا رہا تو علاقے کا کوئی پہلوان اُس کے سامنے ٹک نہیں پائے گا۔ میدے نے ہی شیدے کو یہ گُر کی بات بتائی تھی کہ داؤ پیچ تو وہی ہیں جو سارے پہلوانوں کو معلوم ہیں اصل مقابلہ تو طاقت اور چستی کا ہونا ہے۔ یہ

بات شیدے نے اپنے پلے سے باندھ لی تھی اور شاید یہی بات بڑے مقابلوں میں اُس کے کام آ گئی۔

مقابلوں میں چھ فٹ لمبے شیدے کا کڑی محنت سے تیار کیا ہوا چوڑا چکلا بدن ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے آنے والا کوئی بھی پہلوان اس کی طاقت اور پھرتی کے سامنے پانچ منٹ سے زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ شیدا ان مقابلوں میں علاقے کے سب سے بڑے پہلوان کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا تھا۔ یہ بات جہاں اُس کے پورے گاؤں کے لئے باعث فخر تھی وہیں ملک صاحب کے منصوبے کی تکمیل کے لئے بنیادی اہمیت کی حامل بھی۔ ملک صاحب نے وہیں پر تمام حاضرین کے سامنے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے گاؤں کو یہ جو عزت ملی ہے اس میں بغر وٹے پیر کی کرامت کا بڑا کردار ہے اور اسی لئے وہ ہر سال بغر وٹے پیر کا عرس منایا کریں گے اور اس موقع پر شیدے کے اکھاڑے میں، جو کہ جلد ہی قائم کر دیا جائے گا، سالانہ کشتی کا مقابلہ بھی منعقد کیا جائے گا۔ اس کشتی کے مقابلے میں جیتنے والے پہلوان کو نقد انعام کے ساتھ ساتھ ایک ریشمی لباس، لکڑی کا گرز اور 'رُستم' کا خطاب بھی دیا جائے گا۔ میری تمام لوگوں سے گزارش ہے کہ بغر وٹے پیر کے مزار کی تعمیر میں جتنا ہو سکے اپنا حصہ ڈالتے رہیں تا کہ یہ کام جلد سے جلد مکمل ہو سکے۔ ملک صاحب کا یہ اعلان دور دراز کے علاقوں سے آئے کُشتی کے شائقین نے بھی سُنا اور اس کھیل کی سرپرستی کرنے پر ملک صاحب کو بہت سراہا۔ اس کے فوراً بعد ہی شیدے کا اکھاڑا بغر وٹے پیر کے مزار کی بغل میں قائم کر دیا گیا۔ کسرت کرنے کا سارا ساز و سامان مہیا ہو گیا۔ دوسرے دیہات کے کئی ایک نوجوان پہلوانوں نے شیدے کی شاگردی اختیار کر لی۔ ملک صاحب نے بھی اکھاڑے کے سامنے ہی ایک کمرہ تعمیر کروا کر اپنا ڈیرا وہیں منتقل کر لیا اور مزار کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ لوگوں کے چڑھاوے اور چندے کا حساب کتاب بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ پہلے عُرس کے موقع پر ہونے والے کشتی کے مقابلے میں 'رُستم' کا خطاب شیدے کے حصے میں ہی آیا اور اس کے بعد کوئی سورما اُس سے یہ خطاب چھیننے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

میدا اُس وقت تک ہائی سکول پاس کر کے کالج میں داخل ہو گیا تھا اور شہر میں ہی چند دوسرے طالب علموں کے ساتھ مل کر ایک ہوسٹل کے کمرے میں رہنے لگا۔ کالج کے بعد وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کاج بھی کر لیتا جس سے اُس کا جیب خرچ نکل آتا اور ساتھ میں شہر کے ماحول، گہما گہمی، لوگوں کے روزمرہ کے رویے اور زندگی کی مشکلات کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ گاؤں میں اُس کا چکر ہفتے دس دن کے بعد ہی لگتا تھا۔ ایف۔اے پاس کرنے کے بعد اُس کے باپ امام دین حلوائی نے اُسے مزید پڑھنے کی بجائے اُستاد بھرتی ہو جانے کا مشورہ دیا اور میدے کو بھی یہی لگا کہ اب اُسے اصل میدان میں اُترنا چاہئے۔ شہر میں اُس نے یہ بات بھی سیکھ لی تھی کہ صرف پڑھائی سے کچھ نہیں ہوتا اصل مسئلہ تو نوکری ملنے کا ہے۔ حکومت نے نئے پرائمری اساتذہ کی بھرتی شروع کی تو اُسے قصبے کے اُستاد صاحب سے اس کی خبر مل گئی جن کے ساتھ اُس کا باہمی ادب و احترام کا رشتہ ابھی تک قائم تھا۔ ملک صاحب کے ذریعے حاصل کیا گیا علاقے

کے ممبر کا سفارشی خط، درخواست کے ساتھ لگانے سے آخر کار نوکری مل گئی۔

اُس کا استاد بھرتی ہو جانا صرف اُس کے لئے ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں کے لئے باعثِ عزت تھا۔ سب کی نظر میں اُس کی عزت ویسی ہی ہو گئی تھی جیسی کہ ایک اُستاد کی ہوتی ہے۔ اب وہ محض میدا یا میدا کھڑکٹا نہیں رہا تھا بلکہ ماسٹر حمید بن چکا تھا۔ شیدے کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ وہ پورے گاؤں میں امام دین حلوائی کے ہاتھوں کی بنی مٹھائی بانٹتا پھرا۔

اس سے اگلے سال دو اہم واقعات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ بُغر وٹے پیر کے مزار کی تعمیر مکمل ہو گئی اور دوسرا یہ کہ شیدے اور ماسٹر حمید کی شادیاں ہو گئیں۔ شادیوں کے بعد جلد ہی دونوں کی بیویاں بھی آپس میں اُتنی ہی گہری دوست بن گئیں جتنی گہری یاری شیدے اور ماسٹر حمید کی تھی۔

شیدا ساری دنیا کے لئے رُستم تھا جس کے سامنے بڑے بڑے پہلوان دم نہیں مارتے تھے لیکن اپنی بیوی ساجدہ کے آگے وہ بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ یہ بات کچھ عرصہ کے بعد پورے گاؤں کو ہی معلوم ہو گئی تھی لیکن سب مذاق میں اُڑا دیتے کہ پہلوان کا زور اکھاڑے کے لئے ہوتا ہے زنانیوں کے لئے نہیں اور ویسے بھی دل تو سب کے پاس ہوتا ہے۔ ماسٹر حمید کی بیوی فریدہ اپنے شوہر کو شیدے کی فرمانبرداری کی مثال دیتے ہوئے کہتی کہ کاش تو بھی میری بات ویسے ہی مانتا۔ ماسٹر حمید آگے سے ہنس کر جواب دیتا کہ شیدا اکھاڑے میں سارا زور نکال آتا ہے مجھے تو گھر میں ہی نکالنا ہوتا ہے۔ بس یوں ہی چھ مہینے گزر گئے۔

ایک دن فریدہ کی موجودگی میں، ساجدہ سے ایک چھوٹی سی بات پر بری طرح ڈانٹ کھانے کے بعد شیدا منہ لٹکا کر گھر سے نکل گیا تو فریدہ سے رہا نہ گیا۔

"ساجو تجھے ہو کیا گیا ہے؟ اُس نے بھلا کون سی ایسی بات کہی تھی جس پر تُو نے بیچارے کو یوں جھڑک دیا؟"

"تُو رہن دے۔ اُس کی زیادہ حمایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شام کو آئے گا تو بُوتھی بھی اُس کی ٹھیک ہو چکی ہو گی۔"

"لیکن تجھے مسئلہ کیا ہے اُس کے ساتھ؟ ایسا چھ فٹ کا کڑیل جوان نصیب والیوں کو ہی ملتا ہے۔ گاؤں کی کئی زنانیاں مرتی ہیں اُس پر اور تجھے اُس کی کوئی قدر ہی نہیں۔"

"وہی مرتی ہیں جن کو چھ فُٹ کا کڑیل جوان نظر آتا ہے۔ یہ بات تو صرف میں ہی جانتی ہوں کہ اندر سے یہ سُورما صرف "تین انچ" کا ہے۔"

ساجدہ نے شہادت کی انگلی کی جڑ پر انگوٹھا رکھ کر باقی کی تین انگلیاں اپنی ہتھیلی کی طرف موڑتے ہوئے کہا اور فریدہ حیرت سے پھٹی نگاہوں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

◀◀ ● ▶▶

547 Gwynnwest Rd
Reisterstown, Md 21136 USA

● قرب عباس

آٹھواں سمندر

لکڑی کے فریم میں بڑا آئینہ لگا ہوا تھا، جس میں نیچے سے اوپر تک ایک لمبی دراڑ تھی جو کہ اُس کے عکس کو دو حصوں میں بانٹ رہی تھی۔ آنکھوں کا کاجل جو نمکین پانی کے ساتھ بہہ کر رخساروں پر کچھ کالی اور ٹیڑھی لکیریں چھوڑ گیا تھا۔ جب سُرخ ہونٹوں پر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی رگڑی تو وہ لکیریں مٹ تو گئیں مگر سرخی پھیل گئی۔ لمبی لمبی پلکیں اتار کر چھوٹی سی ڈبیا میں رکھی اور گھنے کالے بالوں کو بھی سر سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ بلی سے بابر بن چُکا تھا۔

کچھ دیر اِسی ٹوٹے آئینے میں اپنی پیشانی سے لے کر ناف تک دو حصوں میں بٹے عکس کو دیکھتا رہا اور پھر قمیض اتار کر پیٹھ دیکھی جس پر لاٹھیوں کے نشان واضح تھے۔

وہ کچھ گھنٹے پہلے ایک شادی سے لوٹا تھا، جس پر جانے کے لئے تیار ہوتے ہوئے اُسے اپنی ضرورتوں کے سمندر میں قطرہ شامل ہونے کی اُمید تھی۔ یہ اُمید ہر شادی سے پہلے جنم لیتی تھی۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ گرمی کی پوری رات ریشمی لباس پہن کر بغیر سانس لئے ناچنا پڑے گا، لوگوں کی رنگ برنگی باتیں سننا پڑیں گی، ہر طرح کی چھیڑ خانی کا بھی ہنس کر جواب دینا پڑے گا، مگر بدلے میں جو پیسے ملیں گے اُن کے سامنے اِن عذابوں کی کیا اوقات تھی؟ لیکن ایسا ہوا کہاں؟؟ شادی کی محفل عروج پر تھی وہ ناچتا چلا جا رہا تھا۔ تمام لونڈوں نے شراب پی کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ جب حد پار ہوئی تو خاندان کے کچھ بزرگ آ کر اُنہیں گالیاں بکنے لگے ایک نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بلی پر لاٹھی لے کر برس پڑا۔ پیسے تو کیا ملنے تھے بمشکل جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ گھر پہنچ کر تب سے اِس ٹوٹے آئینے کے سامنے بیٹھا اپنے خوابوں کی کرچیاں چُن رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے زخموں کو سہلانے کی کوشش میں تھا۔

اب بھلا شادیاں اُسکی ساری ضرورتیں کیسے پورا کر دیتیں؟ ضرورتیں تھیں بھی تو بہت زیادہ۔ ماں کو گلے کا کینسر تھا جو اتنا پُرانا ہو گیا تھا کہ اب اُسکا کم کم ہی ذکر ہوا کرتا تھا۔ زیادہ اُسے اپنی بہن کا جہیز (چار کُرسیاں ایک میز) پریشان کر رہا تھا جو پڑا پڑا دو مسہریوں کے انتظار میں دیمک زدہ ہو چکا تھا، اور وہ دو مسہریاں ابھی تک رشتے کیا انتظار میں بنی ہی نہیں تھیں۔ ہاں! ایک اور بھی تو فکر تھی، روز کی روٹی۔

آنسو بدستور ٹپک رہے تھے۔ پہلے اپنی پیٹھ کو سہلانے کی ناکام کوشش کرتا رہا، پھر وہی ہاتھ بڑھا

کر آئینے کی ٹھڑی سی دراڑ کو دو انگلیوں سے چُھوا۔ وہ دراڑ کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ آئینہ جڑ سکتا تھا، ہموار ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے عکس کو دو حصّوں میں تقسیم نہ کرتا یہ کیسے ممکن تھا؟ اس دراڑ کو چُھوتے ہی اس کے ذہن میں لاڈو کے کہے الفاظ ابھرے۔ ’ٹیڑھی لکیریں‘.....

لاڈو اسکی گُرو تھی۔ اب ناچنا چھوڑ کر سگریٹ پان کا کھوکھا بنا لیا تھا۔ وہ خود کو قدرت کے کھینچی ٹیڑھی لکیر کا جزو کہتی تھی۔ نہ مرد نہ عورت! مگر دماغ بہت مکمل تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں وقت بہت بڑا استاد ہے۔ لاڈو نے اس استاد سے نہ صرف پڑھا تھا بلکہ اس کے ساتھ ہم بستری بھی کر رکھی تھی۔ صرف گھنگھرو پہن کر ناچتی نہیں رہی تھی، بلکہ بہت کچھ سیکھتی سکھاتی بھی رہی۔

ہمارے اردگرد دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو اپنے گھر لڑکا پیدا ہونے پر خوشی محسوس کرتے ہیں اور لڑکی کے پیدا ہونے پر اداس ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جو لڑکے کی پیدائش پر بھی خوش ہوتے ہیں اور لڑکی کو بھی خدا کی رحمت کہہ کر گلے سے لگا لیتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان میں کہیں ایک اور طبقہ بھی ہے۔۔۔ جن کے گھر اولاد ہونے پر نہ تو خوشی منائی جاتی ہے، اور نہ ہی خود کو تسلی دینے کے لئے کوئی لفظ ملتا ہے۔ وہ تو اس ننھی جان کے آتے ہی اسکا گلہ گھونٹنے کے بعد دفنا کر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ کیوں کہ ماں باپ کے نزدیک اولاد کی ٹانگوں کے درمیان سوالیہ نشان ہونا، یا اس کے عناصر کی تشکیل پر مخالف جنس کا غلبہ پا لینا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

لاڈو بھی ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں باپ نے کچھ سال تو اسے چھپا کر رکھا مگر پھر ایک دن کئی ٹیڑھی لکیریں گلیاں گردانتے ان کی دہلیز پر آ کر واویلا کرنے لگیں۔ کیا ہو سکتا تھا، لاڈو کے لئے معاشرے نے جو جگہ مختص کر رکھی تھی اسے وہیں آنا پڑا۔ ماں باپ کی زندگی تک تو گھر آنے کی اجازت تھی، مگر ان کے بعد بھائیوں نے اپنے بچوں کے وقار کی خاطر اسے دھتکار دیا۔ اُسے اس گھر میں قدم رکھنے کے حق سے دستبردار کر دیا گیا جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی، اور پھر کبھی اُس نے وہاں کا رخ نہ کیا۔

جب عمر کے چار میں سے تین حصّے گزار چُکی تو ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا سگریٹ پان کا کھوکھا بنا لیا۔ اکثر کہا کرتی تھی، کیا بُرا تھا اگر وہ مجھے بھی کوئی ’’شے‘‘ لگا دیتا؟ آنکھیں دیں، کان دیا، ناک، منہ ہاتھ پیر..... ٹانگیں! مگر ٹانگوں کے بیچ آ کر کمی رہنے دی۔ کیوں؟ جہاں پوری دنیا کو دریا دلی سے ’’سودا‘‘ بانٹ ہی رہا تھا، ایک لکیر کھینچ ہی رہا تھا، تو ہم جیسوں پر آ کر کون سا کال پڑ گیا؟ مجھ میں کمی ہے۔ اس سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ چلو ادھورا چھوڑ دیا کوئی بات نہیں۔ پر اپنی باقی مخلوق کو تو پورا بناتا۔ انھیں کم از کم مکمل سمجھ تو دے دیتا۔ اتنا جاننے کے قابل تو بنا دیتا کہ ہم بھی دل اور دماغ رکھتے ہیں۔ جذبات ہم میں بھی پلتے ہیں۔ بارش ہمیں بھگوتے ہوئے بدکتی نہیں۔ ہوا ہمیں بھی چھوئے بغیر نہیں گزرتی۔ تو پھر یہ خدا کا بنایا انسان۔ دوسرے انسان سے جینے تک کا حق کیوں چھین لیتا ہے؟ کیوں ہنستا ہے؟ کیوں مذاق اڑاتا ہے؟

کیوں گھورتا ہے؟

ہمیں شادیوں پر نچاتے ہیں۔ تالیاں بجاتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں۔ دعائیں بھی کرواتے ہیں۔ کچھ اپنی ہوس کی آگ بھی بجھاتے ہیں۔ عزت کرنا تو ایک طرف انسانوں کی گنتی میں بھی نہیں گنتے۔ اصل ہیجڑا پن تو یہ ہے..... یہ ڈھیلے نالے (ازار بند) والی دنیا انسان کی شلوار میں جھانک کے ہی کیوں اُسے انسان ہونے کی سند دیتی ہے؟ قصور ہمارا تو نہیں۔ ہم تو قدرت کی کھینچی لکیریں ہیں۔ ٹیڑھی لکیریں۔

لاڈو قدرت سے بھلے جتنا بھی لڑ لے، کوس لے، خود کو اسی کی کھینچی ٹیڑھی لکیر کہہ لے مگر.....اس کے باوجود وہ پوری عمر کی کمائی میں سے حج کر آئی تھی۔ اکثر ہنس کر کہا کرتی تھی کہ میں نہیں جانتی کہ خدا مجھے یہاں سنتا تھا کہ نہیں، سوچا میں مقدمہ لے کر اس کے گھر ہی جاؤں، کہ خدایا اتنی کنجوسی.....؟

خیر.....رمضان و محرم کے فاقوں، لوگوں کی بداخلاق نظروں اور پھر غیرت مند بزرگوں کی بے رحم لاٹھیوں جیسی چیزوں کا سامنا کر کر کے بابر نے بلی کو خیر باد کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ یہ بات پہلی بار اُس کے ذہن میں نہیں آئی تھی، بلکہ کئی مہینوں سے اِس پر سوچ رہا تھا لیکن ہمت نہ پڑتی۔ آج پھر جب لاڈو کی زندگی پر غور کیا تو اس کے خیالات کو اور تقویت ملی۔ وہ اپنے مالک مکان کے پاس پہنچا دروازے پہ دستک دی۔

''کونڑ؟''

''الیاس بابو میں واں.....بابر۔۔۔ذرا بار آنڑاں۔''

الیاس باہر آیا۔

''ہاں جی، کی گل اے بئی؟''

''تھوانوں دسن آئے آں کہ کمرہ چھڈن لگے آں۔''

بابر نے ڈھیلی سی آواز کے ساتھ نظریں جھکا کر کہا۔

''کیوں؟ خریت تے ہے ناں؟ کتھے چلے او؟''

''آہو جی، بس اپڑے کار، ایہو کم ہی چھڈن لگے آں۔''

''ہویا کی اے؟''

''کج نئیں جی، بس کج نئیں رکھیا اس کم وچ۔''

''اچھا.....چلو مرضی تھہاڈی، کوئی ہور کرائے دار ہویا تے دسنا۔''

''جی ٹھیک اے۔''

''ٹھاڈی بڑی یاد ستاوے گی۔''

الیاس نے مُسکراتے ہوئے بابر کی ناک اپنی شہادت کی انگلی سے چھوئی۔

بابر بھی بلیا نہ انداز میں شرماتے ہوئے بولا۔

''الیاس جی تُسی وی نا.....باز نہ آنڑاں.....''

''جانڑاں کدوں اے؟''

''بس کل ای۔''

جس سائیکل پر اس کا باپ سبزی بیچا کرتا تھا وہ چھ مہینے سے گھر کی دیوار کے سہارے پنچر ٹائر لئے کھڑی تھی۔ اور باپ سائیکل کے پنچر ہونے سے ڈیڑھ مہینہ پہلے جہانِ فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ اس سائیکل کی مرمت کروانے کے بعد بابر نے سبزی منڈی جا کر کچھ سبزیاں خریدی اور سائیکل پر لاد کر بیچنے نکل پڑا۔

گلی کی نکڑ پر پہنچ کر آواز لگائی۔

''آلو.....ٹماٹر.....مرچاں.....اوہم اوہم.....'' آواز قدرے ہلکی تھی۔ قہقہہ سنائی دیا مڑ کر دیکھا تو گلی میں کھڑے کچھ لڑکے ہنس رہے تھے۔ اُن میں سے ایک بولا۔

''فیر بول.....فیر بول.....''

اب بھلا پکا پکا بابر بننے کے فیصلے سے چال ڈھال یا ادائیں تو نہیں بدل جاتیں۔ بھلے وہ بابر بننے کی ٹھان چکا تھا مگر جو اس وجود میں 'بلی' رَچ بس چکی تھی اس کا جانا اتنا آسان تو نہ تھا۔ سائیکل پر سوار ہوا لڑکھڑاتے ہینڈل کو سنبھالتے ہوئے پوری قوت سے پیڈل مارنے لگا۔ غصہ اور شرم پانی بن کر اس کے ماتھے سے ٹپک رہا تھا۔ سوچا محلے سے کہیں دور جایا جائے۔ قدیمی محلے میں پہنچ کر سائیکل سے اترا، اِدھر اُدھر دیکھ کر آواز لگائی ابھی آدھی گلی ہی پار کی تھی کہ ایک عورت آئی۔

''ٹماٹر کس طرح لگائے ہیں؟''

''جی باجی صرف ستھر روپے کلو۔''

عورت نے انداز دیکھا تو مسکرا کر ڈوپٹے سے آدھا چہرہ ڈھانپ لیا۔

''پچاس کے لگا لو اور ایک کلو دے دو۔''

اُس نے ٹماٹر تولنا شروع کر دیئے۔ عورت دوبارہ بولی۔

''تم شادیوں پر بھی ناچتے ہو نا؟'' بابر کے ہاتھ رک گئے۔ تھوڑی دیر عورت کی طرف دیکھا اور پھر ٹماٹر شاپنگ بیگ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''جی باجی.....اب چھوڑ دیا ہے۔''

''مجھے یاد ہے تم میرے دیور کی شادی پر آئے تھے۔ لاہور والی بچیوں نے تمہارا ڈانس دیکھنے کے لئے تمہیں اندر بُلوایا تھا۔ اچھا کیا جو ناچنا چھوڑ دیا.....محنت کر کے کماؤ۔''

بابر نے ٹماٹر دے کر پیسے لئے اور آگے چل پڑا۔

''ہونہہ.....ہر کوئی حاجی بنڑیا پھردا اے۔'' بہت سی نگاہیں برداشت کیں اور بہت قہقہے سُنے۔

بہت جملے کسے گئے.....اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے پیشے سے زیادہ ایک پھیری والا بن کر ذلت سہہ رہا ہے۔ ہر دوسری گلی میں کوئی نہ کوئی ایسا مل جاتا جو ببلی سے واقف ہوتا۔ ایسے میں سبزی تو خاک بیچنا تھی۔ بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ جیسے جیسے سورج ڈھلتا جا رہا تھا کمر میں لاٹھیوں کا درد دوبالا ہو رہا تھا۔ ٹانگیں جواب دیتی جا رہی تھیں۔ قمیض چھاتی، کمر اور بغلوں کی جگہ سے پسینے کے سبب جسم کے ساتھ چپک رہی تھی۔ اُسے اس باریک لباس میں ریشمی لباس سے زیادہ اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سوچوں کے انبار تلے دبی اس کی آواز کا باہر آنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سائیکل کا ہینڈل تھامے پیدل چلتا جا رہا تھا۔ سمت کا نہیں پتا، کام کا نہیں پتا، بس چلتا ہی جا رہا تھا۔

آواز آئی۔

''اوئے اوئے.....ببلی بدماش توں شریف ہوگئی.....'' اور ساتھ ہی بہت سارے قہقہے۔ اُس نے مُڑ کر نہ دیکھا۔ چُپ چاپ چلتا رہا۔ فقط ہونٹ بڑبڑائے۔

''کتے، حرامزادے۔'' پھر ایک اور آواز آئی۔

''اک کلو آلو دے جاتے نال دو ٹھمکے وکھا جا.....''

پھر وہی قہقہے۔ اُس نے اَن سُنی کر دی.....اتنے میں ایک لڑکا سائیکل پر سوار پاس سے گزرا اور بابر کی سائیکل کو لات مار کر آگے نکل گیا.....سائیکل زمین پر گرتے ہی ساری سبزیاں یہاں وہاں بکھر گئیں۔ پہلے سبزیوں کی طرف دیکھا پھر اُن لفنگے لڑکوں کی طرف اور بہت ہی زنانہ انداز میں بولا۔

''ذلیلو.....کتو.....شرم تے نئیں آندی.....'' جواب میں بے شمار قہقہے۔ وہ نیچے بیٹھ کر سبزیاں چُننے لگا، اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے.....

دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر سے آواز آئی۔

''کونڑ.....؟''

''الیاس بابو میں واں.....'ببلی'.....ذرا بار آنڑاں.....کمرہ کرائے لئی خالی اے نا؟ میں کل واپس آرئی آں.....''

1st floor, Anjuman Himayat-e-Islam compex,
4-shershah block, New Garden Town.
Lahore (Pakistan..)

● ابرار مجیب

افواہ

میرے خلاف ایک نہ ایک افواہ جنم لے لیتی ہے اور چاروں طرف گشت کرنے لگتی ہے۔ یہ افواہیں کون پھیلاتا ہے، یا کون لوگ پھیلاتے ہیں مجھے نہ تو علم ہے اور نہ ہی اس کوئی اندازہ لگا سکتا ہوں۔ اپنے تعلق سے پھیلی ہوئی افواہ کا علم بھی مجھے کسی دوسرے کے ذریعہ ہوتا ہے، جب وہ شخص اس پھیلی ہوئی افواہ کے بارے میں مجھ سے تفتیش کرتا ہے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ یہ بات کیوں گشت کر رہی ہے۔ کیا وجہ تھی کہ میں نے یہ حرکت کی۔ اب اس حرکت کے ازالہ کی صورت کیا ہے یا میں اس غلطی سے عہدہ برآ کیسے ہوؤں گا وغیرہ وغیرہ۔ پہلے تو میں اس افواہ کے متعلق سن کر ہی ششدر رہ جاتا ہوں۔ جو بات میرے وہم وگمان میں نہ تھی وہ سارے شہر کو پتہ ہے۔ اوپر سے تابڑ توڑ سوالات، میں ان سوالات کا آخر کیا جواب دے سکتا ہوں؟ جب کہ اس قسم کی افواہ کا کسی بھی سطح پر میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے۔ شہر میں اچانک ایک پراسرار خاموشی رقص کرنے لگی۔ لوگ ایک دوسرے سے نظریں بچا کر گزر جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے برائے نام گفتگو رہ گئی تھی۔ ایک عجب شک وشبہہ کا ماحول تھا۔ یہ ماحول بہت دھیرے دھیرے بنا تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اسی سلسلے میں غلطاں وپیچاں تھا کہ ایک جاننے والے نے آ کر کہا یہ شہر کا ماحول آپ کی وجہ سے خراب ہو رہا ہے۔ میری وجہ سے؟ میں حیران رہ گیا۔ آخر شہر کی پراسرار خاموشی اور شک وشبہہ کی فضا کو بنانے میں میرا کیا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ میں تو چپ چاپ گھر سے نکلتا ہوں، آفس جاتا ہوں، شام تک فائلوں میں سر کھپاتا ہوں اور واپس گھر آ جاتا ہوں۔ ہاں کبھی سبزی یا پھل اور مٹھائی خریدنے کے لئے ادھر سے ہی بازار چلا جاتا ہوں۔ گھر آ کر منہ ہاتھ دھو کر ایک پیالی چائے پیتا ہوں اور صبح کا اخبار اٹھا کر برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس دن جب میں برآمدے میں آ کر بیٹھا۔ اسی وقت وہ شخص آ گیا جس نے مجھے یہ خبر دی تھی کہ شہر میں پراسرار خاموشی کا سبب میں ہوں۔

''بھائی یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''جی ہاں۔'' اس نے میرے قریب کھسک کر مدھم لہجہ میں کہا۔

''سب لوگ آپ ہی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

''میرے بارے میں۔'' میں نے تعجب سے پوچھا، پھر بولا۔

''بھائی! اس معاملے سے میرا کیا تعلق ہے؟''

''لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے محلّہ سے جانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اور یہ بات آپ نے سب کے سامنے کہی تھی۔''

''ایک تو ایسا کچھ میں نے کہا نہیں۔ اگر کہا بھی ہے تو اس سے شہر کی پراسرار خاموشی کا کیا تعلق؟''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، یعنی آپ کے اس فیصلے کا شہر کے ماحول سے کوئی تعلق ہی نہیں؟''

''بھائی محلے سے مکان خالی کرنے کے بارے میں، میں نے کبھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ پتہ نہیں کون یہ افواہ پھیلا رہا ہے۔'' میں نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''دوسری بات یہ کہ اس سے شہر کے ماحول کا کیا تعلق؟''

''عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ ارے آپ کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی ہوشیار ہوگئے ہیں اور وہ بھی اپنا اپنا مکان خالی کرنے کے بارے میں سوچ رہے جو آپ کی طرح ان کے محلوں میں رہتے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ لوگ خواہ مخواہ مجھے بدنام کررہے ہیں۔''

''بدنام نہیں کررہے ہیں ان کا خیال ہے کہ آپ کو اندر کی بات کا پتہ ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟''

اندر کی بات کا تو مجھے پتہ نہیں تھا لیکن اندر ہی اندر میں اضطراب کا شکار ضرور ہوگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی تھی۔ سامنے بیٹھے شخص پر مجھے بے انتہا غصہ آنے لگا۔ لیکن غصہ کو پیتے ہوئے میں نے سوچا اس شخص کا کیا قصور ہے۔ یہ تو مجھے پھیلی ہوئی افواہ کی جانکاری دے رہا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر اور اس سے گفتگو کی اور چائے پلا کر اسے رخصت کردیا۔ اس نے جو خبریں دی تھیں وہ خوف میں مبتلا کردینے والی تھیں۔ اس نے بتایا کہ میرے مکان خالی کرنے کے فیصلے کے دو دنوں کے بعد چوک پر ایک سمیلن ہوا تھا اور اس میں سادھو سنتوں کے علاوہ کچھ راج نیتا بھی شامل تھے۔ اس کے بعد دوسرے محلوں سے بھی لوگ اپنا بوریا بستر باندھنے لگے۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ میں نے مکان چھوڑنے کی بات بتانے کے باوجود ابھی تک اپنا مکان نہیں چھوڑا تھا جب کہ معاملہ اب بے حد نازک ہوچلا تھا۔ بہت دیر تک میں غور کرتا رہا کہ شاید میں نے مکان چھوڑنے کی بات کسی سے کہی ہو۔ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ یاد آتا بھی کیسے۔ آخر مکان خالی کرنے کوئی وجہ بھی تو ہوتی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی تھی۔ اپنے گھر والوں سے بھی نہیں۔ میں کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا اور ایک سگرٹ سلگا کر پینے لگا۔ منہ سے نکلتے دھوئیں کے مرغولوں کو دیکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ ایک رات میں نے خواب میں دھوئیں کے گھنے بادل دیکھے تھے۔ یہ بادل زمین سے اٹھ رہے تھے اور گھنے دھوئیں کے غبار میں چہرے اور مکانات بے حد دھندلے نظر آرہے تھے۔ اسی وقت میں سوچا تھا کہ یہ مکان خالی کرکے کسی محفوظ جگہ پر چلا جاؤں۔ اب خواب میں کئے گئے ارادے کو کوئی دوسرا کیسے جان سکتا ہے؟ مجھے پورا یقین ہے کہ میں نے اپنے خواب

میں کئے گئے ارادے کا اظہار ہرگز ہرگز کسی سے نہیں کیا تھا۔

شہر کی اس عجیب صورت حال نے مجھے اندر سے بے حد پریشان کردیا تھا۔ ایک ایسی بات جس سے میرا قطعی کوئی تعلق نہیں تھا پورے شہر کے لئے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس خطرناک صورت حال سے شہر کو باہر نکالنے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟ کیا میں اعلان کردوں کہ میں نے کبھی بھی محلے سے مکان خالی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا؟ لیکن اب اس اعلان کا کیا فائدہ؟ میرا نام تو اب ہزاروں قسم کی افواہوں کی گرد میں کہیں دب گیا تھا۔ لوگ متحرک ہوچکے تھے اور مختلف محلوں سے لوگوں کی مراجعت کا سلسلہ بھی شروع ہوچکا تھا۔ پھر کیا کیا جائے، بہت غور وخوض کے بعد مجھے ایک راستہ نظر آیا۔ کیوں نہ مقامی تھانے میں جاکر یہ بات بتادوں کہ شروع میں میرے تعلق سے جو خبریں پھیلائی گئی تھیں وہ محض افواہ تھیں اور یہ کہ میں اب بھی اسی محلے میں اپنے مکان میں بیوی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ یہ ایک بہتر آئیڈیا تھا۔ میں فوراً تھانے کے لئے روانہ ہوگیا۔

''کیا بات ہے؟'' تھانیدار نے مشکوک نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا؟

''جی، اپنے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہے۔'' مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کی شروعات کہاں سے کروں۔

''کوئی رپورٹ لکھوانی ہے؟''

''جی نہیں، بس میں اپنے بارے میں ایک حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔''

''حقیقت کا اظہار!'' تھانیدار نے غور سے میرا جائزہ لیا۔ پھر میز پر پڑے ہوئے ڈنڈے کو اٹھا کر ہاتھوں میں لیا اور اسے بڑے دھیان سے دیکھتے ہوئے اس نے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر اپنی ٹانگیں پھیلا دیں۔

''اچھا تو پھر؟'' اس نے ایک ہاتھ سے ڈنڈے کو گھماتے ہوئے پوچھا۔

''میرے بارے میں کچھ لوگوں نے غلط افواہ اڑا کر شہر کے ماحول کو خراب کردیا ہے۔'' کسی تمہید کے بغیر میں نے کہا۔

''کون سی افواہ؟'' تھانیدار نے ڈنڈا میز پر رکھتے ہوئے مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''یہی کے میں محلے سے مکان خالی کررہا ہوں۔''

''کیا؟'' تھانیدار چونک گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے بہت لمبی ہوں کہی پھر گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''کون سا محلّہ ہے؟''

میں نے محلے کا نام بتایا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر سخت لہجہ میں بولا۔

''تم نے اب تک مکان خالی نہیں کیا؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، میں بھلا مکان خالی کیوں کروں؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

تھانے دار کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''دیکھو تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ دوسرے محلے سے بھی لوگ اپنا اپنا مکان خالی کرنے لگے ہیں۔ حالات مسلسل بگڑ رہے ہیں۔ بلکہ بگڑ چکے ہیں جتنی جلد ہو سکے مکان خالی کر کے چلتے بنو۔''

اب تھانے دار سے کوئی توقع فضول تھی۔ میں جب تھانے سے باہر نکل رہا تھا تو تھانے دار نے انتہائی دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو مکان خالی کر دوں ورنہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ کچھ نہ کرنے کی دھمکی سے میں بخوبی آگاہ تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ سڑک پر آ گیا۔ باہر اندھیرا تھا..... شاید لوڈ شیڈنگ..... اوپر شہر کے مشرقی حصے میں آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ اس شہر میں دفعتاً پورا آسمان ہی سرخ ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ شاید وہ اسٹیل پلانٹ تھا جس کا پگھلا ہوا سلیگ راتوں میں ڈمپ کیا جاتا تھا۔ آسمان کے سرخ ہوتے ہی شہر میں گرمی بڑھ جاتی تھی اور لوگ پیاس محسوس کرنے لگتے تھے۔ مجھے بھی پیاس محسوس ہوئی لیکن آس پاس کوئی ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں سے پانی لے کر پی لیتا۔ سوچا اب گھر پہنچ کر ہی پانی پی سکوں گا۔ اوپر بے شمار پرندے سرخ روشنی کے حصار میں قید پرچھائیوں کی صورت بے چینی سے پھڑ پھڑاتے نظر آ رہے تھے۔ یہ پرندے بھی روشنی کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایک مسلسل سراب کی کیفیت۔ انہیں حیرت ہوتی ہوگی کہ اچانک اندھیری رات میں تیز روشنی کیسے پھیل جاتی ہے، یا صبح صادق کا منظر کیوں کر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہی اندھیری رات۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی اس لئے میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ چاروں طرف ایک عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ لوگ بھی بہت کم نظر آ رہے تھے۔ ہاں آوارہ کتے ادھر ادھر بھاگتے ضرور نظر آ رہے تھے۔ عام طور سے آوارہ کتے اتنے سویرے سڑکوں پر اودھم نہیں مچاتے تھے لیکن آج وقت سے پہلے چھا جانے والے سناٹے کی وجہ سے یہ بھی متحرک ہو گئے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں کوئی ان میں سے اچانک مجھ پر حملہ آور نہ ہو جائے لیکن گھر تک پہنچتے پہنچتے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ایک دو بار ان کا غول مجھے چھو کر گزرا لیکن مجھ پر بھونکا نہیں۔

مکان کے دروازے کے سامنے کئی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ میرے اندر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں ان لوگوں کو نظر انداز کرتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ میری بیوی خالی خالی آنکھوں سے خلاء میں نظریں جمائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ اس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تیر رہے ہیں۔ یوں بھی وہ اکثر خوف کی کیفیت میں مبتلا رہتی تھی اور اس کی وجہ

تھی ہارر مووی اور خوفناک ناولوں سے اس کی دلچسپی۔ پچھلے مہینے کی بات ہے اس نے بہت ضد کر کے مجھ سے برام اسٹوکر کا ناول ڈریکولا منگوایا تھا۔ ناول پڑھنے کے دوران اگر کھڑکی ہوا کے جھونکے سے کھڑکھڑاتی تو اسے محسوس ہوتا کہ چمگادڑیں کھڑکی کے شیشہ پر سر پٹخ رہی ہیں۔ کئی بار اس نے مجھ سے کھڑکی مضبوطی سے بند کرنے اور پردوں کو ٹھیک سے برابر کرنے کے لئے کہا تھا۔ اس نے کئی دفعہ اس خوف کا اظہار بھی کیا تھا کہ کھڑکی یا دروازوں کی جھریوں سے دھوئیں کی شکل میں ڈریکولا اندر آ سکتا ہے۔ ایک بار وہ ایک دوڑتے ہوئے چوہے کو دیکھ کر بری طرح چیخ پڑی تھی۔ جب میں نے پوچھا کیا اسے چوہے سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے تو اس نے بتایا نہیں دراصل ڈریکولا چوہے کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس دن اس نے مجھ سے منت کی تھی کہ میں اسے لہسن کے پھول اور چرچ سے مقدس روٹیاں لا دوں۔ پہلے تو مجھے ہنسی آئی لیکن اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے مجھے لگا یہ چیزیں اس کی نفسیاتی گرہ کو کھولنے میں معاون ہوں گی۔ مقدس روٹیوں کا انتظام تو میرے ایک عیسائی دوست نے کر دیا لیکن سبزی مارکیٹ میں لہسن کے پھول کہیں نہیں ملے۔ گھر آ کر میں نے بیوی سے جھوٹ کہہ دیا کہ عیسائی پادری کا کہنا ہے کہ مقدس روٹی کے ساتھ اگر لہسن کے پھول نہ ہوں تو لہسن کو کچل کر کمرے میں ڈال دینا کافی ہوگا۔ دراصل ڈریکولا لہسن کی بو سے بھاگتا ہے خواہ وہ بو پھول سے آئے خواہ خود لہسن سے۔ اسے میری بات کی سچائی پر یقین آ گیا۔ اس نے لہسن کچل کر کمرے میں جگہ جگہ رکھ دیا۔ اس کی بو میرے لئے ناقابل برداشت تھی، بلکہ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں ہی دراصل ڈریکولا ہوں اور مجھے فوراً گھر چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیے۔ ان انتظامات سے میری بیوی بہت حد تک پرسکون ہو گئی تھی۔ لیکن ایک دن اس نے فرمائش کی کہ گھر میں ایک صلیب کا ہونا بھی ضروری ہے۔ میں بری طرح چونک پڑا۔ میں نے اسے سمجھایا لوگ کیا کہیں گے ہمارے گھر میں صلیب۔ لیکن وہ بضد رہی۔ اس نے کہا کہ ہمارا مقصد شیطان کو دور رکھنا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ خیر میں نے اسے ایک صلیب بھی لا کر دے دی تھی جسے اس نے کمرے کی دیوار پر ٹانگ دیا تھا۔ بہرحال ان دنوں میری بیوی بالکل نارمل تھی اور حالیہ دنوں میں نہ تو اس نے کوئی ہارر مووی دیکھی تھی اور نہ ہی کوئی ناول پڑھا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے ایسے ہی تھے جیسے اس کے ذہن میں تصوراتی ڈریکولا پھر سے زندہ ہو گیا ہو۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے بیوی کی بغل میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے سنا نہیں؟'' اس کی آنکھوں کا خوف کچھ اور گہرا ہو گیا۔

''کیا نہیں سنا، صاف صاف بتاؤ۔'' مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ ایک تو تھانے دار کے رویئے کی وجہ سے میں پہلے ہی پریشان تھا اوپر سے یہ سسپنس پیدا کر رہی تھی۔

''وہ لوگ آئے ہوئے ہیں اور تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ کیا باہر انہوں نے تم سے کچھ کہا نہیں۔''

بیوی نے اسرار برقرار رکھا اور میری جھنجھلاہٹ غصہ میں تبدیل ہونے لگی۔ میں نے یاد کیا باہر

کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔لیکن یہ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں یہ بات میرے لئے تعجب خیز تھی۔اور اگر وہ ملنے آئے تھے تو انہوں نے مجھ سے کچھ کہا کیوں نہیں۔شاید میں بہت تیزی سے اندر آ گیا تھا اور انہیں کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا یا وہ چاہتے تھے کہ پہلے میں گھر کے اندر جا کر بیوی سے گفتگو کرلوں۔پتہ نہیں۔

''تم بتادو، کیا بات ہے؟'' میں نے غصہ کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بغیر سر والا، ادھر محلے کے جنوبی حصے میں، بغیر سر والا دوڑ رہا تھا اور اس کی گردن سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔'' میری بیوی تھوک نگلتی ہوئی بے حد خوفزدہ آواز میں بولی۔

''کچھ دیر دوڑنے کے بعد وہ گر گیا۔یہ لوگ جو ہمارے دروازے پر کھڑے ہیں اسے جھنڈے میں لپیٹ کر لے جانے کے لئے آئے ہیں۔انہوں نے بتایا مجھے۔کچھ لوگ سر کی تلاش بھی کر رہے ہیں۔'' بولتے بولتے اس کی سانسیں ناہموار ہوگئیں۔

''کیا'' میری چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

ہڑبڑا کر میں باہر آ گیا۔وہ لوگ ابھی تک موجود تھے۔ان میں سے ایک آگے بڑھ کر میرے قریب آ گیا اور پھسپھساتی ہوئی آواز میں بولا۔

''آپ ابھی تک یہیں پر ہیں؟ آپ کو تو سب سے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔آپ کو تو صورت حال سے آگاہ ہی تھی۔''

''کون سی صورت حال؟'' میں نے غصہ میں پوچھا۔

''محلے کے جنوبی حصے کا واقعہ آپ کو پتہ ہے؟''

''ابھی میری بیوی نے بتایا ہے۔''

''پھر؟''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' میں نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے بھائی ہم نے اسے جھنڈے میں لپیٹ لیا ہے۔ہم سے کہا گیا ہے کہ آپ سے سختی سے کہہ دیا جائے کہ آپ مکان خالی کردیں ورنہ..... بار بار ہم جھنڈے لے کر آنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔''

کچھ دیر تک وہ لوگ آپس میں گفتگو کرتے رہے پھر مجھے اشارہ کر کے چلے گئے۔میں سخت تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔حالات واقعی قابو سے باہر ہو چکے تھے۔بغیر سر والے کے دوڑنے کا واقعہ انتہائی خطرناک تھا۔میری بیوی بے حد خوفزدہ ہو چکی تھی اور مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی کہ میں کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں ہوں۔میں نے انتہائی ٹھنڈے دل سے صورت حال پر غور کرنا شروع کیا۔محلے کے جنوبی حصے میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کے بعد صورت حال کے مزید خراب ہونے کا اندیشہ تھا اور یہ جھنڈے کا استعمال تو بے حد خوفناک تھا۔بیوی کا خیال تھا کہ ہمیں جلد از جلد مکان خالی کر دینا چاہئے اور یہ لوگ جس جگہ لے جانا

چاہتے ہیں وہاں چلے جانا چاہئے۔موجودہ منظرنامے میں مکان خالی کر دینا مجھے بھی مناسب لگ رہا تھا لیکن جہاں جانے کے لئے کہا جا رہا تھا اس جگہ کے بارے میں، میں مشکوک تھا۔بیوی نے کہا چل کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔بہرحال میں نے مکان خالی کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

وہاں عبادت گاہ کے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا، جس میں ٹینٹ لگائے گئے تھے۔ہمیں بھی ایک ٹینٹ دے دیا گیا۔مختلف محلوں سے آ کر لوگ یہاں ٹینٹوں میں جمع ہو گئے تھے۔عبادت گاہ میں وقت کے مطابق عبادت جاری تھی اور جھنڈوں میں لپٹے لوگوں کو لا کر چبوترے پر رکھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔پھر انہیں وہاں سے ایک ہجوم چوک پر لے جاتا۔نعرے لگتے، عہد و پیمان ہوتے اور انہیں جھنڈے سمیت گاڑ دیا جاتا۔

ایک صبح میری چارپائی کے گرد لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔میں بے حد حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے۔ٹینٹ کے ایک کونے میں میری بیوی زور زور سے رو رہی تھی اور کچھ عورتیں اسے سنبھالنے میں لگی تھیں۔چارپائی کے ارد گرد کھڑے لوگ میری موت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ساری سازش میری سمجھ میں آ گئی راتوں رات کچھ لوگوں نے میری موت کی افواہ پھیلا دی تھی۔مجھے اسی لئے یہ علاقہ مشکوک لگ رہا تھا اور میں یہاں آنا نہیں چاہتا تھا۔میرا شک سو فیصد درست ثابت ہوا۔چارپائی کے گرد کھڑے لوگ کہہ رہے تھے کہ اگر میں مکان پہلے ہی خالی کر دیتا تو آج زندہ ہوتا۔انہیں مجھے جھنڈا میں لپیٹنا نہیں پڑتا۔لیکن ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔میں اندر ہی اندر غصے سے کانپ رہا تھا۔میں چیخ چیخ کر کہنا چاہ رہا تھا کہ میری موت کی خبر افواہ ہے۔میں زندہ ہوں لیکن میری آواز شاید بے انتہا غصہ کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہی تھی اور چارپائی کے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ بھی میری طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کچھ لوگوں نے مجھے نہلانا شروع کیا۔نہلا کر مجھے سر سے لے کر پیر تک جھنڈے میں لپیٹ دیا گیا۔پھر عبادت گاہ کے چبوترے پر رکھ کر سب لوگ عبادت میں مصروف ہوگئے۔عبادت سے فراغت پا کر ان لوگوں نے مجھے اٹھالیا۔کسی نے زور سے کہا اسے چوک پر لے جا کر رکھا جائے۔کسی دوسرے نے سوال کیا کہ اسے کیوں؟ کئی آوازیں ابھریں، ارے ہمیں دکھانا ہے کہ ہم ایسی باتوں سے نہیں گھبراتے۔مجھے لے کر وہ چوک پر پہنچ گئے اور جھنڈے میں لپٹے میرے وجود کو ایک اونچے چبوترے پر رکھ دیا گیا۔

جھنڈے میں لپٹا میں، سمجھ نہیں پا رہا ہوں کی اپنی موت کی افواہ کا سدباب کیوں کر کروں؟

◀◀ ● ▶▶

278, Delta-B,
Sahara City,Mango,
Jamshedpur-831012. Jharkhand

● سلمیٰ جیلانی

1923_61531411
not found.

بے درماں

''باجی! وہ..... مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

کام سے نمٹ کر حسنہ نے پرانے رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ مجھے اس کے رازدارانہ لہجے پر اچھنبا سا ہوا۔ لیپ ٹاپ سے نظر ہٹا کر کے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ لیکچر بنانے میں مصروف ہوگئی۔ وہ پھر بولی۔

''باجی! سنیں تو..... بہت ضروری بات ہے۔''

''ہاں ہاں..... میں سن رہی ہوں۔''

''نہیں، ایسے نہیں، پہلے اپنا کمپوٹر بند کرو۔'' اس نے آگے بڑھ کر میری نوٹ بک بند کردی۔

''ارے یہ کیا کیا، اتنی محنت سے لکھا ہوا سب مٹ گیا۔ میں نے کچھ محفوظ بھی نہیں کیا تھا۔''

''ارے باجی! اتنی دیر سے ایک بات کہنے کی کوشش کر رہی ہوں، اور آپ کتابیں اور کمپیوٹر میں لگی ہوئی ہو۔''

غصہ تو مجھے بہت آیا لیکن خون گھونٹ پی کر رہ گئی۔ وہ بے حد محنتی اور سلیقہ مند تھی۔ جب سے ہمارے گھر آئی تھی، آئینے کی طرح چمکا دیا تھا اس نے۔ ملنے والے میری تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ یہ سارا سگھڑاپا اسی کی بدولت تھا تو بھلا اسے کیسے کچھ کہتی۔

میں نے کتابیں ایک طرف رکھتے ہوئے بظاہر خوش دلی سے کہا۔

''ہاں ہاں، تم کو تنخواہ میں سے ایڈوانس چاہیے ہوگا۔ میں تمہاری اس عادت سے تنگ آ گئی ہوں۔ ابھی دو ہفتے پہلے ہی تو میں نے تمہیں دو سو روپے دیئے تھے۔''

''ارے باجی غصہ کیوں ہوتی ہو؟ چار سال سے تمہارے گھر کام کر رہی ہوں۔ آج مجھے کچھ لینا نہیں بلکہ دینا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شیشے کی طرح چمکتے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

''میں نے ہزار بار کہا ہے تم زمین پر نہ بیٹھا کرو، اس پر بیٹھو۔'' میں نے سامنے پڑی کرسی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا جیسے کسی اور کو اس بات میں شریک نہ کرنا چاہتی ہو۔

''وہ باجی بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی کو شادی کے بغیر بچہ ہوگیا۔''

یہ کہہ کر وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جیسے میرا ردعمل جاننا چاہتی ہو۔ میں تھوڑا سا چونکی لیکن کسی خاص ردعمل کے بغیر سادہ لہجے میں پوچھا۔

''اچھا پھر؟''

''باجی آپ کو یہ بات بری نہیں لگی؟ شادی کے بغیر کسی کو بچہ ہو جائے ہمارے گاؤں میں تو قتل ہو جاتے ہیں اس بات پر۔''

''اچھا تو میں کیا کروں؟ مجھے پتا ہے آئے دن ایسی خبریں اخبار میں آتی رہتی ہیں۔ میں تو انہیں پڑھتی تک نہیں۔ مجھے تو بڑی ٹینشن ہو جاتی ہے ان باتوں سے۔''

''باجی! وہ لڑکی میرے چچا کی بیٹی ہے اور جس کا بچہ ہے وہ میرا دیور جو پہلے ہی شادی شدہ ہے۔ لڑکی صرف سولہ سال کی ہے اور میرا دیور تیس سے بھی اوپر کا ہے۔''

''وہ تمہارا دیور ریاض؟ تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں اسے جانتی ہی نہیں۔ اس نے تو پچھلی گرمیوں میں ہمارے گھر رنگ سفیدی کا کام کیا تھا۔ وہ تو بڑا چور ہے۔ ہمارا کیمرہ بھی اس نے ہی چرایا تھا۔ نہ جانے کیا کیا کچھ چرا کر لے گیا تھا۔''

''ہاں باجی! ہے تو ایسا ہی لیکن کیا کریں، جوان ہے، غلطی کر بیٹھا۔ اب میرے شوہر پر یہ آفت آ پڑی ہے اندازہ تو تھا کہ کچھ دال میں کالا ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ گھر کی لڑکی سے ہی منہ کالا کر لے گا۔ اگر گاؤں والوں کو خبر ہوگئی تو وہ دونوں کو جان سے مار دیں گے۔ اس لئے میں نے اپنی ماں کے ذریعے ارم کو یہاں کراچی بلوا لیا ہے۔''

اب مجھے تجسس بڑھ رہا تھا۔ جلدی سے بولی۔

''تو کیا وہاں کسی کو خبر نہیں؟''

''نہیں! ہم نے آپ کے گھر کے سامنے والے ہسپتال میں نام لکھوایا ہوا تھا پہلے ہی سے۔ اب دو دن پہلے اسے یہاں لڑکا ہوا ہے۔''

''ارے تو کب سے یہ چکر چل رہا تھا پہلے کبھی یہ بات نہ بتائی اب کیا مشکل آ پڑی؟'' میں نے تھوڑا زور دے کر کہا۔

''باجی! میں تو اب بھی نہ بتاتی لیکن میرا شوہر اور دیور اس بچے کو مارنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں آپ کے تین بیٹیاں ہیں بیٹا کوئی نہیں۔ تو یہ بچہ تم گود لے لو۔ جانے اس معصوم پر مجھے کیوں بہت ترس آتا ہے کوئی ایسی صورت نکالو کہ وہ بچ جائے۔ میرے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ورنہ میں خود پال لیتی۔'' وہ میرے سامنے گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

میں سوچ میں پڑ گئی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں کیسے لے سکتی ہوں تمہیں تو معلوم ہے، کتنے سخت ہیں سارا کے ابّا – وہ ہرگز میری بات نہیں مانیں گے۔ وہ بھی ایسا بچہ جو گناہ کی پیداوار ہو۔ یہ بات خود مجھے بھی اچھی نہیں لگ رہی۔''

''باجی!'' اس نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔

''آپ تو بڑی بڑی باتیں کرتی تھیں۔ پھر آج یہ کیا ہو گیا؟''

''تو میں نے کیا غلط کہا؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟؟'' میں نے خجل ہو کر کہا۔

''اچھا پتا بتاؤ، میں دیکھنے جاؤں گی کل۔''

اتنے چھوٹے سے ہسپتال میں کمرہ تلاش کرنے میں ذرا مشکل نہیں ہوئی۔ کوریڈور ختم ہوتے ہی آخری کمرے میں سامنے بیڈ پر ایک نوعمر لڑکی، جس کا نام ارم فرض کر لیتے ہیں لیٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہت پیارا سا ننھا منا بچہ لیٹا تھا جسے وہ نرس کی مدد سے دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نرس اسے ہدایات دو کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی حسنہ جو پاس ہی کھڑی تھی، بچہ لڑکی سے تقریباً چھینتے ہوئے میری گود میں دے دیا۔

''اچھا! یہ تو بہت پیارا ہے۔ کیا نام رکھا ہے؟'' میں نے لڑکی سے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لگتا تھا گونگی ہے۔ اس کے بجائے حسنہ بولی۔

''باجی! آپ رکھ دیں کوئی پیارا سا نام۔ ابھی تو سب ننھا ہی کہہ رہے ہیں۔''

''اچھا سوچ کر بتاؤں گی۔ ابھی تو میں اس کے لئے سویٹر اور کمبل لے آئی ہوں جو میں نے چھوٹی بیٹی ایمان کے لئے بنائے تھے۔ سردی کافی ہے تم اسے یہ پہنا دو۔'' میں نے دیکھا بچہ ایک پرانی تولیہ میں لپٹا ہوا تھا اور بہت پرانا سا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ میں نے بیگ سے ایمان کا کمبل اور سویٹر نکالے جو مجھے بہت عزیز تھے۔ اس کی پیدائش سے پہلے میں نے خود اپنے ہاتوں سے بنا تھا اور ہر پھندے میں اپنی ہونے والی بیٹی کی محبت رچی ہوئی تھی۔ لڑکی نے لپک کر میرے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے لیں، اور بولی۔

''باجی! یہ مجھے دے دیں۔ میں خود پہناؤں گی۔''

''ارے تم کو کیا آتا ہے!'' حسنہ نے اسے ڈانٹا۔ لڑکی کم عمر ہونے کے باوجود کافی تیز لگ رہی تھی۔ ترشی سے بولی۔

''ہاں باجی حسنہ جیسے آپ کو پتا نہیں۔ میری امی تو کتنی پاگل سی ہے۔ سب چھوٹے بھائی میں نے ہی تو پالے ہیں۔ یہ تو پھر میرا بچہ ہے۔''

''بے شرم کہیں کی – ابھی بتاتی ہوں۔ کیسے دھڑلے سے کہہ رہی ہے میرا بچہ ہے۔'' حسنہ غصے سے بولی۔

میں خاموشی سے دونوں کی تکرار دیکھ رہی تھی۔ لڑکی بھی کافی جوش میں آ گئی تھی۔ بچے کو میرے ہاتھ سے لپک لیا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے ڈھانپنے لگی۔ حسنہ زور سے بولی۔

''تم کیا پاگل ہو گئی ہو۔ میں نے باجی سے بات کر لی ہے۔ وہ اسے گود لے لیں گی۔ پھر تم گاؤں

واپس لوٹ جاؤ گی۔''

''ارے ارے، مجھے بیچ میں نہ گھسیٹو۔ تم جو چاہے کرو میں۔ تو اس کے لئے یہ چیزیں اور دودھ کا سامان لائی تھی۔'' میں نے جان چھڑاتے ہوئے جلدی سے باقی چیزوں کا بیگ لڑکی کو تھماتے ہوئے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''یہ کیسی الجھن ہے؟ میں نے تھوڑی کچھ کیا ہے تو مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے۔'' خود کو تسلیاں دیتی گھر کو لوٹ آئی۔

کئی دن تک حسنہ کام پر نہیں آئی۔ مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ گھر میں کچھ چل رہا ہو گا لیکن مجھے کوفت کیوں ہو رہی ہے۔ یہ کوفت ایسی ہرگز نہیں تھی جو اکثر اس کے بے وقت چھٹیاں کر لینے سے گھر کے نظام درہم برہم ہو جانے سے ہوتی تھی۔ یہ تو کچھ عجیب ہی احساس تھا دل کو کچوکے دینے والا۔ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف میری دیورانی عالیہ تھی۔ وہ ڈاکٹر ہے اور اس کے پاس میری ہر مشکل کا حل موجود رہتا تھا۔ میں نے اسے یہ تازہ واقعہ سنایا اور اس سے مشورہ مانگا۔ اس نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں سوچے گی اور انشاءاللہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔ اس کی بات سن کر مطمئن سی ہو گئی تھی۔

اسی طرح چار دن گزر گئے۔ کالج سے واپسی پر بچوں کو اسکول سے پک کرتے ہوئے عالیہ کے گھر چلی گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور پھر باتوں کے دوران اس نے بتایا۔

''آپ تو میری دوست زیبا کو جانتی ہی ہیں اس کے بچے نہیں ہیں۔ جب اس سے ذکر کیا تو وہ فوراً ہی اصرار کرنے لگی کہ مجھے اس عورت سے ملوا دیں۔ میں یہ بچہ گود لے لوں گی۔''

اگلی صبح سویرے حسنہ کام پر آ گئی وہ خلاف توقع کافی خاموشی سے کچن میں سیدھے برتنوں سے بھرے سنک کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور آہستگی سے برتن دھونے لگی۔ مجھے اس کا رویہ کچھ بدلا ہوا لگا۔

''ارے حسنہ! آج کیا بات ہے۔ تمہیں اتنے سارے برتنوں کو دیکھ کر کوئی غصہ نہیں آ رہا؟'' اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے برتن دھونے میں لگی رہی۔

''تم سن نہیں رہیں، میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' ذرا زور دے کر میں نے اپنی دیورانی سے ہونے والی گفتگو اسے بتانے کا آغاز ہی کیا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''باجی! اب اس کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں کیا ہو؟'' میں ذرا ٹھٹک کر بولی۔

''وہ لڑکی بچہ خود سنبھالنے کی ضد پر اڑی ہوئی ہے کیا؟''

حسنہ آہستگی سے بولی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''کوئی تو بات ہے۔تم صاف صاف بتاؤ۔''میں نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔

حسنہ تھوڑا سا ہچکچائی پھر کہنے لگی۔

''وہ باجی! آپ نے تو کوئی جواب نہیں دیا۔ہمیں ہسپتال سے گھر جانا تھا اور بچے کو گھر نہیں لے جاسکتے تھے۔تو اسے ہم نے آپ کے دیئے ہوئے کپڑے پہنا کر ایک ٹوکری میں رکھ کر راستے میں ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے سیڑھیوں پر رکھ دیا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے دھکا سا لگا۔تمہیں معلوم بھی ہے؟ کیا غضب کیا تم نے؟؟ کوئی کتا بلی نہ کھا گیا ہو اس معصوم کو۔''

حسنہ تیزی سے بولی۔

''نہیں نہیں،اسے کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ہم نے ایسے ہی رکھا تھا۔کسی نے دروازہ کھول کر اسے اٹھا لیا ہوگا۔''

''ہم نے.....؟ کیا مطلب؟؟ تمہارے ساتھ تمہارا شوہر اور دیور بھی ہونگے۔بتاؤ کون کون تھا تمہارے ساتھ؟''

اس لڑکی کا تو مجھے ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ اس پر کیا گزری ہوگی یا اس قصے میں وہ بھی برابر کی شریک تھی کہ نہیں۔

حیرت اور صدمے سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔اپنی زندگی میں پہلے کبھی اس طرح کی سچوشن سے واسطہ نہیں پڑا تھا سمجھ نہیں آ رہا تھا کیسے بات کروں۔

میں نے اسے ڈرانے کی کوشش کی

''یہ تو پولیس کیس بن گیا۔اب میں تم لوگوں کی رپورٹ ضرور کروں گی۔''

وہ جو بڑی مطمئن سی نظر آ رہی تھی،ایکدم گڑبڑا گئی اور میرے پاؤں پکڑ کر بولی۔

''باجی ایسا غضب نہ کرنا،ہم بہت مجبور تھے۔''وہ رونے اور گڑگڑانے لگی۔

پھر یکا یک اٹھی اپنا کپڑے کا تھیلا اٹھایا اور بجلی کی سی تیزی سے گھر سے باہر بھاگتی چلی گئی.....

میں سدا کی بزدل، ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا مجھے۔اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے آگے بڑھ کر تیزی سے پکڑ لیتی۔میرے اعصاب سن سے ہو کر رہ گئے تھے۔

◀◀ ● ▶▶

147- Whitney Street,
Blockhouse Bay,
post code 0600
Auckland،NewZealand

.916_65494097
not found.

● طلعت زہرا

بوڑھا اور سمندر

ہیمنگ وے کے 'بوڑھا اور سمندر' کا لڑکا جال اٹھائے سمندر کی جانب جا رہا تھا۔لڑکے کو اس کے خواب ہر لہر کے ساتھ اپنی جانب رواں دکھائی دیتے۔جذبوں میں بہتی اس کی رفتار، بوڑھے کو پیچھے چھوڑے جاتی۔ساحل سے سمندر کا یہ رستہ اسے ہمیشہ سے ہی پسند تھا۔اس نے اپنی زندگی کی تمام حاصل ولا حاصل امنگیں یہیں جوان ہوتے دیکھیں۔اسے بڑی مچھلی پکڑنے کا بہت شوق تھا وہ اپنے ساتھی مچھیروں کو عمیق نگاہوں سے دیکھتا اور سمندر میں جال ڈالنے کے گر سیکھتا۔اچانک اس کا پاؤں کسی سخت چیز پر پڑا تو اس نے جھک کر اس چیز کا معائنہ کیا۔'مگر مچھ؟'اس کے منہ سے نکلا۔یہ ایک مگر مچھ کا ڈھانچہ تھا جو نجانے کتنی روحوں کو جسموں سے آزاد کروانے کے بعد آج اپنا جسم یہاں چھوڑ گیا تھا۔لڑکے نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ماں قسم،تو پہلے میرے ہاتھ لگ گیا ہوتا تو تجھ سے لڑنے میں بڑا مزہ آتا۔آج تیرے جبڑے کو ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہ رہا،اگر تو زندہ ہوتا تو تیرا جبڑا توڑ دیتا۔''یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور اگلے ہی لمحے سمندر کا لڑکا طوفانی لہروں میں ڈبکیاں لینے لگا۔'شڑاپ' جیسے لوہا تنور سے نکال کر ٹھنڈے پانی میں ڈال دیا جائے۔اسکے جسم سے خوابوں کا دھواں نکلا اور ہوا میں جذب ہو گیا۔اس بے کنار سیپ میں نہاتے ہوئے اسے اپنے موتی بننے کا انتظار تھا۔یہ سوچتے ہوئے اس نے بے کنار سیپ میں اپنا جال پھینکا کہ شاید قسمت یاوری کرے اور کوئی گوہر ہاتھ لگ جائے۔اسے یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اتنی بڑی مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہو جائے گا جو آج تک کسی نے نہ پکڑی ہو۔جال پانی سے باہر نکالا تو اسے بہت مایوسی ہوئی کہ آج اس کے جال میں چھوٹی چھوٹی آٹھ دس مچھلیاں ہی آئی تھیں۔اس نے ایک دو بار یہ عمل دہرایا اور واپس اپنی بستی کی جانب چل پڑا۔

اس بے کنار سیپ سے کچھ ہی فاصلے پر چند جھونپڑیوں کا اجتماع یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ سب کسی جلسے میں کھڑی ہوں۔جگہ جگہ تپتی راکھ کی ڈھیریاں اور ان کے نزدیک ہی تازہ تازہ کھدی زمین میں کانٹوں کی بہتات زندگی کا ثبوت تھا۔یہاں رہنے والوں کے لمبے اور سیاہ بال، چمکدار کھال اور شفاف آنکھیں آبی جانداروں کی دین تھیں۔جھونپڑیوں کے جھنڈ سے گزرتے ہوئے اسے کبھی مچھلیوں کی بو کا احساس نہ ہوتا جو یہاں کی فضا میں رچ بس گئی تھی۔راستے میں اسے عادل ملا،اس نے پوچھا،

''کیا تو آج شہر جا رہا ہے؟'' لڑکے نے چلتے چلتے ہی جواب دیا۔

''میں اپنا مال راجو کو دوں گا وہی شہر جا رہا ہے، میں تو آج آرام کروں گا۔''

ابھی تک اس کی آنکھوں میں مرے ہوئے مگرمچھ کے جبڑے کا منظر تھا جس سے اس کا دل بہت بوجھل ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ مگرمچھ زندہ ہو گیا ہے اور وہ اس کشتی نما پر سوار سمندر کی طوفانی لہروں سے کھیلتا دور کسی جزیرے پر جا پہنچا ہے جہاں وہ دونوں دیومالائی طاقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ 'کیا اس کی زندگی کا سیپ بھی بنا موتی کے ہی کسی ریت میں دھنسا رہ جائے گا' یہ بات اس کے لئے فکر کا باعث تھی۔ وہ اپنی لمبی پلکیں جھکائے بغیر ہی کتنی دیر تک کھلی آنکھوں بیٹھا رہا۔ اسے ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔

صبح ہوئی تو جسم ہلکی ہلکی تمازت کے مزے لینے لگا۔ وہ ریت پر ہی لیٹ گیا۔ اس نے ریت کو سہلاتے ہوئے آسمان کی جانب دیکھا اور سوچا اگر میں ایسے ہی آسمان پر لیٹا ہوں تو مجھے سمندر آسمان کی طرح دکھائی دے گا۔ 'آسمان کی مچھلیاں اور سمندر کے پرندے' یہ سب نام ہمارے ہی تو دیئے ہوئے ہیں۔ ان دو اوندھے تھالوں کے درمیان زندگی۔ 'کیا یہی سب کچھ ہے یا کچھ اور بھی؟' وہ انہی خوابوں میں گم تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک ہلال کی کشتی میں سوار ہے اور ستارے جگمگا رہے ہیں۔ ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ اچانک اسے انجن کے چلنے کی آواز نے جگا دیا۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ اردگرد ستاروں کے صدف دھندلا چکے تھے اور پانی پر روشنی کے جگنو جھلملا رہے تھے۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے اپنے قریبی ہمسفر ملاحوں پر نگاہ کی جو اس کو بے ہوش کر کے ادھر لے آئے تھے۔ اس کے خوابوں کا ستارہ ٹوٹ کے ایک لکیر بن گیا جس کا اسے انتہائی افسوس ہوا۔ اسے آسمانی دنیا میں رہنا مختلف لگا تھا، جہاں اسے روز مچھلیاں بیچ کر اپنی ہمکتی بھوک کو بہلانا نہیں پڑتا تھا۔ اس کی داہنی آنکھ سے ایک اشک ڈھلک کر کنارے پر اٹک گیا۔ یک لحظہ مردہ مگرمچھ کی آنکھ کا موتی اس کے خیال میں آیا اور کہیں غائب ہو گیا۔ اس نے شہادت کی انگلی گرتے آنسو کے نیچے رکھی اور اسے گرنے سے بچا لیا۔ 'یہ موتی نمکین کیوں ہوتے ہیں؟ سمندری نمک' اس نے یاد کیا کہ صبح تو وہ ریت پہ ستا رہا تھا اور اب آنکھ کھلی تو کشتی میں۔ اسے لگا کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔ سمندر کے شیشے پر نور کی چمک، ستاروں کی دمک اور لہروں کے ساتھ ہچکولے کھاتی اس کی زندگی۔ وہ کشتی میں دم سادھے دھارا کی اور بہنے لگا۔ ملاح اس سے سارا دن بیگار لیتے، کوئلوں کی دھونکنی میں وہ روز بہ روز بدرنگا ہونے لگا۔ ہاتھ جو پھسلتی مچھلیوں کی نرماہٹ کے عادی تھے کھردرے بیلچوں سے شرم کھانے لگے۔ جوان چھریرا بدن، جس پر بازو کی مچھلیاں بات بے بات باہر نکلنے کو بے چین رہتی تھیں، جن کی کانٹ چھانٹ میں لہروں کی مستی اور بھنور سے کشتی نے حصہ لیا تھا، اب ان کی نمود میں آگ کی تپش اور شعلوں کی لپک اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔

جہاز کئی روز بعد ایک جزیرے پر رکا تو اسے اپنا خواب یاد آیا۔ جس مگرمچھ پر سوار ہو کر وہ یہاں

پہنچا تھا اسے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اس کے جبڑوں کا خلال کرنا تھا۔ وہ سارا دن بحری جہاز کی بھٹی کو ایندھن مہیا کرنے کے بعد بچی کچھی روٹی سے اپنے پیٹ کا ایندھن بھرتا۔ وہ اس پرندے کی طرح آزاد نہیں تھا جو اپنی مرضی سے مگرمچھ کے کھلے جبڑے میں جا کر اسکے دانتوں میں پھنسی مچھلیاں نکال لیتا ہے۔ لیکن وہ ایسی چھوٹی مچھلی ضرور تھا جو بڑی مچھلی کے ہاتھ آ گئی تھی۔

یہ جزیرہ خوشنما ہی نہیں خوشحال بھی تھا۔ جہازراں اس جزیرے سے قیمتی جواہر تلاش کرتے، کٹائی صفائی کے بعد انہیں شہر لے جا کر بیچ دیتے۔ کم خرچ اور زیادہ منافع کی خاطر وہ مختلف ساحلوں سے پندرہ سے بیس سال کے بچوں کو اغوا کرتے اور ان سے جزیرے پر مزدوری کرواتے۔ جونہی جہاز ساحل پہ لنگر انداز ہوتا تو پہلے سے طے شدہ اصول کے تحت سب کو یہ بتا دیا جاتا کہ کسی بھی بچے کے بھاگنے کی صورت میں وہ اس کو واپس اس کے گھر نہیں پہنچائیں گے۔ یہ بات تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ مزدوری کروانے کے بعد کبھی بھی بچوں کو ان کے گھر نہیں پہنچاتے۔ بچے اس جہان کا قدیم نسخہ نہ جان سکتے تھے۔ آدھی روٹی زیادہ۔ اور ان میں جو چاہے پھوٹ ڈال دے۔ بچوں کو ہی ایک دوسرے پر نظر رکھنے کا کہہ دیا جاتا، بدلے میں ایک چھوٹا سا نام کا عہدہ۔ جیسے ہی بچے اس جزیرے پہ اترتے، کائنات کے ایک پرسکون گوشے میں ہلچل مچ جاتی، شور اور صدائیں۔ یہاں کوئی بھی مگرمچھ کی طرح بے سدھ، بے جان پڑا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ سب اپنے اپنے جسموں سے روح کے آزاد ہونے سے ڈرتے تھے، جبکہ سمندری لڑکا ہر حال میں جینا جانتا تھا۔ وہ اجنبی زمین پر اتنا خوش تو نہ تھا لیکن ریتلے ساحل نے اس کی یادیں تازہ کر دیں۔ اس نے اپنی مٹی کی آگ کو پانی سے بجھایا اور ہوا سے پانی خشک کیا۔ کھانے کے بعد وہ مشین کو چکر دینے لگا، ڈھیلوں سے مٹی اڑی اور ڈبے کے اندر قیمتی جواہر جگمگانے لگے۔ مٹی اڑا اڑا کر سوراخوں والی پلیٹ سے ہوتی ہوئی ہوا میں گھل مل گئی۔ چکر دیتے دیتے اسے جواہر کی چمک میں اپنا عکس نظر آیا۔

''کیا مجھے صرف ہوا کی ضرورت ہے؟ کیا میں بھی.....''

''ہاتھ زور زور سے چلاؤ، کام آج ہی ختم کرنا ہے۔'' اس گونجدار آواز نے اسے ہواؤں سے زمین پر لا پٹخا۔ اس نے جلدی جلدی اپنا کام مکمل کیا، اور ساحل پہ پڑے ایک دیمک زدہ تنے پہ جا بیٹھا۔ اس کی نظر ایک ننھی سی مچھلی پر رک گئی جو وقفے وقفے سے اپنا منہ پانی سے باہر نکالتی اور پھر پانی میں گم ہو جاتی، وہ کافی دیر اس مچھلی کے نکلنے اور چھپنے کے کھیل سے محظوظ ہوتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ آج انہیں جزیرے پہ گھومنے پھرنے کی آزادی ہے اور بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔ جہازراں کس لئے آئے ہیں یہ تو کوئی نہ جانتا تھا البتہ آج ان کا کوئی خاص دن تھا۔ یوں اسے پہلی بار اس جزیرے کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ جزیرے کی خوبصورتی میں کھو سا گیا۔ بل کھاتا رستہ جب ایک نئی وادی کے دہانے پر جا پہنچا تو اس کے گمان سے زیادہ حسین مناظر نے اس کو خوش آمدید کہا۔ مناظر کی گونج اسے سنائی دی۔

''تم کہاں تھے آج تک؟''

لڑکے نے اپنی جھونپڑیوں سے علاوہ کبھی ایسے گھر نہیں دیکھے تھے۔ان مناظر نے بھی کبھی ایسا سمندروں کا پالا نہیں دیکھا تھا۔سورج کی کرنوں سے گھروں کی چھتیں ایسے روشن ہو رہی تھیں جیسے کوہِ ہمالیہ کی چوٹیاں سردیوں کی دھوپ سے چمک اٹھتی ہیں۔انہی کے درمیان اسے ایک جھیل کے مانند گھر دکھائی دیا، قریب پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ یہ تو چھوٹی سی کٹیا ہے۔

گرم چائے کا مطالبہ کرتی شام کی آمد پر اس نے اپنے گرد کمبل لپیٹتے ہوئے سوچا،'اِس گرم چائے کا ذائقہ زندگی گزارنے کے لئے کافی ہے۔انہی سوچوں میں گم وہ واپس جہاز کی طرف آیا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ جہاز ران اس کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔اس نے ساحل کو ایسے ٹھوکر ماری جیسے وہ ریت میں گڑے اپنے ڈھانچے سے خوف زدہ ہو۔

''مگر مچھ کو بھی شاید ایسا ہی کوئی دھوکا مار گیا ہوگا،مگر میں.....مگر.....مگر.....مگر مچھ.....؟''اس کے منہ سے نکلا۔دو قدم کے فاصلے پر ہی ایک پندرہ سولہ فٹ لمبا مگر مچھ اپنا جبڑا کھولے کھڑا تھا۔نظر جہاں تھی وہاں ہی ٹک گئی۔یہ نظارہ سمندری لڑکے کے من کو ایسا بھایا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں ایک نیا جہان آباد کرے گا۔اس کا اپنا آباد کردہ جہان، چاند بستی۔

سست رفتار بوڑھے نے اپنی زندگی کے چالیس سال اس ریت سے پاؤں رگڑتے گزارے تھے۔عمر کے اس آخری حصے میں اس کے ماتھے کی لہریں جامد و ساکن کسی طوفان کی آمد کا اعلانیہ لگتیں۔اس کی غلافی آنکھیں دور تک دیکھنے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں لیکن وہ اب بھی ساحل پہ کھڑے حدِ نگاہ تک پھیلے آئنے میں اپنا عکس دیکھ لیا کرتا۔

اس بوڑھے نے جال سمندر میں پھینک کر نکالا اور چند مچھلیاں اپنے پالتو مگر مچھوں کے منہ میں ڈالیں۔جال ایک جانب رکھا اور سوچنے لگا۔

''اگر میرا پاؤں بچپن میں مگر مچھ کے ڈھانچے پر نہ پڑا ہوتا تو.....''

◀◀ ● ▶▶

1259 SHADELAND DRIVE
MISSISSAUGA, ONTARIO
L5C 1P7, CANADA

کل ماتم بے قیمت ہوگا آج ان کی توقیر کرو
دیکھو خون جگر سے کیا کیا لکھتے ہیں افسانے لوگ

عبیداللہ علیم

● ڈاکٹر زین سالک

موت کا دوسرا رقص

مقابلے کے آخری سانڈ کا سر جھکا ہوا تھا کیونکہ اُس کی کوہان اور گردن کے عضلات میں تین bondilla نیزے گھپے ہوئے تھے۔لیکن اس چار سالہ عظیم الجثہ ساڑھے چھ سو کلو وزنی سانڈ کا طیش اسکی پھنکاریں مارتے نتھنوں اور دھول اڑاتے کھروں سے کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔اور وہ انسانی موت کے متلاشی پاتال کے کسی عفریت کی طرح اپنے نوکیلے خمیدہ سینگوں کو انسانی جسم و گوشت میں پیوست کرنے کی ٹوہ میں تھا۔وہ اپنی جنم جنم کی پیاس بجھانے اور وحشی جانور اور انسان کے مقابلے کا یہ موت کا رقص میرے ساتھ Linares کے اِس بُل رنگ میں کرنے پر مجبور تھا۔میں Islero کو انچوں کے فاصلے سے اپنے سرخ دوشالے سے بار بار غچہ دے رہا تھا۔مجھے کسی خاص اسٹائل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسکی آنکھوں کے عین درمیان سر کے نرم گوشے میں خصوصی مہارت کے ساتھ وقت سے کھیلتے ہوئے اپنے نیزے کو گھونپنا تھا۔

میں نے فخریہ اپنے 'روشنیوں کے سوٹ' پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جو مجھے حالیہ تفویض کیا گیا تھا۔بلاشبہ اس بھڑکیلے شاندار لباس میں پھرتی سے نقل و حرکت کی بہت گنجائش تھی۔اس سے پہلے میرا اندلسی سواروں کا سا لباس تھا جو کہ کالے رنگ کے چھوٹے ویسٹ کوٹ، تنگ ٹراؤزر، اونچی ایڑی کے جوتے اور چوڑے کالے ہیٹ پر مشتمل تھا۔اس سے پہلے بطور نوآموز میں novillero بُل فائیٹر اس 'سوٹ آف لائیٹ' کا حقدار نہیں تھا۔یہ چمکدار زرق برق لباس جسم سے چپکا ہوتا ہے۔میرے اکھاڑے کا لباس مختلف تھا۔میں نے ملک کے مشہور ترین seville رائیل سکول آف بُل فائیٹنگ سے پیینی طرز کی بُل فائیٹنگ corrido de toros کی ٹریننگ لی تھی۔کل تک میں novillado میں لڑتا تھا اور آج corrido کے دائیراتی مدّور اکھاڑے میں کھڑا تھا.....یہ میری اب تک کی زندگی کا نقطہء عروج تھا۔یہ مقابلہ روایتی طور پر ٹھیک 5 بجے شام اعلانیہ ٹرمپٹ کی آواز سے شروع ہوا تھا۔کہتے ہیں کہ اسپین میں ٹرین اور بس تو لیٹ ہو سکتی ہے لیکن بُل فائیٹ لیٹ نہیں ہوتی۔آج میرے پیشہ وارانہ آلات حرب مختلف تھے۔میری مخصوص چھبیلی ٹوپی اب چھوٹی اور دو کونی تھی۔میرے آرام دہ جوتے بھی مختلف تھے آج میری جرابیں بھی گلابی تھیں۔میرے آرام دہ مختلف جوتے لی جنڈری بُل فائیٹر Manolette کے ایجاد کردہ تھے۔اور میں اسپینی نقطہء نظر سے بُل فائیٹنگ کے آرٹ کا ایک طاق و مشاق جنگجو تھا۔اور اس بُل فائیٹر کی محافظ 'زن'

کی قوت تھی۔

جب میرے اندر موجود موت کے کھلاڑی نے سانڈ کو نیچہ دے دے کر اسکی انتہائی اشتعال انگیزی کو پاگل پن تک پہنچا اور گذار دیا تو اُسنے اپنے آخری وقت کو گویا دیکھ لیا تھا۔ اور بے مہری سے اپنا زخمی جسم و چہرہ خود سے میرے نیزے کی جانب موڑ دیا تھا۔ اسکی گردن میں جوں ہی میں نے اچھل کر کمال مہارت سے ایک اور نیزہ گھونپا تو ہسپانوی عوام بآواز بلند! ole,ole چلاّ رہے تھے۔

وہ اُسے 'سچ کا لمحہ' کہہ رہے تھے۔ سانڈ کی لڑائی کا نقطہء عروج آ پہنچا تھا۔ میں نے آخری مرتبہ تماشائیوں کی طرف انکا عندیہ معلوم کرنے کیلئے اس آخری وار کی اجازت چاہی۔ انکے جوش وخروش سے اسکی چنداں ضرورت نہ تھی۔ میرا میٹاڈور کا منصب جسے یونین نے تسلیم کرلیا تھا۔۔

ہی Islero کی موت کے گھاٹ اتارنے کے اس اختتامی لمحہ کا متقاضی تھا۔ مجھے اپنا کام نمٹانے کیلئے دی گئی آخری چھ منٹ کی مہلت بھی ختم ہونے والی تھی۔ اور اس حتمی ایکٹ کا اعلانیہ ٹرمپٹ بھی بجایا جاچُکا تھا۔ پس منظر میں اس ڈراؤنے خواب کو جِلا دینے کیلئے موسیقی پہلے سے جاری تھی۔ لیکن میری آنکھیں آخری مرتبہ Lope کے رومال کے اشارے کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ میرے کیریئر کے پہلے سانڈ کی ہلاکت Kill تھی اور اس موقع پر اسکا نہ ہونا میری سمجھ و برداشت سے باہر تھا۔ ایک میٹاڈور کی محبوبہ اگر اکھاڑے میں خود اپنے یار کے اس کارہائے نمایاں کی تماش بینی نہ کرے تو تُف ہے ایسے میٹاڈُور پر اور اسکی میٹاڈوری پر۔

مجھے اچانک Islero کی گرم سانس اپنے چہرے کے قریب، بہت ہی قریب محسوس ہوئی اور پھر جیسے گرم گرم bonderillo نیزہ میری تھوڑی کے نیچے سے گھُس کر گوشت پوست کو چیرتا ہوا منہ سے نکلتا محسوس ہوا۔ مجھے اسکا خمیدہ کالا رنگ نیموا آنکھوں نظر آیا۔ Islero نے میرے چہرے کو پُرکر اپنے نوکیلے سینگ سے میرے جسم کو زمین سے اوپر اٹھا لیا تھا۔ وہ مجھے گھسیٹتا لے جارہا تھا اور میں کسی بے بس سوٹ کے چیتھڑوں سے بنے گڈّے کی طرح گھسٹ رہا تھا۔ میرے پاؤں بھی اسنے پچھلے کھروں سے رگید دیئے تھے۔ جن میں میرا لال دوشالہ بھی الجھ گیا تھا۔ میرا نیزہ میری زندگی کی علامت میرا آلہء حرب میرے ہاتھ میں بے جان سا لٹک رہا تھا۔ مجھے اپنے تینوں پیادے مددگار سرخ کپڑے اور نیزے تھامے سانڈ اور اپنی طرف دوڑتے نظر آئے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ مگر میں محسوس کرسکتا تھا میرے آخری الفاظ جو ساتھیوں نے سُنائے وہ یہ تھے۔ 'کیا میری آنکھیں کُھلی ہیں، میں دیکھ نہیں سکتا'.....!

تمام تماشائی Matolo Hombre چلاّ رہے تھے۔ اور اپنی سیٹوں پر کھڑے ہوگئے تھے۔ مجھے اسٹیڈیم میں موجود مرہم پٹی کی جگہ enfirmeria لے جایا گیا تھا جس کا کتبہ واضح طور پر ایک گیٹ پر ٹنگا تھا۔

شاید یہ میری 'زن' کی قوت ہی تھی جس نے مجھے اسکے بعد نہ صرف زندہ رکھا بلکہ میرے دل میں

corrida جلد از جلد واپسی کے شعلے بلند رکھے۔ ہم اسپینی بھی خوب قوم ہیں۔ کم از کم بُل فائیٹنگ اور رسوم و تہوار منانے کی حد تک۔ چاہے پمپلونہ میں بیلوں اور انسانوں کے ساتھ ساتھ دوڑ ہو جس میں اب تک حصہ لینے والے سینکڑوں نوجوان کُچلے روندے جاچُکے ہیں۔ اور چاہے جنوبی اسپین خصوصاً اندلوشیہ کی روایتی Flamenco موسیقی کی روایات اور چاہے اگست کے آخری بدھوار کو La Tomatina پکے ہوئے ٹماٹر ایک دوسرے پر پھینکنے کی سب سے بڑی جنگ یا پاؤں تلے انہیں کچلنے کا کھیل۔۔۔ یہ تمام ہماری جنگجو یانہ اخلاقیات کے ساتھ گڈمڈ ہیں۔

انہیں ہم اپنی ثقافت کے نمائندوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ پُروکر رکھتے ہیں۔ اور اپنا اپنا جائیز مقام دیتے ہیں۔ دوسری دینا کے لوگوں کے لئے اس امر کو سمجھنا اور اس پر یقین کرنا دشوار ہے۔ انکے بقول اسپین میں آج اس خونی کھیل کا ظالمانہ مظاہرہ پھل پھول رہا ہے۔ اگر اسپین میں بُل فائیٹنگ کو وحشیانہ عمل سمجھا جاتا تو گذشتہ چھ سو سال میں اس پر کب کی پابندی لگ چکی ہوتی۔

میں مانتا ہوں کہ غیر اسپینوں کے لئے یہ سمجھنا بھی خاصا مشکل ہے کہ لوگوں کے ہجوم پیسہ دے کر ایک تہوار کے طور ایک تنہا جانور کو ٹکڑے ہوتے خوشی سے دیکھیں گے۔ جس نے کبھی ان کو کوئی زک نہیں پہنچائی۔

آج میں سوچتا ہوں کہ مجھے اس حادثے سے سب سے بڑا فائدہ کیا ہوا تو مجھے ہمینگوے کے ناول 'دوپہر کی موت' کا مطالعہ ان دنوں سرفہرست نظر آتا ہے۔ مصنف نے کتنی سچائی سے کہا ہے کہ 'مورل' وہ ہوتی ہے جو ہمیں بھلی لگے اور 'امّورل' وہ جو ہمیں بڑی بُری لگے۔

شاید Lope Sino مجھے اسکا احساس دلانے کیلئے ہی یہاں نہیں آئی۔ لیکن میرے نزدیک یہ رویہ بطور ہسپانوی حسینہ کے کچھ جچا نہیں۔ یا پھر میں یہ کہوں کہ یہ میری قسمت کا ایک حصہ تھا۔

زندگی اپنے گرد کتنا نچاتی ہے۔ دونوں فریق موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی زندگی کا سچ ڈھونڈتے ہیں۔ انسان اور سانڈ میں یہ فرق ہے کہ سانڈ کو اپنی موت کے سچ کا اندازہ جلدی ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان اسے بھولا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے جیتنا ہوتا ہے۔ ایک یقین کے ساتھ۔ حیوان کی موت پر اپنا استبداد برقرار رکھنا ہوتا ہے اپنے اشرف المخلوقات کے منصب کی پاسداری میں۔ لیکن جب وہ خود سچائی کے لمحے کی لپیٹ میں آتا ہے تو یہ ایک حادثہ ہوتا ہے۔ اور میں اس لمحے کی لپیٹ میں پہلی بار آیا تھا۔ آخری بار نہیں۔ اب یہ میرے ستاروں پر منحصر تھا کہ میں دوبارہ اس کی لپیٹ میں آکر اس ابدی سچ میں ڈوب جاؤں یا کامیاب ابھروں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا ہی جب شیوہ ٹھہرا تو.....لیکن میں اس حقیقت سے سراسر انکار نہیں کرسکتا کہ آخر کار انسان کتنا کمزور و بے بس ہے۔ بس میٹاڈور کی شان و شوکت کا ہالہ اسے اپنے حصار میں لئے رکھتا ہے۔ اور میں بھی اس حادثے کے بعد پھر سے اکھاڑے میں اُتر آیا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو کبھی۔۔۔ عوام کے ذہنوں میں بُل فائیٹر اور بُل فائیٹنگ کی تصور شاندار سی ہوتی ہے۔ اور وہ اُسے بہادر

میٹا دور کے مقابلے کے طور پر مزّین کرتے ہیں۔ جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اور اپنے ہاتھوں پیروں پر بہت کچھ داؤ پر لگا کر ایک پاگل خونخوار وحشی حیوان سے نمٹتا ہے۔

Islero یہ مقابلہ مجھ سے جیت چُکا تھا۔ اپنے زخموں کے مندمل ہونے پر اسے مزے سے صرف نسل کشی کے لئے ہی استعمال ہونا تھا۔ اب اسکی زندگی میں کوئی اور انسانی matador کا مقابلہ نہ تھا۔ کوئی اور نیزہ اسکی گردن کے عضلات میں پیوستہ نہیں ہونا تھا۔ اُس کے بھیجے کے نرم گوشوں میں کسی اور تلوار کو نہیں گھسنا تھا۔ اسکا دل بھی آخری تلوار کے رحمدلانہ وار سے محروم تھا۔ وہ خوش نصیب سانڈ موت کو شکست دے آیا تھا۔ اسکے کان کٹنے سے بچ گئے تھے۔ اور اسکی دُم بھی۔ اسے بلّیوں اور زنجیر کی ٹکٹکی میں باندھ کر خچروں کے ذریعے اکھاڑے میں تماشائیوں کے سامنے گھسیٹا نہیں جا سکا تھا۔

اور اسکا سینگوں سمیت چہرہ بھی ٹرافی بننے سے رہ گیا تھا۔ جسے میرے گھر کے استقبالی ہال کی زینت بننا تھا۔ لیکن یہ آزادی اُسنے بہت بھاری قیمت دے کر حاصل کی تھی۔ تماش بینوں کو بظاہر ہٹا کٹا دِکھنے والا یہ سانڈ کمزور، نیم اندھا، جسمانی اور نفسیاتی طور پر ایک تباہ حال بیل تھا۔ اسے مقابلے سے پہلے ایذا رسانی کرنے والوں نے اپنے تئیں اسے کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔

اسکی زندگی کے چانسز صفر تھے۔ مجھے روڑ ریگس نے بتایا تھا کہ Islero کے کانوں میں گیلے اخبار ٹھونسے گئے تھے۔ اسکی بینائی کو دھندلانے کے لئے اسکی آنکھوں پر دبیز ویزلین کہ تہہ لگائی گئی تھی۔ اسکے نتھنوں میں روئی ٹھونسی گئی تھی تا کہ وہ مقابلے کے وقت سنبھل کر پوری طرح سانس نہ لے سکے۔ اسکے اعضائے تناسل میں سوئیاں چھُبو دی گئی تھیں۔ اسکے اگلے پچھلے پیروں پر تیزابی مادّے کی مالش کی گئی تھی تا کہ وہ صحیح طرح اپنے چوپایوں پر جم کر کھڑا نہ ہو سکے لڑکھڑائے لیکن ساتھ ہی تھک ہار کر اکھاڑے میں لیٹنے سے بھی باز رہے۔ اسے مخدّرات پلائی گئی تھیں تا کہ وہ سست رو اور مسکن رہے۔ اسے دست آور ادویہ بھی وافر مقدار میں دی گئی تھیں تا کہ اسے مزید بیکار کر دیا جائے۔ اسے چند دنوں پہلے سے ایک اندھیرے بکس میں رکھا جا رہا تھا۔ اکھاڑے کا سامنا کرنے سے پہلے اسکا مقصد اسے زمان و مکان کا شعور چھیننا تھا۔ جب اسے ڈبے سے باہر نکالا گیا تو اسنے ناچارگی میں اندھیری سرنگ کے سرے پر روشنی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ یہاں جب اس نے سوچا کہ آخر کار اسکی قید و بند کی صعوبت کا خاتمہ ہونے جا رہا ہے اور اسے آزادی مل رہی ہے تو اسے بُل رنگ کی طرف دھکیل دیا گیا اور وہ اپنے قاتلوں اور چیخنے چلاتے آوازوں والے ہجوم کے سامنے پہنچ گیا۔ اور یہ سب پہلی دفعہ اسکے بقول صرف Islero کے ساتھ ہی نہیں کیا جا رہا تھا۔

میں اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے اس سلوک سے قطعاً خوش نہ تھا۔ اگر مدّ مقابل فریق کو غیر اخلاقی طور پر کمزور کر دیا جائے تو نہ تو یہ مردانگی رہتی ہے اور نہ آزادانہ و منصفانہ مقابلہ..... اسمیں آیا ہوا سچ کا لمحہ سچا تو نہ ہوا۔ میں نے آئندہ کے مقابلوں میں اس بات کا خاص خیال رکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اور

نئے سرے سے اپنی تیاریاں شروع کر دی۔ مجھ پر ایک اور بہت بڑا دباؤ بھی آ گیا تھا۔ میرے علاقے کیٹا لونیہ نے مین لینڈ اسپین سے سبقت لیجانے اور کچھ مختلف اور مخالف کرنے کیلئے انسان اور سانڈ کی لڑائی ہمیشہ کیلئے بند کرانے کا سیاسی فیصلہ کر لیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اتوار کے دن ہونے والے اس آخری مقابلہ کا جسکے بعد انسان اور سانڈ کی لڑائی پر مکمل پابندی کا اطلاق ہونا تھا، میٹا ڈور بنوں۔ شاید میں پوری طرح صحت مند نہیں ہوا تھا۔ Lope نے اپنے گذشتہ روّیے پر معذرت کی تھی اور اپنی چاہت کا بھرپور اظہار کیا تھا۔ مقابلے سے کچھ روز پہلے کے عرصے میں ہم تھیٹر، پکنک وغیرہ گئے تھے اسے میری صحت کی بحر حال تشویش تھی۔۔۔ لیکن میں کسی بھی صورت میں یہ مقابلہ جیتنا چاہتا تھا۔ اور میں اپنے پیشرو مینوئیل سانچے عرف مینالوٹے کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسکے انداز میں اس مقابلے کا اچھا شو پیش کرنا چاہتا اور اسکے ہم پلّہ خطاب Maestro کے حصول کا دل و جان سے متمنی تھا۔ مجھے اسپینی ہونے کے ناطے اس ہیرو سے والہانہ عشق تھا کیونکہ وہ تکنیکی طور سے بالکل پرفیکٹ تھا۔ میں اسکے آبائی گھر کے مقبرے اور عجائب گھر بار بار جا چکا تھا۔ جہاں اسکی تصاویر، ملبوسات، مقبرے کا ماڈل اور اس بیل کا سر جسنے اُسے مارا تھا محفوظ تھے۔ میں نجانے کیوں اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں اس سے مماثلت تلاش کر رہا تھا۔ یہ کوئی اتنی عجیب بات تو نہیں تھی۔ وہ ایک لجنڈ تھا اور اسکے پیروکار میری طرح لاتعداد ہوں گے۔ مجھے صرف اسکی موت کے واقعہ کے علاوہ اسکے ہر پہلو سے عقیدت اور محبت تھی۔ لیکن اس واقعہ میں ایک رومان بحر حال تھا۔ میں نے اپنی صحتیابی کے انتظار میں دوبارہ پریکٹس نہیں کی تھی۔ میں اپنی تمام توانائیاں اپنے اس آخری مقابلے میں جھونکنا چاہتا تھا۔ اور آخر اتوار 2010 کا وہ دن آ گیا جب میری قسمت کا حتمی فیصلہ ہونا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج Lope ضرور نہ صرف میری ہمت بڑھانے آئے گی بلکہ انسان اور سانڈ کے مقابلے کا آخری تاریخی دن منانے بھی ضرور آئے گی بطور سچی ہسپانوی کی حیثیت سے لیکن اسکے پچھلے روّیے کو دیکھتے ہوئے غصہ میں نجانے کیوں میں نے پہلے سے اپنے احباب سے کہہ دیا تھا کہ اگر Lope اس بار بھی مقابلہ دیکھنے نہ آئے اور مجھے کچھ ہو جائے تو اسے

میرے نزدیک مجھ سے پوچھے بغیر نہ آنے دینا۔ دراصل میں ہارے ہوئے کھلاڑی کا چہرہ دوبارہ اسکے ساتھ لانا نہ چاہتا تھا۔ اب جبکہ یہ آخری مقابلہ تھا تو میرے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں روایت سے بغاوت کر کے دوبارہ Islero کے ہی مدمقابل لاؤں اور یہ بات یونین نے بھی مان لی۔ اور یوں مقابلہ شروع ہوا۔ میرے ساتھی اپنے اپنے سانڈ مارتے رہے۔ میں سخت ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔ اور جب اس دن کے پانچویں بیل کا نمبر آیا تو جس بدمزاج 'بُرے بیل' جسکی قدرتی حالت برقرار رکھنے اور کسی ظلم و زیادتی کا شکار بننے سے بچانے کی میں نے سخت تگ و دو اور نگرانی کی تھی۔ اور جب میں اسے مارنے کیلئے میدان میں اترا تو میں نے اسکی پھرتی، بشاشیت اور طیش کو اچھے مقابلے کیلئے اطمینان بخش پایا۔ اور میرے دل سے نکلا کہ

’مقابلے کا مزہ تو اب آئے گا‘......!

نقاہت کے باوجود مجھے اسکے کوہان اور گردن کے عضلات اور نازک مقامات پر نیزے گھونپنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر نیزے پر وہ اور زیادہ جوشیلا ہو جاتا۔ اسنے اپنا سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔

میں نے جب اسکے بھیجے میں نتیجہ خیز نیزہ گھونپنے میں کامیابی کو مشکل بلکہ ناممکن سمجھ لیا اور قبل از وقت اسکے دل کو تلوار کے کاری دار سے چیرنے کا فیصلہ کر لیا تو مجھے یہ بھی اسکے غیر معمولی استقلال کو دیکھتے ہوئے ناممکن محسوس ہونے لگا اور میرے خواب میرے ہاتھوں سے نکلتے محسوس ہوئے۔ لیکن میں نے بحر حال اسکے سینے میں دل کو چیرنے والی تلوار کا کاری وار کر ہی دیا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ سرخ کپڑے سے غچہ دیتے یکا یک میرا پاؤں لڑکھڑایا اسمیں الجھا اور میں گر گیا......اور سانڈ نے موقع پاتے ہی میری دائیں ران کے بالائی سرے پر انتہائی سرعت سے بآسانی اپنے نوکیلے سینگ گھونپ دیئے۔ میرے ساتھیوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر کے ہٹایا اور مجھے تیزی سے ہسپتال لے جایا گیا۔ میری ران سے خون کی نہر جاری تھی۔ ہسپتال میں خون بند کرنے کی سر توڑ کوششیں ہوئیں۔ لیکن میرا ذہن غنودگی میں ڈوبتا گیا......شاید Lope پہنچ چکی تھی...... مجھے دھندلا نظر آ رہا تھا......کیا مجھ پر نزِاع کا عالم طاری تھا۔۔۔؟ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے......لیکن وہ میرے قریب کیوں نہیں آ رہی شاید اسے بتایا گیا تھا کہ مجھ سے ملنا شرطیہ ہے۔ اگر میں نے اسکا پوچھا اور اجازت دی تو تبھی یہ ممکن ہو گا!

آخری سانسوں میں میرے منہ سے Mamita نکلتا رہا اور میرے دوست احباب نے سمجھا کہ میں اپنی ماں کو پکار رہا ہوں۔ پھر کسی نے میرے کان میں کہا کہ Islero بھی مارا گیا۔ آنکھیں کھولو......

لیکن مجھے اس خبر سے اپنا دل منوں بوجھ تلے دبتا محسوس ہوا میں اپنی آنکھوں کو فوراً بھینچ کر بند کرنا چاہتا تھا۔

اور مجھے اپنی آنکھوں کو بند کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی......

◀◀ ● ▶▶

H.No 45,St No 11,
Wah Model Town.
Phase II, WAH.postal code 47040
Pakistan

’ایک اچھا افسانہ وہ ہے جس میں کوئی کہانی ہو اور ایک اچھی کہانی وہ ہے جو افسانوی انداز میں لکھی گئی ہو۔‘

اقبال حسن آزاد

● ثناء غوری

برزخ

”یہ پیشنٹ پچھلے ایک سال سے ہمارے پاس ہے۔ ہم نے اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کر لی مگر......“

ڈاکٹر نے اپنے ساتھی کو کیس سمجھاتے ہوئے بتایا۔

”اس طرح کومے میں جانے کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں؟“

”اچھا سوال ہے ڈاکٹر زریاب! کومے میں جانے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ کوئی میجر ایکسیڈنٹ، جس میں ذہن کے کسی ایسے حصے میں چوٹ لگ جائے جس کے ناکارہ ہونے سے انسانی جسم مفلوج ہو جاتا ہے یا پھر کوئی شدید ذہنی صدمہ کہ جس کو برداشت کرنے کی انسانی دماغ صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس کیس میں پیشنٹ کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ گھر والوں کے مطابق یہ ایک عام گھریلو زندگی گزار رہی تھی۔ کسی قسم کا صدمہ بھی نہیں۔ ایک صبح اسے بے ہوش پایا گیا اور فوری طور پر ہاسپٹل پہنچا دیا گیا جہاں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ پیشنٹ نیند کی حالت ہی میں کومے میں جا چکی ہے۔ اور کوئی سوال ڈاکٹر زریاب؟“

’اسٹرینج......تو ڈاکٹر ضیغم! اب پیشنٹ کے حوالے سے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اسے کب تک ہوش آ سکتا ہے؟‘

”ویل ینگ ڈاکٹر! ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ کئی سال تک اسی حالت میں بھی رہ سکتی ہے اور چند لمحوں میں بھی ہوش آ سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے کل رات سے ہم اس کی پلز کو بہتر نوٹ کر رہے ہیں۔ بی پی کافی اسٹیبل ہے۔ امید کی کرن تو نظر آ رہی ہے۔“

”اس کا مطلب ڈاکٹر ضیغم یہ ہماری آواز سُن سکتی ہے؟“ ڈاکٹر زریاب کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

”شاید ہاں......یا شاید نہیں۔ میڈیکل سائنس اس حوالے سے کوئی حتمی بات نہیں بتاتی۔ اس پیشنٹ میں پلَس پوائنٹ یہ ہے کہ فزیکلی اسے کوئی اور مرض نہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بہت جلدی کور کر سکتی ہے۔ اگر یہ چاہے تو......کومے کے ایسے پیشنٹ میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اپنی وِل پاور کتنی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس صورت حال سے نکال سکے۔ "so let hope for better ok young doctors move to another patient."

خیال در خیال دائرے بنتے چلے گئے۔ اندھیروں کے اندر سیاہ اور نیلے سیاہی مائل دائرے اپنا

حصار بناتے گئے۔ وہ اپنے اردگرد کھڑے ڈاکٹرز کی آوازیں نہیں سن سکتی تھی۔ وہ اس وقت کہاں تھی؟ یہ وہ خود نہیں جانتی تھی۔

یہاں بہت سارے لوگ سفید چادر میں لپٹے ہوئے ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ کوئی کسی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاحد نظر انسانوں کا سفید جنگل پھیلا ہوا تھا.....لیکن مکمل سُکوت.....سُکوت ایسا تھا کہ جیسے اس زمین پر وہ اکیلی بیٹھی ہو۔ سب ہی تو چپ تھے۔ شاید ہر کوئی اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں خوف نہ تھا۔ وہاں نہ نفرت تھی نہ محبت، نہ آگ اور نہ پانی۔ پتا ہی نہ چلتا تھا کہ کون زاہد ہے اور کون بدکار۔ وہ بہت پُرسکون تھی وہاں۔ ہلچل تھی تو فقط اتنی کہ اتنے عرصے بعد اسے وہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جنھیں وہ بہت پہلے سُننے کی عادی تھی۔ کچھ گھنٹوں سے وہ آوازیں بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور اس کا سکون گھٹتا جا رہا تھا۔ وہ یہ آوازیں سُننا نہیں چاہتی تھی۔ گرچہ ان آوازوں سے اسے بہت محبت تھی۔ لیکن اس کی محبتیں اُس وقت، اس سکون کی کیفیت میں اسے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ وہاں موجود ہر شخص اسی سکون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شاید یہ آوازیں صرف اُسے ہی سُنائی دے رہی تھیں۔ شاید وہاں بیٹھا ہر شخص صرف اپنی اپنی آوازوں کی اذیت میں تھا۔ شاید اسی لئے سب خاموش تھے۔ رفتہ رفتہ آوازیں بڑھتی گئیں، بڑھتی گئیں، چیخ بنتی گئیں، گڈمڈ ہوتی چلی گئیں۔

''میری بیٹی میری شہزادی.....تمھارا باپ مر گیا.....''

بولو قبول ہے، قبول ہے.....بولو.....''

''تم میری زندگی ہو.....تم ہماری عزت ہو، ہمارا مان ہو.....''

''آپ بہت قابل اور ذہین خاتون ہیں.....''

''دیکھئے گا، آپ کتنی جلدی آگے بڑھیں گی.....''

''یہ دیکھئے! آپ کی بیٹی پیدا ہوئی ہے.....کتنی بیٹیاں پیدا کرے گی.....''

''کیا کرو گی پڑھ لکھ کر.....''

''کچھ بھی ہو وہ تمھارا گھر ہے.....''

''تم سے کہا نا، تمھیں یہ کام نہیں کرنا.....''

''تم اس دنیا کی مخلوق ہو بھی کہ نہیں.....ناکارہ عورت.....''

''بدچلن آوارہ.....''

شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اتنی تکلیف میں تھی کہ جیسے اس کے سارے جسم سے خون رس رہا ہو۔ لیکن گھاؤ کہیں نظر نہ آتا ہو۔

اس کی نبض اچانک تیز ہو جاتی۔ سرہانے بیٹھی نرس بار بار گھبرا کر میٹر ریڈنگ نوٹ کرتی اور واپس

بیٹھ جاتی۔ لیکن اسے ہوش نہ تھا کہ اس کے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے اندر کی آوازیں چیخے جا رہی تھیں۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرنا چاہا۔ وہ تکلیف کی شدت سے گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑی۔ اچانک آواز آئی:

''شازمین!''

''شازمین!!''

اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ یہ تو وہی چہرہ تھا۔ اسے چھونے کے لئے وہ آگے بڑھی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چہرہ آئینے میں تبدیل ہو گیا.....ایک شفاف خوب صورت آئینہ۔ اس نے اپنے آپ کو اس آئینے میں دیکھنا چاہا۔ وہ اپنی گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر اس آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ شاید آج پہلی بار اس نے اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ کمر تک لہراتے سیاہ گھنگریالے بال، شفاف جلد اور سبز آنکھیں۔ خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے جیسے یقین نہ آیا ہو۔ اپنی انگلیاں آئینے پر پھیرتی اور پھر اپنا چہرے چھوتی۔ اپنے آپ میں مگن۔ اس نے خود سے کہا۔

''شازمین یہ تم ہو.....سچ میں یہ تم ہی ہو؟ اتنے وار کھانے کے بعد تو تمھارا چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔ تم تو خود اپنے آپ کو دکھائی نہ دیتی تھیں۔''

''ہاں یہ میں ہی ہوں۔ ہاں یہ تو میرا ہی چہرہ ہے۔'' وہ اس حیرت کدے میں کھوئی ہوئی تھی کہ پھر آواز آئی۔

''شازمین!''

''شازمین!!''

اس نے بجلی کی سی تیزی سے یہاں وہاں دیکھا۔ پر وہ نہیں تھا۔ آواز تو اسی کی تھی لیکن وہ کہیں بھی تو نہ تھا۔ ایک بار پھر وہ خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ ایک بار پھر وہ خود سے مخاطب تھی۔

وہ مجھے اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ میں مکمل سکوت کی حالت میں زمین پر لیٹی آنکھیں بند کئے اسے اپنے وجود میں جذب ہوتا محسوس کرتی ہوں۔ وہ ایسا حصہ ہے میرے جسم کا جہاں دھڑکنوں کا کارخانہ رواں دواں ہے۔ میری پہلی سہمی ہوئی خواہش.....

''یہ کائنات پہلی محبت کے لفظ کی چھاؤں میں وجود میں آئی۔ میرا مسئلہ تو میری آخری محبت ٹھہرا۔ مجھے نفرت ہے اپنے آپ سے کہ مجھے تم سے عشق ہے لیکن مجھے اس دبے ہوئے جذبے سے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں عورت ماں بنتی ہے تو اپنے اندر ایک نئے وجود کی پیدائش اسے سرشار کر دیتی ہے۔ سرمایۂ حیات.....مکمل عورت بننے کی نوید۔ عشق بھی تو ایک وجود کو جنم دے رہا ہے میرے اندر۔ انسانوں نے جسم کو نوچا۔ بہ ظاہر مکمل عورت بن گئی۔ مگر روح.....روح کو فرشتے تک نہ چھو سکے۔ میری روح میں تمھارا عشق پل

رہا ہے۔ چھو گیا ہے مجھے۔ تم مکمل انسان صحیح لیکن لمحہ لمحہ ہر گزرتے دن تم پھر سے صورت پا رہے ہو میرے اندر۔ ایک تمھاری ماں نے تمھارے جسم کو جنم دیا۔ ایک میں کیسی پاگل جوگن کہ تمھاری روح کو اپنے بدن میں پلتا دیکھتی ہوں۔ تم سانس لینے لگے ہو میرے اندر۔ لیکن تمھارا وجود نو ماہ کے عرصے میں مکمل ہو کر مجھ سے الگ نہیں ہوگا۔ میں کانپ جاتی ہوں یہ سوچ کر کہ نو ماہ، نو سال، نو صدیاں...... جب تک دنیا قائم ہے...... روحیں فنا نہیں ہوتیں۔ جسم مرتے ہیں اور تم تو پل رہے ہو میرے اندر۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں تمھاری آنکھیں ہو جائیں گی...... میرے لب تمھاری زبان بولیں گے...... میری روح کے کونے کونے پر تم قابض ہو جاؤ گے۔ اے میری سہمی ہوئی خواہش! بخش دے مجھے...... یہ روگ مجھے بدروح بنا کر چھوڑے گا۔‘‘

غم سے نڈھال ہو کر وہ گھٹنوں میں سر دیئے سسکیاں لے رہی تھی کہ کہیں کوئی اس کی آواز نہ سُن لے۔ اسے ایسے ہی گُھٹ گُھٹ کر رونے کی عادت تھی۔

اچانک اسے زیورات کی چھنکار سنائی دی۔ اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کا وجود آئینے میں سے باہر آ گیا تھا۔ وہ حیرت سے پلکیں جھپکاتی اپنے سامنے کھڑی دوسری شازمین کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن یہ کیا...... وہ تو سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی مگر اس کے سامنے کھڑی شازمین نے سُرخ لباس پہنا ہوا تھا۔ سُرخ لباس میں ملبوس شازمین مسکرائی اور بہت پیار سے ہاتھ آگے بڑھا کر کہنے لگی۔

’’گھبراؤ مت، میں تمھاری زندگی ہوں۔ تمھیں اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ آؤ میرا ہاتھ تھام لو۔‘‘

آئی سی یو میں نصب میٹر کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ شازمین نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ نگرانی پر مامور نرس کو لگا کہ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ لیکن نہیں، نبض تیز ہو رہی تھی۔ سانس تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھیں کھلیں اور بند ہو گئیں۔ نرس یک دم چلائی۔

’’او مائی گاڈ، پیشنٹ کو ہوش آ رہا ہے...... ڈاکٹر...... ڈاکٹر!‘‘

ڈاکٹر بھاگتا ہوا آیا اور شازمین کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ all the other doctors imedediately اگلے دس منٹ اس لڑکی کی زندگی کے لئے بہت اہم ہیں۔ پیشنٹ کے ساتھ کون کون ہے؟‘‘

’’باہر اس لڑکی کا شوہر موجود ہے۔‘‘

’’بلاؤ اسے فوراً......‘‘

’’یہاں...... آئی سی یو میں؟‘‘

’’ہاں، یہ ضروری ہے۔‘‘

سفید کپڑوں میں لپٹی شازمین لال کپڑوں میں ملبوس شازمین کو دیکھتی رہی۔ لال کپڑے پہنے شازمین کے لبوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

’’آؤ میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمھیں دنیا کی ہر خوشی دوں گی۔ تم جس راستے کو اختیار کرنا چاہو یہ تم پر

ہے۔ اپنے حصے کی خوشیاں لے لو اس دنیا سے۔ تم کر سکتی ہو۔ چلو میرے ساتھ۔ میں تمھیں لینے آئی ہوں۔‘‘

’’نہیں میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ تمھارے سُرخ لباس سے مجھے خون کی بو آتی ہے۔ تم دھوکا ہو، فریب ہو۔ خوشیوں کی نوید دے کر تم مجھے زندگی کی دوزخ میں جھونک دو گی۔ مجھے بھروسا نہیں تم پر۔‘‘

لال کپڑوں میں ملبوس شازمین نے محبت سے ایک قدم آگے بڑھایا۔

’’چلو، دیکھو زندگی تمھیں پکار رہی ہے۔ تمھارے بچے تمھیں پکار رہے ہیں۔ اور وہ جو تمھارا ہم سفر تھا...... دیکھو...... سنو اس کی آواز وہ تمھیں پکار رہا ہے۔‘‘

’’میرا وقت ہو گیا مجھے جانا ہے۔ مجھے چند روز کی خوشیاں نہیں چاہئیں۔ اپنے حصے کی مسرتیں میں دنیا سے چھیننا چاہتی تو بہت پہلے چھین لیتی۔ لیکن مجھے چھیننا نہیں آتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ میرے لئے راستہ بنانا مشکل نہیں۔ اپنی خوشیوں کو پانا ناممکن نہیں لیکن....‘‘ لال کپڑوں والی شازمین اب بھی ہاتھ آگے کئے کھڑی تھی۔

سفید کپڑے میں لپٹی شازمین کو اب باہر کی دنیا کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ یہ اس کے ہم سفر کی آواز تھی۔

’’شازمین آنکھیں کھولو۔ خدا کے لئے آنکھیں کھولو۔ میں تم سے اپنے ہر سلوک پر معافی مانگتا ہوں۔ آنکھیں کھولو شازمین ڈاکٹر کچھ کیجیے۔‘‘

’’ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس وقت اس کی اپنی وِل پاور پر ہے کہ یہ خود کو کومے سے باہر لا سکے۔ آپ بات کیجیے اس سے۔ یہ آپ کو سُن سکتی ہے۔‘‘

’’شازمین واپس آ جاؤ۔ اٹھو شازمین۔‘‘

’’شازمین نے ایک دفعہ آنکھیں کھولیں۔ اسے اپنے ہم سفر کا چہرہ نظر آیا اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

سفید کپڑوں میں لپٹی شازمین نے قدم پیچھے ہٹانے شروع کر دیئے۔ وہ لال لباس پہنے شازمین سے دور ہوتی جا رہی تھی دور اور دور۔ اچانک سرخ کپڑوں میں ملبوس شازمین غائب ہو گئی۔

باہر کی دنیا کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔

آئی سی یو میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ ای سی جی مونیٹرنگ مشین کی بیپ بند ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کی آواز نے سکوت توڑ دیا۔

"I am sorry she is no more."

◀◀ ● ▶▶

Sana Ghori Flat # 301
Komal Arcade 3,E,18 COM,Area، Nazimabad # 3
Karachi.،Pakistan

● امین بھایانی

گڑ کی ڈلی

''صیب .....ام اپنا وطن جاتی اے۔ امارا بخشش لاؤ۔'' خان لالہ نے اپنے ہاتھ کو ایک پیالے کی سی شکل دی اور پیشانی کے عین وسط پر رکھ کر اشارتاً سلام کرتے ہوئے کہا۔ ہر بار کی طرح خان لالہ اپنی سالانہ چھٹیوں پر جانے سے قبل بخشش وصولی مہم کے تحت محلے بھر کے گھروں پر حاضری دیتا پھر رہا تھا۔ ابو کی صدا پر امی فوراً باورچی خانے سے برآمد ہوئیں اور ابو کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

''ارے بھئی یہ چوکیدار امیر خان اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ اُس کے بچوں کی مٹھائی کے لئے اِسے دس روپے دے دو۔''

''ساب امارا نام امیر خان نئیں، امیر حکیم خان اے۔ اُدر وطن میں ام کو سب امیر حکیم خان ہی بُولاتا اے''۔ خان لالہ نے تصحیح کی۔

''ہاں ہاں، بھئی امیر حکیم خان کو دس روپے دے دو۔'' ابو نے مسکراتے ہوئے امی کو اشارہ کیا۔ میں نے امی کو آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات کو صاف محسوس کیا لیکن ابو کے سامنے وہ بھلا کاہے کو دم مار سکتی تھیں۔ خاموشی سے اپنے دوپٹے کا پلو کھول کر اُس میں بندھا واحد دس روپے کا ایک مڑا تڑا سا ہرا نوٹ نکل کر چوکیدار امیر خان جسے ہم محلے بھر کے بچّے بالے خان لالہ خان لالہ کہہ کر پکارا کرتے تھے کے ہاتھ پر دھر دیا۔ دس روپے کا نوٹ پا کر خان لالہ کی آنکھوں میں ایک بھرپور چمک لہرائی اور اُس نے اپنے پیلے پیلے دانت جس میں سے اب چند ایک اُسے عرصہ ہوا داغِ مفارقت دے گئے تھے، نکال کر ایک بار پھر اپنا ہاتھ پیشانی کے عین وسط پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں رکھ کر امی اور ابو دونوں کا با آوازِ بلند شکریہ ادا کیا اور گھوم کر تیزی سے چل دیا۔ اُس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی امی نے فوراً گھر کا دروازہ بند کیا اور پھر ابو کی جانب شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئیں قدرے آہستہ مگر واضح خفگی سے بھرے لہجے میں بولیں۔

''پپو کے ابا، آپ بھی نا کمال کرتے ہیں۔ بھلا اب چوکیدار کو اکھٹے دس روپے دلوانے کی کیا تک تھی؟ کیا اُسے محلے کے ہر گھر سے تنخواہ کے ماہانہ دس روپے نہیں ملتے جواب آپ نے اُسے مزید دس روپے دلوا دیئے۔ ویسے بھی میں نے وہ دس روپے پپو کے اسکول کی کتابوں کے لئے رکھے تھے۔'' ابو جیسے پہلے ہی سے امی کے چوکیدار مخالف مظاہرے کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے، مسکراتے ہوئے بولے۔

''ارے بیچارہ غریب آدمی ہے۔ پورے سال ہماری خدمت کرتا ہے۔ تب کہیں جا کر ہم اُسے ایک بار یہ دس روپے وہ بھی اُس کے بچوں کی مٹھائی کے نام پر دیتے ہیں۔ اب اتنا تو اُس غریب کا حق بنتا ہی ہے اور یہ بھی تو دیکھو نا وہ بیچارہ جب اپنے گاؤں سے آتا ہے تو کتنے پیار سے پپو کے لئے اپنے گھر کی بنی خشک میوے ملے دیسی گُڑ کی ڈھیر ساری ڈلیاں لا کر دیتا ہے جسے اپنا پپو کتنے شوق سے کھاتا ہے۔ باقی رہی بات کتابوں کی تو کل پہلی تاریخ ہے۔ تنخواہ ملے گی تو کتابیں بھی آ ہی جائیں گی۔'' امی ابو کی بات اور مسکراہٹ دونوں ہی کو سُنی ان سُنی اور دیکھی ان دیکھی کر کے منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتیں اندر باورچی خانے میں چل دیں۔ ابو کی یہی بات تو مجھے بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ کسی کا بھی حق ادا کرنے میں ذرا برابر بھی تامل نا کیا کرتے۔ ویسے بھی مجھے اسکول کی کتابوں سے زیادہ گڑ کی ان ڈلیوں کی چاہ تھی جو خان لالہ ہر سال اپنے گاؤں سے واپسی پر لایا کرتا اور پھر ہر اُس گھر جا جا کر جہاں مجھ جیسے چھوٹے بچّے ہوتے، اِس تاکید کے ساتھ بانٹا کرتا کے یہ سوغات تو وہ خاص بچّوں ہی کے لئے لایا ہے۔ ساتھ بڑے ہی فخریہ انداز میں یہ بتانا بھی ہرگز نہ بھولتا کہ دیسی گڑ کی وہ ڈلیاں اُس کی بیوی نے خود اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں۔ وہ گھر کے پچھواڑے کی زمین کے گڑھے میں نصب کڑھاؤ جس کے نیچے ڈھیر ساری لکڑیوں کی آگ جل رہی ہوتی، میں گنے کے رس کو مسلسل کئی گھنٹوں ابالتی اور کفگیر سے چلاتی جاتی۔ جب وہ رس ایک سبزی مائل بھوری گاڑھی راب کی سی شکل اختیار کر لیتا تو اُس میں اپنے ہاتھ کی ہی ادھ کٹی کالی مرچیں ڈالتی اور دوبارہ کفگیر سے مسلسل گھونٹ کر یک جان کر کے اُس میں خشک میوہ جات مثلاً بادام، پستہ، اخروٹ، چلغوزہ، مونگ پھلی اور کشمش شامل کر کے اسے اتنا ٹھنڈا ہونے دیتی کہ اپنے ہاتھ سے بھینچ بھینچ کر اُس گاڑھے ملغوبے کی ڈلیاں بنا لے اور پھر خشک ہونے کے لئے گھر کے صحن میں دھلے ہوئے صاف کپڑے پر پھیلا کر رکھ دیتی۔ تو اب شروع ہوتا ہے میرا انتظار۔ جی ہاں خان لالہ کی واپسی کا۔ خان لالہ کی واپسی کا مطلب ہے کہ محلے بھر کے سب بچوں کی عید۔ کیونکہ ہم سب کے لئے لالہ کی جانب سے سوغات میں ملنے والیں خشک میووں سے لبریز دیسی گڑ کی ڈلیاں بھلا کسی عید کی عیدی سے کچھ کم تھوڑا ہی تھیں اور عید تو سال میں دو بار آتی ہے لیکن لالہ کے گاؤں سے گڑ کی ڈلیاں صرف ایک بار۔ گڑ کی ڈلیوں کے علاوہ ایک اور بات جو میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوا کرتا وہ یہ کہ لالہ ہر سال جاتا تو گاؤں تھا لیکن وہ یہ کیوں کہتا کہ میں اپنے وطن جاتا ہوں؟ بھلا وہ یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں؟ ہمارے سرکاری اسکول جہاں میں جماعتِ چہارم کا طالبِ علم تھا کے استاد تو کہا کرتے ہیں کہ پاکستان ہم سب کا وطن ہے تو کیا لالہ پاکستان سے کہیں باہر رہتا ہے جو وہ ہمارے شہر اور ہمارے وطن پاکستان کو اپنا وطن ہی نہیں گردانتا۔ اِسی اُدھیڑ بن سے تنگ آ کر میں نے خود ہی آخر اپنے آپ کو سمجھا لیا کرتا کہ مجھے اِس سے کیا کہ وہ پاکستان میں ہی رہتا ہے کہ کہیں اور۔ بھلے ہی وہ جس وطن سے بھی تعلق رکھتا ہو لیکن واپس تو پھر یہاں ہی آتا ہے اور آ کر وہ ہم سب بچوں کو گڑ کی ڈلیوں کی اِس

قدر شاندار سوغات تو خوشی خوشی دیتا ہے نہ۔ تو بس یہ ہی میرے لئے سب سے بڑی اور اہم بات تھی۔ خان لالہ کا نام تو امیر حکیم خان تھا لیکن محلے بھر کے بچے جہاں اُسے خان لالہ کہا کرتے تو وہیں سارے بڑے امیر خان کہ کر بلایا کرتے لیکن شاید اُسے صرف امیر خان کہلوانا پسند نہ تھا۔ امیر خان پکارے جانے پر وہ فوراً تصحیح کر دیتا.....'امیر حکیم خان'..... خان لالہ کا حلیہ بھی اُس کی طرح سے ہی انوکھا تھا۔ تنگ دامن کی قمیص اور گھیر دار شلوار میں ملبوس بھاری تن وتوش، درمیانہ قد، صاف گورا رنگ، مہندی میں رنگے گھنے سرخی مائل نارنجی بال اور گھنی باریش ڈاڑھی۔ عمر لگ بھگ پچپن سے ساٹھ کے درمیان، ہاتھ میں ہر وقت ایک بانس کا لمبا اور مضبوط سا ڈنڈا جسے وہ راتوں میں چوروں اور اٹھائی گیروں کو خبردار کرنے کے لئے زور سے سڑک پر مار مار کر آوازیں پیدا کیا کرتا۔ ہم سب بچّوں سے تو اُسے کچھ خاص ہی لگاؤ تھا۔ ساری رات جاگنے کے بعد وہ دن بھر اپنی چارپائی پر لیٹ کر آرام کیا کرتا جو کہ ہمارے محلے کی بلڈنگ کے نیچے والی منزل کی ایک کوٹھری کے اندر لگی رہتی تھی اور کوٹھری کے دروازے پر اُس نے ایک چادر تان رکھی تھی۔ دن بھر جب وہ کوٹھری میں سویا رہتا تو دروازہ کھلا ہی رہنے دیتا، صرف چادر تنی رہتی۔ ہاں البتہ رات کو جب وہ محلے کی بلڈنگ کے چاروں اطراف گھوم پھر کر چوکیداری کرتا تو اپنی کوٹھری کے دروازے پر تالہ ضرور لگا دیا کرتا۔ محلے بھر کے سارے بچّے شام کو اکھٹے ہو کر کھیلا کودا کرتے اور خوب ہلا گلہ ہوتا۔ لیکن مجال ہے کہ جو کبھی خان لالہ نے اپنی کوٹھری سے باہر نکل کر انہیں روکا یا ڈانٹا تک ہی ہو۔ دن گزرتے رہے اور ایک ماہ گزر گیا۔ لیکن خان لالہ کی واپسی نہ ہوئی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک ماہ سے زیادہ اپنے گاؤں میں ٹھہرا ہو۔ مزید دن گزرتے رہے لیکن خان لالہ واپس نہ آیا۔ ہم سب بچّوں میں ایک تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ شام کو کھیلنے کے لئے جمع ہوتے تو سب کی نظریں خان لالہ کی بند کوٹھری پر لگے تالے پر گڑھ جاتیں اور ہمارا موضوعِ سخن خان لالہ کی واپسی ہی ہوتا۔ پھر کچھ تین چار ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ ایک رات امی حسبِ معمول باورچی خانے میں الجھی ہوئی تھیں۔ ابو کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھے اور میں اپنا سبق یاد کر رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ابو نے کتاب کے بیچ میں اپنی ایک انگلی دے کر اُسے بند کر کے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دروازہ کھولنے کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ابو نے دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر مارے خوشی کے میری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ وہ کوئی اور نہیں خان لالہ تھا۔ ابو نے اُسے دیکھتے ہی فوراً کہا۔

''ارے امیر حکیم خان تم، بھئی تم کہاں رہ گئے تھے اتنے دنوں تک؟''

''ساب، کیا ام اندر آسکتی اے، امارے کو تمارے سے کچھ بات مات کرنا اے۔''

خان لالہ کی آواز بہت بدلی ہوئی اور کمزور سی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہاں بھئی ضرور آؤ۔'' ابو نے اُسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ اندر آ کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو امیر خان کھڑے کیوں ہو۔'' ابو نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خان لالہ کچھ

کہے بغیر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ کمرے میں روشن زرد بلب کی روشنی میں پہلی بار میں نے خان لالہ کا چہرہ بغور دیکھا۔ خان لالہ کا سرخ وسفید چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ پہلے جب وہ اپنے گاؤں سے لوٹتا تو اُس کا چہرہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرخ اور اُس کی صحت پہلے سے مزید اچھی محسوس ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب کی بار تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کے جیسے اُس کا وزن بھی کافی گر چکا تھا۔

''وہ صیب.....! ام یاں سے امیشہ کے لئے جاتی اے۔ اپنا سامان لینے آئی تو سوچا کے تم سے بھی ملتی جائے۔''

''امیر خان کیسی باتیں کر رہے ہو! ایسا کیا ہو گیا کہ تم آج بیس بائیس سال پرانی نوکری کو ٹھوکر مار کر جانے کی بات کر رہے ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟'' ابّو اپنی نشست سے اٹھ کر خان لالہ کے قریب آ گئے اور اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ابّو کے ہاتھوں کو اپنے کاندھوں پر پا کر نا جانے کیا ہوا کہ خان لالہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اُس کے رخساروں سے ہوتے ہوئے اُس کی نارنجی ڈاڑھی کو بھگونے لگے۔ ابّو نے خان لالہ کا یہ حال دیکھ کر مجھے پانی لانے کا اشارہ کیا۔ میں فوراً باورچی خانے کی طرف دوڑا اور پانی کا گلاس بھر کر پھر واپس بھاگا۔ امی جو باورچی خانے میں نہ جانے کیا کر رہی تھیں مجھے اِس طرح سے حواس باختہ ہو کر بھاگتے دیکھا تو میرے پیچھے ہو لیں۔ جب انہوں نے ابو کے پاس خان لالہ کو بیٹھے اور اُس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں دیکھی تو وہ بھی ہکا بکا سی رہ گئیں اور بنا اس کچھ کہے ایک طرف بس گم سم سی کھڑی ہو گئیں۔ ابّو نے پانی کا گلاس میرے ہاتھ سے لے کر خان لالہ کو پکڑایا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ ابّو اُس کے ہاتھ سے خالی گلاس واپس لیتے ہوئے بولے۔

''اب مجھے ساری بات بتاؤ۔''

''وہ صیب.....! جب ام پچلا سال اپنا وطن گئی تی تب امارا عورت ام کو بولا کے امارہ بڑا لڑکا شیر کان ایک لڑکی سے شادی کا کواہش رکتی اے۔ ام اُس کا رشتہ لے کر گئی۔ امارہ طرف یہ رسم اے کے جو لڑکا کسی لڑکی سے شادی کرنا چاتی اے تو اُسے لڑکی کے باپ کو اُس کا مطلوبہ رقم دینا پڑتی اے، پیر ہی باپ اپنی بیٹی کا شادی اُس لڑکے سے کرتی اے۔ لڑکی کے باپ کا مطالبہ امارا ایشیت سے بوت زیادہ تی۔ ام نے اپنا لڑکا کو کوب سمجائی اور اُس کا شادی اپنا چوٹا بائی کا لڑکی سے تے کی۔ امارا ارادہ تی کے ام اِس سال اُس کا شادی کا نہ آبادی کرے گی۔ مگر جب ام گاؤں پونچی تو وہاں سب کچھ برباد ہو چکی تی۔ شیر کان امارا عمر بر کا کمائی جوام نے یاں شیر میں چوکیدارا کر کے کمائی تی اور گاؤں میں توڑا توڑا کر کے زمین کے ٹکڑے لی تی جس پر وہ اپنا دوسرا چوٹا بائی لوگ کے ساتھ مل کر ہر موسم کا پسل کاشت کرتی تی، بیچ دی اور سارا رقم لڑکی کے باپ کو دے کر شادی کا نہ آبادی کر لی اور اپنا بی بی کو لیکر پیشور (پیشاور) چلی گئی۔''

''تمھاری بیوی نے اُسے روکا نہیں؟'' خان لالہ جیسے ہی سانس لینے کو رکا تو ابّو نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔

''خوصیب .....!وہ جوان گرم گون اے،ام بڈالوگ کابات کدھر سُنتی اے۔اس کانہ کراب نے اماراعمر بھر کا جمع پونجی برباد کردی۔''

''تواب تم نوکری کیوں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟''ابّو نے خان لالہ سے سوال کیا۔

''خوصیب .....!اب شیر کان کے بعد امارہ دوسرالڑکا گلاب کان بھی جوان ہوگئی اے اورام کوڈراے کہ وہ اب اپنا شادی کے چکر میں امارا آکری عمر کا سہارا،اس بُڑاپے میں امارے سر کا چت بھی ناچین لے۔''

''کیا مطلب ہے تمھارا؟''ابّو نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''اس بیس بائیس سال میں ام نے شیر میں چوکیدارا کر کے اور اپنا پیٹ کاٹ کر سارا سارا رات کو جاگ کر جو توڑا بوت زمین کریدی تی وہ تو شیر کان کی کافر جوانی کی نذر ہوگئی اب ام،امارابی بی اور دوسرے چے بچّوں کے سر پر جو چت ہے کہیں گلاب کان اپنا شادی کے چکر میں اُسے بی نا بیچ دے۔اس لئے اب امارا اروقت گاؤں میں رینا بہت ضروری اے۔''

''بہر حال جو ہوا بہت برا ہو۔''ابّو نے خان لالہ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''اچاصیب .....!اب ام جائے گی۔''خان لالہ اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ کا پیالہ سا بنا کر عین پیشانی پر رکھ کر ابّو کو سلام کرتے ہوئے کہا۔وہ جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ امی نے اپنے دوپٹے کے پلو کو کھول کر اُس میں رکھا واحد مڑا تڑا سا دس روپے کا ہرا نوٹ آگے بڑھ کر خان لالہ کے ہاتھ پر دھر دیا۔ خان لالہ کے چہرے پر ایک غم زدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں ایک کونے میں خاموش کھڑا یہ ساری کہانی سن رہا تھا۔خان لالہ میرا پاس آیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''او پپو یارا.....!ام کو ماپ کرو،ام اِس بار تمارا واسطے گوشک میوے والا دیسی گڑ کا مٹائی نہ لاسکی اور لاتی بھی کیسے۔اُس کمبخت شیر کان نے وہ کیت بھی پروکت کیا جس پر اُگنے والے گنے کا رس سے امارا بی بی تم بچا لوگ کے لئے مٹائی بناتا تا''۔ پھر وہ جانے کو مڑا ہی تھا لیکن شاید کچھ یاد آنے پر ٹھہرا۔اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ جھلملائی اور پھر وہ میری جانب دیکھتا ہوا بولا۔

''گم نا کر پپو یارا.....!تم بچہ لوگ کو تو کچ مینہ انتظار کرنے کے بادگڑ کا ڈلی نا ملا.....!ارے ام کو دیکو،ام کو تو اپنا سارا زندگانی کا میعت ،صبر اور انتظار کے بعد بی گڑ کا ڈلی نا ملا.....!!!!۔''اتنا کہہ کر خان لالہ اپنی قمیص کی آستین سے اپنے آنسوؤں کو پونچھتا ہوا باہر کی طرف چل دیا۔اور اُس دن کے بعد نہ تو میں نے پھر کبھی امیر خان، میرا مطلب ہے کے امیر حکیم خان کو دیکھا اور نہ ہی کبھی ویسی خشک میوے سے لبریز ادھ کٹی کالی مرچ والی دیسی گڑ کی ڈلی ہی کھائی۔

903 -MISTY VIEW CT,
LILBURN, GA-30047 U.S.A. 404-207-9063

● فرحین جمال

کھیل

اس کا ذہن دکھ،خوف اور پریشانی کی وجہ سے ماؤف ہو چکا تھا۔وہ سب دیکھ تو رہی تھی مگر سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔وہ اس وقت اپنے فارم ہاؤس کے خوبصورت اور آراستہ کمرے میں ڈبل بیڈ پر اکیلی پڑی تھی۔سائیڈ ٹیبل پر رکھی بلوری گھڑی میں شام کے آٹھ بج رہے تھے۔قریب ہی ایک گلاس میں پانی اور منرل واٹر کی بوتل بھی رکھی تھی۔بیڈ کی دوسری طرف اس کا موبائل اور گاڑی کی چابیاں رکھی تھیں۔ سائیڈ لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی نے کمرے میں خواب ناک سا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔

سائیڈ کی دیوار پر جدید آرٹ کی ایک تصویر آویزاں تھی۔بیڈ کی پائنتی کی جانب دو بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جو باہر ٹیرس میں کھلتی تھیں اور اس وقت بند تھیں۔ان پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔سوائے ایئر کنڈیشن کی مدھم سی آواز کے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ان کا ہینڈ بیگ جس میں سلیپنگ سوٹ اور کچھ پہننے کے کپڑے تھے،سائیڈ میں قالین پر پڑا تھا۔ابھی اسے کھول کر الماری میں رکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ کمال کو اتنی جلدی جو تھی۔وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کو اور اس وقت کو کوس رہی تھی جب یہ فارم ہاؤس خریدا گیا تھا۔روزی کا اصل نام روزینہ تھا۔وہ خوش شکل، جاذب نظر اور دلکش پرسنالٹی کی ملک تھی۔کوئی دس سال سے ایک مشہور این۔جی۔او 'عورت' کے نام سے چلا رہی تھی۔کمال سے اس کی پہلے ملاقات بھی اسی این۔جی۔او کے ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔کمال ایک ملٹی نیشنل فرم میں وکیل تھا اور اس سیمینار میں عورت کے قانونی حقوق پر اپنی ماہرانہ اور پیشہ وارانہ خدمات کے بارے میں مضمون پڑھنے آیا تھا۔اس کو روزی کی دلکش اور خود اعتماد شخصیت نے بہت متاثر کیا۔یہ نہیں کہ اس نے حسین عورتیں دیکھی نہیں یا برتی نہیں تھیں مگر روزی میں قیامت کی کشش تھی اور اسی بات نے اس کی توجہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

اس کی سیاہ غزالی آنکھوں میں ایک انہونی سی سپردگی تھی اور سراپے میں قاتلانہ کشش تھی۔ایسا لگتا تھا کہ اس کے جسم سے نکلتی برقی رو نے اس کے دل کے تاروں پر کوئی نیا گیت چھیڑ دیا تھا،لہٰذا اس ابتدائی ملاقات کے بعد بھی دونوں ملتے رہے اور پھر یہ ملاقاتیں شادی پر ہی منتج ہوئیں۔کمال حد سے زیادہ شراب و شباب کا رسیا تھا۔روزی کی صورت میں اسے اپنے ہیجانی اور حیوانی جذبات کی آسودگی میسر آ گئی۔وہ زندگی سے انتہائی حد تک لطف کشید کرنے کا قائل تھا۔اب ایسا بھی نہیں تھا کہ روزی میں کسی قسم کی جھجک یا

ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ وہ ایک آزاد خیال اور ماڈرن عورت تھی۔ وہ بھی شوہر کا ہر طرح سے بڑھ چڑھ کر ساتھ دیتی اور اپنے ازدواجی تعلق سے پوری طرح سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ سو ان کی شامیں رنگین سے رنگین تر ہوتی گئیں۔ اسی طرح شب و روز گزرتے رہے۔ وہ اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن تھے۔ لیکن حد سے زیادہ شراب، لیٹ نائیٹ پارٹیوں، اور رنگینوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ کمال دن بہ دن فربہی مائل ہوتا جا رہا تھا۔ کام کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ کمال قانونی داؤ پیچ کو ایک کھیل سمجھتا تھا اور اس کھیل کا نہایت شاطر کھلاڑی بھی تھا اور وہ پچھلے پانچ سالوں میں ترقی کی منزلیں طے کرتا کمپنی کا حصے دار بن چکا تھا۔ روزی سے ہر ہفتے اسی بات پر بحث بھی ہوتی تھی کہ وہ جم جوائن کر لے..... لیکن کمال ہر بار کام کا بہانہ بنا کر بات کو ٹال دیتا۔ روزی کو اب شدت سے اولاد نہ ہونے کا بھی رنج تھا۔ وہ جب بھی اس موضوع کو زیر بحث لاتی تو کمال ٹال جاتا تھا۔

''بھئی ڈارلنگ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا یہ خوبصورت جسم خراب ہو۔'' وہ ہنس کر کہتا۔

''ہر وقت ایک ہی بات.....'' روزی چڑھ جاتی۔

''کیا جن عورتوں کے بچے ہوتے ہیں ان میں کشش نہیں رہتی۔'' وہ بحث کرتی۔

''مسز عثمانی کو دیکھئے دو بچے ہیں اور اب تک کتنی سمارٹ ہیں۔''

''لیکن یار ابھی تو عمر پڑی ہے۔'' وہ جواب دیتا۔

''خود بھی لطف اٹھاؤ اور مجھے بھی زندگی کا لطف لینے دو۔''

''کون سی عمر؟'' وہ منہ بناتی۔

''لیکن ڈارلنگ ابھی بوڑھے تو نہیں ہوئے نا.....'' وہ ہنستا۔ روزی اس کی ایسی منطق سے زچ ہو جاتی اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمال کی ہیجانی کیفیت میں کمی کی بجائے اور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ روزی اس کی اس بڑھتی ہوئی ہیجانی کفیت کی وجہ سے پریشان تھی۔ وہ جتنا اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتی وہ اتنی ہی الجھتی جاتی۔ اس نے کئی بار دبے دبے لفظوں میں کسی نفسیات کے ماہر سے مشورہ لینا کا بھی کہا، لیکن کمال بھڑک اٹھتا۔

''میں نفسیاتی مریض نہیں ہوں۔ تم کیوں ایسا سمجھتی ہو؟..... تمہیں کیوں اعتراض ہے؟..... یہ مجھے بتا دو۔ میں کوئی گناہ تو نہیں کرتا؟ کسی غیر عورت کے پاس تو نہیں جاتا؟؟ بس میرے نفسانی جذبات کی اسی طرح تسکین ہوتی ہے۔''

اور روزی چپ سادھ لیتی۔ کچھ دنوں سے اس پر ایک نئی دھن سوار تھی۔ اور وہ اپنی اس طلب کو پورا کرنے کے لئے نئی ترکیبیں آزمانے لگا تھا۔ روزی بھی ایک عورت تھی اور دوسری ساری عورتوں کی طرح

اپنے شوہر کا ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی دیتی تھی۔ مگر اکثر الجھن کا شکار رہتی۔ معلوم نہیں یہ مشرقی عورت کے خمیر میں شوہر سے وفاداری کا عنصر اتنا نمایاں اور مضبوط کیوں ہے؟ وہ سوچتی۔ شاید یہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے کہ عورت جتنی بھی آزاد خیال یا ماڈرن ہو جائے، شوہر کو کسی نہ کسی صورت میں اپنا دیوتا مانتی ہے۔ ایک جھٹکے سے روزی اپنے خیالوں سے باہر آ گئی۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ شاید لائیٹ چلی گئی تھی۔ اے۔ سی۔ کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ لو ایک اور مصیبت.!!. جلدی میں کمال بیک اپ سسٹم کو سٹارٹ کرنا بھول گیا تھا۔ فارم ہاؤس سارا ہفتہ تو خالی رہتا تھا۔ بس ایک ملازم دیکھ بھال کے لئے رکھا ہوا تھا جو آج چھٹی پر تھا۔ یہ کمرہ کچھ ہی دیر میں تپتا ہوا تندور بن جائے گا۔ ہر طرف سے بند ہونے کی وجہ سے حبس بھی بڑھ جائے گا۔ یہ سوچ کر ہی روزی کو جھرجھری آ گئی۔ ایسی حالت میں وہ کیا کرے گی۔ اس نے اِدھر اُدھر ہلنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ آج صبح سے ہی اتنی گرمی تھی اور لنچ کے بعد گھر سے نکلتے ہوئے اپنے جوبن پر تھی۔ ارادہ تو سویرے ہی جانے کا تھا کیوں کہ یہ جگہ شہر سے پانچ گھنٹے کی ڈرائیو پر تھی۔ مگر ویک اینڈ پر اٹھتے اُٹھتے دیر ہو گئی تھی۔ راستے میں اتنا رش بھی نہیں تھا سفر کے دوران روزی نے پھر سے وہی بات چھیڑ دی تھی جس سے کمال کو چڑ تھی۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ ایک تو گرمی اور پھر یہ باتیں!

''آخر تم کیا چاہتی ہو روزی؟'' اس نے غصے سے سوال کیا۔

''میں یہ چاہتی ہوں کہ یوں بھاگ بھاگ کر ادھر جانے کی بجائے ہم ساحل سمندر پر بھی تو جا سکتے تھے نا۔''

''یہاں کیا برائی ہے؟'' وہ جز بز ہو کر بولا۔

''کوئی برائی نہیں۔'' روزی نے ہونٹ سکیڑ کر جواب دیا۔

''یار کہیں اور اتنی خاموشی اور پرائیوسی نہیں ملے گی؟ بھاڑ کرو نا بات کو۔'' کمال نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم ہر بار اپنی مرضی کرتے ہو۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''اچھا بھئی اچھا۔ اگلی بار آپ کی مانی جائے گی! اب خوش؟'' کمال نے خوش دلی سے جواب دیا۔

وہ اس ویک اینڈ کو بحث میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ روزی نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ باقی کا سفر سکون سے گزر گیا تھا۔ وہ پانچ بجے فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔

روزی کو شدید پیاس لگ رہی تھی اور اسی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں شدید گرمی تھی۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سائڈ ٹیبل پر رکھے گلاس تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ کو موڑ کر سیدھی طرف کروٹ بدل کر بھی اس کے ہاتھ کی انگلیاں گلاس تک نہیں پہنچ رہی تھیں..... ہاں.....!! تو وہ کہاں تھی.....؟

وہ فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔کمال نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور باہر نکل کر ڈکی میں سے سامان نکالنے لگا۔روزی جلدی سے صدر دروازہ کھول کر اندر مین ہال میں آ گئی تھی۔تھوڑی ہی دیر بعد کمال گاڑی لاک کر کے اندر آیا اور اس نے سیدھا کمرے کا رخ کیا۔اے۔سی۔اون کیا تا کہ گرمی کی حدت میں کمی ہو۔وہ بھی ساتھ ہی اندر آئی تھی۔کمال کی قمیص پسینے سے تر بتر تھی مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔اسے نے روزی کو فوراً ہی بانہوں میں بھر لیا۔وہ تھوڑا سا کسمسائی۔

''کیا کرتے ہو؟ سانس تو لینے دو۔''

''ارے ڈارلنگ آپ کی سانسیں جب ہماری سانسوں میں ملیں گی تب ہمیں چین آے گا۔'' کمال نے پیار سے روزی کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

وہ روزی کو بیڈ تک لایا اور پھر دھیرے سے لٹا دیا۔نا جانے کہاں سے ایک ہتھکڑی کی جوڑی لے آیا تھا۔اپنی پتلون کی جیب سے نکال کر اسے دکھائی۔

''یہ کیا ہے کمال؟'' روزی نے پوچھا۔

''یہ ہمارا نیا داؤ ہے روزی ڈارلنگ۔'' وہ مسکراتے ہوے بولا۔

''لیکن.....لیکن.....روزی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں بس چپ۔'' وہ اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

روزی کے ایک ہاتھ کی کلائی کو بیڈ کی ایک پوسٹ سے اور دوسری کو دوسری پوسٹ سے باندھ دیا۔دھیرے دھیرے کمال پر دوں میں چھپی لذتوں کو ٹٹول رہا تھا۔ہاتھوں کے لمس سے ان کو سہلا رہا تھا۔ ہیجان بڑھتا جا رہا تھا اور حواس قابو میں رکھنا ناممکن ہو رہا تھا.....ان کی سانسوں کے مدوجزر میں ایک طغیانی آ چکی تھی.....وہ آج بہت زیادہ ہی جوشیلا ہو رہا تھا۔اتنی دیر میں وہ روزی اور خود کو بے لباس کر چکا تھا .....اس کی سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی۔جسم سے پسینہ پانی کی طرح بہے جا رہا تھا مگر وہ مگن تھا۔اس لذت کو کشید کرنے میں جس کا وہ رسیا تھا،جس کا اس کو جنون تھا۔

اچانک کمال کے بھاری بھرکم جسم کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔وہ گھٹنوں کے بل بیڈ پر بیٹھا تھا،تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ہونٹ نیلے ہو گئے اور منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں۔اس نے ایک ہاتھ سے دل کو تھام رکھا تھا اور مشکل سے سانس لے رہا تھا۔چہرے کی تمام نسیں شدید تناؤ کا شکار تھیں۔اس کی آنکھوں کی پتلیاں دہشت سے پھیل گئی تھیں۔چہرے کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا اور ہونٹ دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں .....اور.....اور پھر وہ کھڑے قد سے بیڈ سے گر کر اُلٹی جانب لڑھک گیا۔کچھ دیر تک قالین پر اس کے بدن نے وقفہ وقفہ سے جھٹکے کھائے اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔روزی کی فوری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے؟ وہ چیخ چیخ کر کمال کو پکارتی رہی۔اس سے پوچھتی رہی کہ اسے بتاتے

وہ کیا کرے؟ مگر وہ مر چکا تھا۔روزی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمال کے مردہ وجود کو دیکھ رہی تھی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحے پہلے تک جیتا جاگتا شخص اتنی آسانی سے موت کے منہ میں چلا جائے گا.....کمال اپنے کھیل کی یہ بازی کھیلے بنا ہی دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔روزی کو رونا آ رہا تھا۔اسے احساس تھا کہ چند ہی گھنٹوں میں یہاں اندھیرا پھیل جائے گا۔یہ جلتا ہوا کمرہ اس کی بھی قبر بن جائے گا۔اگر وہ آنے والے دو گھنٹے تک یہاں سے آزاد نہ ہوئی تو وہ بھی!!نہیں نہیں۔میں مرنا نہیں چاہتی۔مگر اس حالت میں میں کسی کو کیسے بلاؤں اس نے ایک نظر کمال کی لاش پر ڈالی.....!یہ مجھے کس مشکل میں ڈال دیا تم نے کمال۔

اس کے اندر اپنی بقا کی جنگ چھڑ گئی تھی اور کشمکش جاری تھی.....!اگلے ہی لمحے وہ اپنی برہنگی کی پروا کیے بغیر پوری قوت سے چلائی۔

''کوئی ہے؟ کوئی ہے؟''

اس نے دروازے کی طرف دیکھا پھر کھڑکی کی طرف.....کمال کا ٹھنڈا جسم ساکت پڑا تھا.....وہ اسکی طرف دیکھ کر بولی۔

''کمال.....اُٹھو کمال۔'' اس کی آواز میں بے بسی تھی۔اس نے اسی بے بسی کے ساتھ پھر کہا۔

''اُٹھو کمال.....'' آواز میں تلخی آئی۔

''اُٹھو کمال.....اُٹھو.....کمینے.....کم ذات.....خود مر کر مجھے کس جہنم میں جھونک کر جا رہے ہو؟ اُٹھو.....'' سسکیوں میں ڈوبی یہ آواز اسی تاریک کمرے میں گونج کر رہ گئی۔

◀◀ ● ▶▶

Rue de la station..188,
1410 waterloo, Belgium
0032025391745

اقبال حسن آزاد کا تیسرا افسانوی مجموعہ

پورٹریٹ

عنقریب منظر عام پر

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ، مونگیر

● نوشابہ خاتون

انجام کار

کہتے ہیں زر زمین اور زن یہ تین چیزیں مصیبتوں کی جڑ ہوتی ہیں۔ یہ اچھے خاصے انسان کو پاگل بنا دیتی ہیں۔ اسے بھی ان ہی تجربوں سے گزرنا پڑا تھا۔ شبانہ جب اس گھر میں آئی تھی تو ایک سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ بھلے ہی اونچے خاندان، اونچی سوسائٹی کی نہ ہو۔ وہ بھی کون سا زمیندار اور اونچے اسٹیٹس والا تھا۔ البتہ خاندان میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جن کا معیار زندگی اعلیٰ تھا اور فی زمانہ بیشتر لوگ ایسی ہی پرکشش زندگی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ مقابلے کی دوڑ میں ہر کوئی آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ شبانہ بھی اسی رنگ میں دھیرے دھیرے رنگتی چلی گئی۔ اعلیٰ رہائش، آسائش، ساز وسامان اور عمدہ پوشاک اس کی کمزوری بنتے گئے۔ بیرون ملک سے آنے والوں کے ٹھاٹ باٹ اس کے شوق کو اور بھی ہوا دینے لگے۔ دل میں خوب سے خوب تر کی طلب اور تڑپ ہل چل مچاتی رہتی۔ اماں کی زیرک اور تجربہ کار نظروں سے اس کے دل میں مچلتی ہوئی تمنائیں پوشیدہ نہ رہ سکیں تو ایک دن انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا۔

''بیٹا! تو بھی باہر جانے کی کوشش کیوں نہیں کرتا؟''

''ہم یہاں کیا برے ہیں امی؟ ترنوالہ نہیں کھاتے لیکن دال روٹی میں تو خوش ہیں۔ آپ کیا چاہتی ہیں کہ اس عمر میں میں آپ لوگوں کو بے سہارا چھوڑ کر چلا جاؤں؟ نہیں امی میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا۔''

شبانہ نے شوہر کے آخری جملے پر ناگواری سے منہ بنایا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

''ہونہہ! وہ لوگ جو باہر جاتے ہیں جیسے ان کے ماں باپ نہیں ہوتے۔ یہاں ترنوالہ کا تو تصور بھی نہیں۔ کبھی کبھی تو دال روٹی کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی ایک ایک چیز کے لئے ترستا رہے۔''

اس کے دل میں خواہشات کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ صبح سے شام تک ہزاروں خواہشوں کو وہ اپنے دل کی قبر میں دفن کرتی رہتی اور رات کو اس قبر پر بیٹھ کر آنسو بہاتی۔

دل میں موجزن یہ خواہشیں کبھی آنکھوں سے جھلکتیں، کبھی لبوں پر آجاتیں اور پھر اس کے سامنے مسائل کے انبار لگ جاتے۔ وسائل کی کمی کا رونا روتی، خود پر ترس کھاتی، دوسروں پر رشک کرتی اور اپنے شوہر کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ ان لوگوں کی زندگی جس طرح گزر رہی ہے وہ خوش کن تو کیا اطمینان بخش بھی نہیں ہے۔

اس کی باتیں سن کر وہ دل مسوس کر رہ جاتا اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔

ایک دن جب وہ آفس سے آیا تو بڑا اکسائٹڈ تھا۔

''شبانہ کہاں ہو بھئی! جلدی تیار ہو جاؤ ابھی ہمیں ایک پارٹی میں چلنا ہے۔''

لیکن شبانہ کے چہرے پر خوشی کی کوئی جھلک نہ اُبھری۔ اس کا چہرہ بدستور سپاٹ ہی رہا۔

''آپ چلے جائیے۔ مجھے نہیں جانا۔''

''کیوں؟''

''کہیں جانے کے لائق نہ میرے پاس پوشاک ہے اور نہ زیور۔''

''کیوں اتنے سارے کپڑے جو تمہارے پاس تھے وہ کیا ہوئے۔''

''وہ سب آؤٹ ڈیٹیڈ ہیں۔''

اس کا سارا جوش وخروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور دل میں اٹھنے والی خوشی کی ہلکی سی ہمک پل بھر میں اس طرح دم توڑ گئی جیسے کوئی کمزور سی لہر ساحل سمند پر آنے سے پہلی دم توڑ دیتی ہے۔

رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو سوچتے سوچتے اس کا ذہن بری طرح تھک جاتا۔ کبھی وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا کہ شبانہ جیسی خوبصورت اور پیاری لڑکی اس کی ہم سفر بنی تھی اور دوسرے پل افسردہ ہو جاتا کہ اس کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ وہ اپنی بیوی کے لئے معمولی خوشیاں بھی فراہم نہیں کر سکتا۔ اب وہ اس سے نظریں چُرانے لگا تھا کیونکہ وہ خود کو ایک مجرم سمجھتا تھا۔ اس خلش اور اس دکھ نے آخر اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اپنے لئے نہ سہی اوروں کے لئے اُسے آگے قدم بڑھانا ہی پڑے گا۔ اس نے کئی جگہ اپلائی کیا، انٹرویو دیئے اور آخر کار دبئی کی ایک فرم میں دو سال کا کانٹریکٹ مل گیا۔

وطن چھوڑتے وقت وہ بہت ملول تھا کہ ہزار کمیوں کے باوجود اسے اپنا وطن بہت عزیز تھا۔ اپنی زبان، اپنی گنگا جمنی تہذیب بہت ہی پیاری تھی۔ لیکن دوسری جانب اس لئے خوشی تھی کہ اب معیار زندگی کے بہتر بننے کے لئے یہ ایک مناسب صورت نکل آئے گی۔

اسے دوبئی آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک دن شبانہ کے فون سے اسے یہ خبر ملی کہ ابا کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اور انہیں ہاسپٹلائز کرنا پڑا ہے تو وہ بے چین ہو گیا۔ اسے لگا کہ اسے پنکھ لگ جائیں اور وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے لیکن وہ اڑنے سے قاصر تھا کیونکہ موہ مایا کے جال میں پھنس کر اب وہ ایک ایسا پرندہ بن گیا تھا جس کے پر کاٹ کر پرواز کی طاقت چھین لی گئی تھی۔ وہ گھنٹوں کھڑکی کے سامنے کھڑا ان چڑیوں کو دیکھتا رہتا جو پھدک پھدک کر کبھی اس ڈال پر جاتیں کبھی اس ڈال پر۔ کتنی آزاد اور بے فکر تھیں وہ۔ نہ دولت کی ہوس نہ رزق جمع کرنے کی فکر، نہ کسی کی ہم سری نہ کسی سے مقابلہ اور نہ جاہ وحشمت کی نمائش کا خیال۔ اسے چڑیوں پر رشک آتا۔

کسی طرح دو سال گزار کر جب وہ وطن آیا تو گھر کی خوشحالی اور گھر والوں کے چہرے پر رونق

دیکھ کر اس نے سوچا اس کا یہ دو سال کا بن باس رائیگاں نہیں گیا۔ چھٹی کی معیاد پوری ہونے کے بعد جب وہ واپس جانے لگا تو ماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب کب آؤ گے؟''

''اب تو بہت جلد میں فیملی ویزا نکلوالوں گا۔ پھر جلد ہی انشاءاللہ آپ لوگ میرے ساتھ ہوں گی۔''

ایک موہوم سی امید کے ساتھ اماں دھیرے سے مسکرادیں۔ دبئی پہنچتے ہی فیملی ویزا کے لئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور جلد ہی ایک خطیر رقم دے کر ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

جب ویزا ہاتھ میں آیا تو اماں کا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

اس نے سوچا ایک ساتھ سب کو بلانا تو ممکن نہیں۔ ابھی شبانہ کو بلوالیتا ہوں۔ پھر اماں ابا کا ویزا نکلواؤں گا۔ شبانہ جب دوبئی پہنچی تو اسے ایسا لگا کہ صحرا کے سفر میں اچانک گلستاں آ گیا ہو۔ یہاں جب وہ پہلی بار ایک دعوت میں گئی تو گھر کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پورا ویلا ایرکنڈیشنڈ تھا۔ جگہ جگہ چینی کے گملے میں موسمی پھول بڑے خوشنما لگ رہے تھے۔ نادر و نایاب ڈیکوریشن پیس، ایرانی قالین، ریشمی پردے، شیشے کے کواڑ جس پر جھلملاتی ہوئی برقی قمقموں کی لڑیوں سے آراستہ ڈرائنگ روم۔ وہ اس طلسم میں کھو گئی جو کبھی بچپن میں دادی اماں راجہ رانی کی کہانیوں میں اسے سنایا کرتی تھیں۔ جب کبھی سیر و تفریح کے لئے جاتی تو ایک سے بڑھ کر ایک عجوبہ، خوبصورت منظر سامنے ہوتا۔ چوڑی چوڑی صاف و شفاف سڑکیں، عالیشان عمارتیں، شیشے کی طرح چمکیلے شاپ اور مال (Mall) دیکھ کر وہ مبہوت سی رہ جاتی۔ اسے ایسا لگتا جیسے اب تک وہ کسی تہہ خانے میں پڑی تھی۔ اتنی خوبصورت دنیا کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ اور نہ کبھی خواب میں دیکھا تھا۔

دکانوں میں سجی امپورٹیڈ بیش بہا اشیاء اور جوئلری کو وہ ستائشی اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی۔ اس کا جی چاہتا کہ اس کے پرس میں اتنے سارے پیسے ہوں کہ وہ بھی اوروں کی طرح دل کھول کر شاپنگ کرے۔ سڑکوں پر دوڑتی بھاگتی، چمچماتی گاڑیوں پر بیٹھے لوگوں کو رشک سے دیکھتی۔ اس کا جی چاہتا وہ بھی ایسی ہی گاڑیوں پر بیٹھ کر پورے شہر کی سیر کرے۔ مگر اس کا دل مایوسیوں سے بھرنے لگا۔ دھیرے دھیرے ساری چمک دمک ماند پڑنے لگی۔ اب جب بھی وہ کبھی تفریح کے لئے یا کسی دعوت میں جاتی تو دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر آتی۔ اوروں کے گھر سے اپنے گھر کا موازنہ کرتی تو احساس کمتری میں ڈوب جاتی۔ دل اندر سے بجھ جاتا۔

اور ایک دن جب اس نے ایک برتھ ڈے پارٹی میں جانے سے انکار کر دیا تو اس کے شوہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب کیا ہوا؟ تم تو ہر پارٹی میں بڑے شوق سے جایا کرتی تھیں۔ بلکہ خبر سنتے ہی تیاریاں شروع کر دیتی تھیں۔''

''اب مجھے یہ سب اچھے نہیں لگتا۔ دوستی برابر والوں سے ہی جچتی ہے۔''

''یہ تمہارا کمپلکس آخر کب تمہارا پیچھا چھوڑے گا؟''

پھر اس کی زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بہت ہی ڈسٹرب ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے وہ کون سا قدم اٹھائے۔

وہ جس کمپنی میں کام کرتا تھا وہاں اضافی آمدنی کے بہت مواقع تھے جس سے وہ ہمیشہ بچتا رہا تھا۔ اس نے بھول کر بھی اُدھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے مات کھا جاتا ہے۔ ایک اولاد کی محبت اور دوسرے بیوی کے نخروں سے۔ وہ بھی مات کھا گیا۔

اور پھر وہ دھیرے دھیرے اس راستے پر چل نکلا جس پر قدم رکھنے سے پہلے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر نفس کا غلام بننا پڑتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساری چیزیں مہیا ہوگئیں جو نفس کی آسودگی اور دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے کافی تھیں۔

جب شبانہ وہ پہلی بار اپنی ایرکنڈیشن امپورٹیڈ کار میں بیٹھی تو فخر سے اس کا سینہ پھول رہا تھا۔ موافق ہوا نے شوق کی چنگاری اور بھڑکا دی تھی۔

ایک دن وہ بڑی لگاوٹ سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تو اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ کہنا ہے کیا؟''

''ہاں! مسز آصف بتا رہی تھیں کہ جوئلری شاپ میں سیل (Sale) لگا ہے۔''

''تو.....؟''

''تو چل کر دیکھا جائے۔''

اس نے سوچا شبانہ کی برتھ ڈے پر کبھی اس نے کوئی قیمتی تحفہ نہیں دیا ہے۔ اس دفعہ زیور ہی کیوں نہ گفٹ کر دے۔ جو ہار اس نے پسند کیا وہ بہت قیمتی تھا لیکن شبانہ کی خوشی اور مسکراہٹ سے زیادہ قیمتی نہ تھا۔ جب اس نے ہار پہنا تو پھولے نہ سما رہی تھی۔ قد آدم آئینہ کے سامنے زاویہ بدل بدل کر اپنے گلے میں جھلملاتے ہوئے ہیرے کے ہار کو پرشوق نظروں سے تک رہی تھی۔ لیکن اسکی خوشی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔

جرم چاہے سات پردوں میں چھپ کر کیوں نہ کیا جائے۔ ایک نہ ایک دن عیاں ہو ہی جاتا ہے۔ وہ بھی اس عتاب سے بچ نہ سکا۔ اور کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر اس کا دامن تار تار ہوگیا۔ اسے صرف کمپنی نہیں بلک دبئی بھی چھوڑ دینا پڑا۔

وہ کئی سال پہلے جہاں تھا آج ایک بار پھر اپنی زخمی اور آلودہ روح کے ساتھ اسی مقام پر کھڑا تھا اور شبانہ کو اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

406-Lochan enclave
Kankar Bagh, Patna-800020

● ممتاز رفیق

رسیلے کٹیلے.....احمد عمر شریف

''اے میاں، کنویں کے مینڈک! تم آخر ہو کس ہوا میں، شہر کے باہر تمہیں پوچھے گا کون؟ خاکے میں یہ سکت کہاں کہ لامکان ہو سکے۔ بھائی خاکہ دائرے میں بند تخلیق کا نام ہے۔'' یہ احسن سلیم تھے جو خاکہ نگار کے یومِ مذمت میں بڑھ چڑھ کے بڑکیں لگا رہے تھے۔ ملامتی دُوم خاکے سے بڑھ کر خاکہ نگار سے بدکے ہوئے تھے، اُکھڑے ہوئے آہنگ میں فرمایا۔

''تمہارے کھاتے میں اپنے کتنے ہی ممدوحین کی اعصاب شکنی درج ہے۔ تم پہ لازم ہے کہ اپنی چال پر پہرے بٹھاؤ، ورنہ لفظ کی قیامت خیزی کسی دن تمہیں بھی تمام کر سکتی ہے۔'' میرے محتسب کے کہے میں ایسا کچھ نیا پن نہیں تھا، جس کا جواب ضروری ہوتا۔ رہے احسن سلیم تو اُن کی جدّت طرازیوں پر کون بند باندھ سکتا ہے؟ وہ تو گیت کو بھی مردہ صنف قرار دے چکے ہیں۔ آدمی اگر اپنی مٹّی سے نامانوس ہو جائے تو اُس کے لڑکھڑانے پر حیرت کیسی؟ ایسی اونچ نیچ تو جھیلنی ہی پڑتی ہے۔ خاکہ نگار نے بے مزا ہوئے بغیر سوال اُچھالا۔

''آپ صاحبانِ دانش احمد عمر شریف کی گیت نگاری کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟'' سوال کے جواب میں لمحاتی سناٹا نہایت سنگین تھا۔ آخر فراست رضوی کو اپنے کلام کی شعبدے بازی کی سوجھی۔

''دانش عمر ایک عظیم گیت نگار ہیں۔'' عظمت کے اس اعتراف کے عقب میں ایک بے آواز تمسخرانہ قہقہہ اور بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ایک مسکراتی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ احسن سلیم کو ناوقت ایک لطیفے کی سوجھی۔ ایک بچّہ جوش و خروش سے گھر والوں کو دوڑ میں اپنے اوّل آنے کی کہانی سنا رہا تھا۔ بڑوں کی تفصیل طلبی پر چھوٹے نے بتایا کے وہ دوڑ کا واحد شریک تھا۔ گویا ملامتی اوّل کا پورا زور بچّے کی تنہا دوڑ پر تھا۔ ابہام کو دور کرنے کے لیے مکّاری از بس ضروری تھی۔ جواب میں اس لطیفے کا کارن؟ خاکہ نگار کی معصومیت دیدنی تھی۔

احسن سلیم نے مخصوص تمسخر سے سوال داغا۔

''آج اور کون گیت لکھ رہا ہے؟'' فراست رضوی میں یہ یارا کب تھا کہ کوئی اور بازی لے جائے، ترنت گویا ہوئے۔

''ہندوستان میں کوئی ڈھائی سو گیت نگار ہوں گے۔'' خاکہ نگار کا ذہن اچانک ایک جھپاکے کے ساتھ فلیش بیک میں چلا گیا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ کوئٹہ عنابی کے سامنے ایک لال موٹر آ کر رکی۔ ونڈ اسکرین کے اُس پار دو چہرے جھلملائے۔ ایک طرف سے احسن سلیم اور دوسری طرف سے ایک سرخ و سفید بڑے ٹھسّے کا گول مٹول اُترا۔ اجنبی نے اپنے بچے کھچے بال اہتمام سے پیچھے کو اُلٹا رکھے تھے۔ وہ موٹر سے اُتر کر جس آن بان سے چلتا ہوا چائے خانے کی میز تک آیا تھا، اس سے لگتا تھا کہ وہ اپنے ہر قدم سے کتنے ہی لوگوں کا اعتماد کچلنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اُس کے اہتمامِ ملبوس سے ظاہر تھا کہ یہ آدمی اپنے شخصی کروفر کو بڑی تک و دو سے تشکیل دینے کا عادی ہے۔ اس پکی عمر میں بھی اُس نے اپنے مہکتے دنوں کا کچا پن سنبھال رکھا تھا۔ وہ جس طور نشست پر ڈھ سا گیا تھا یہ انداز بتاتا تھا کہ یہ مردِ متمول نہایت تساہل پسند واقع ہوا ہے۔ اُس کی ذات میں ایک الگ قسم کی دلبری اور محبوبیت جیسے گندھی ہوئی تھیں۔ یہ آدمی اپنی اُٹھان کے دنوں میں بڑا سوا سیر رہا ہوگا۔ خاکہ نگار کا رشک کچھ بے جا نہیں تھا۔

''یہ احمد عمر شریف ہیں، ایک بہت اچھے گیت نگار۔'' احسن سلیم نے مکھن سے لتھڑے لہجے میں رسمِ تعارف نمٹائی۔ یہ پہلی بات تھی جس نے خاکہ نگار میں اس آدمی کے لئے دلچسپی کا سامان کیا۔ اِدھر احسن سلیم اپنی لن ترانیوں کا آغاز کر چکے تھے۔ اجنبی کے لیے احسن کے لہجے اور رویے کا احترام ثابت کر رہا تھا کہ میرا ممدوح انسانوں کو اُن کی جگہ پر رکھنے کا ہنر خوب جانتا ہے۔ احمد عمر شریف ٹھہرے ہوئے لہجے میں جس شائستگی سے گفتگو کر رہا تھا، اُس پر اُچکے ہوئے سلیقے کا گمان گزرتا تھا۔ جانے کیوں مجھے یاد آیا کہ آج کی تمام گفتگو میں احسن سلیم نے اب تک کسی کے پرزے نہیں اُڑائے تھے۔ ہم سب کچھ دیر بیٹھے ادھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔ عمر شریف سے اس پہلی ملاقات کا تاثر کچھ اتنا شان دار نہیں رہا تھا۔ شاید پہلی نظر کے اندازے اس قدر موثر بھی نہیں ہوتے۔

پھر جانے ایسا کیا ہوا کہ رابطے کی یہ زنجیر دراز ہوتی چلی گئی۔ اس آدمی میں یقیناً کوئی اَن کہی تھی جو خاکہ نگار کو مسلسل اُسے کریدنے پر اکسا رہی تھی۔ اگر آدمی کسی کی کھوج میں جٹ جائے تو وہ اپنے ہدف کو پاتال میں سے بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ خاکہ نگار کی نگاہ تو ایک ایسے گیت نگار پر تھی، جو سولہ سنگھار کئے اپنے تماشائی کا مشتاق پھرا کرتا ہے۔ اب کوئٹہ عنابی میں دو دیوانے اکثر کسی میز پر بیٹھے ایک دوسرے کو جانچتے تولتے نظر آتے۔

احمد عمر شریف ایک وجیہہ اور جامہ زیب آدمی ہے۔ جسے چونچلّی بے نیازی اور کچا پکا بڑا پن جیسے ہمہ وقت اپنے گھیرے میں لئے رہتے ہیں۔ ٹونک کا یہ خان زادہ اپنے مزاج میں تیز سہی لیکن اُس کی زبان میں اپنے دیس کے خربوزوں ایسی مٹھاس ہے۔ وہ ماضی سے جڑی زندگی کا گرفتار دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے کشادہ ماتھے پر دمکتی کسی دیرینہ چوٹ کے نشان کے نیچے آنکھوں کے راکھ ہوتے ہوئے رنگوں میں ایسا خمار تھا جو شراب کو پانی کئے بنا پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی آنکھ بیک وقت تین طرح کا تاثر دینے پر قدرت نہیں رکھتی، لیکن گیت کے اس رنگ کار کی آنکھ نشیلی، بانکی اور بلا کی پینترے باز تھی۔ وہ لاکھ یاروں کا یار سہی لیکن اس نے نفرت میں محبت کی ملاوٹ کا فن سیکھ

کرنہ دیا۔مگرایسا بھی نہیں کہ اس کوتاہی نے اُسے یک وتنہا کردیا ہو۔وہ حسبِ ضرورت مسکرانا اور بدخیال لوگوں کو نمٹانا خوب جانتا ہے۔من موجی خان ذاتی معاملات میں کمال کا بے پرواہے۔آج کے کام کو کل پر ٹالنا تو جانئے، اس آدمی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔شناخت عام کرنے کی للک اپنی جگہ،لیکن اس جتن میں بھی اگر اَنا آڑے آتی ہو تو خان کو اس خسارے سے بھی انکار نہیں۔خاکہ نگار کو یہ وہم سا ہے جیسے یہ چھبیلا گیت کار ستاروں کی چھنگلیا تھام کر راستا سمیٹنے کا عادی رہا ہو،اور شاید اسی کھانچے سے ناکامی اُس پر ڈُورے ڈالنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ہار جیت کے چتون اکثر آدمی کو کھوئے ہوؤں کے اشتیاق میں در بدر کردیتے ہیں۔کیا عجب کہ خان نے بھی کسی ویرانے میں کوئی گوشہ ڈھونڈ نکالا ہو۔اُس کے گیتوں میں جا بجا اس بھید کا راستا چمکتا ہے،خان جس سطح کی باخبری میں ہے اُس کی برقراری اور بڑھاوے کے لیے بے خبری کا جتلاؤ گویا لازمی تقاضہ ہے۔

کوئٹہ عنابی پہ آن جان کا یہ میلہ اب کتنے ہی دن ہوئے کہ جما ہوا ہے۔آئے دن کی اس تکرار میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گیتوں کی سجیلی نار بھی اِدھر کا راستا بھول بیٹھتی ہے اور چائے خانے کی میز پر اٹکھلیاں کرتی، ناز نخرے دکھاتی نظر آتی ہے۔مٹّی سے بندھے رہنے کے دیوانے پن نے خان کے گیتوں کو مٹّی کی مہکار سے گویا مشک بار کردیا ہے۔

احمد عمر شریف کبھی بھی گیت خوانی کے اوتاولے پن میں سرپٹ نظر نہیں آیا۔ایسا بھی نہیں کہ انکار کا تکلف دکھاتا ہو۔ہاں سماعت کا معتبر ہونا ضروری سمجھئے۔خان کی بنت میں استقلال، احتیاط اور دھیما پن جیسے ایک لڑی کے موتی ہوں۔آدمی میں یہ خواوندھی سیدھی گزارے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔وہ گفتگو میں ہر لفظ گویا ترازو کے پلڑے سے اتار کے بیان کرنے پر بھروسا رکھتا ہے۔احمد عمر شریف نے جس حیلہ سازی سے خاکہ نگار کو اپنی ڈور میں کسا ہے، یہ مشاقی شطرنج کا اچھا شاطر ہوئے بنا آہی نہیں سکتی۔خان کی بھولی بھالی باتوں میں گھلی ہوش مندی دھیرے دھیرے خاکہ نگار ایسے اکھڑ کو بھی مزا دینے لگی تھی۔رابطے کی جَھٹ پھیری احتیاط کے باوصف کتنے ہی پردے کھینچ پھینکتی ہے۔

احمد عمر شریف ایسے خوددار خان زادے کا سپوت ہے، جس کے لالوکھیت میں قائم کچے گھر میں بھوک مدتوں مہمان رہی۔مہمان داری کی زندہ روایت نے اس گھر کے مقدّر کو جیسے اجال دیا۔بڑے خان کے سجدوں کی برکت اور دعاؤں میں اثر انگیزی گویا برق رفتار ہوگئی۔شکر گزاری اور راضی بہ رضا رہنے کی مشق نے اس طمانیت بھری زندگی کو ایسی روداد بنا دیا جس میں کتنے ہی پہلو رشک کے لاکھ سامان رکھتے تھے۔جناح کالج میں احمد عمر شریف اپنے ٹولے کا شاید سب سے زیادہ خستہ حال جوان تھا۔یہاں اُس کا شخصی رعب داب اور ہیکڑی اُسے نمایاں رکھے ہوئے تھی۔اپنی اٹھان کے ان دنوں میں چھوٹے خان نے ورثے میں ملی خودداری کا پرچم ہمیشہ سر بلند رکھا۔دراز قامت رکھنے والا یہ خوب رُو نوجوان پھٹی ہوئی جیب کے باوجود اپنی منڈلی کے اہم رکن کے مرتبے پر فائز رہا۔دراصل لہو میں دوڑتی وفا کیشی اور سرکشی سے ممیّز آدمی

کسی بھی قسم کی صورت حال میں الگ سے اپنی پہچان بنالیتا ہے۔چھوٹے خان کا دل ہمیشہ ماں کی دعاؤں اور دوستوں کی محبت سے خود کفیل رہتا۔وہ اپنے سنگتیوں کے قدموں سے قدم ملائے، جناح کالج سے الحسن کافی ہاؤس چلا آیا تھا۔اب زمین بھی بڑی حد تک اُس کا بوجھ سہارنے کی عادی ہو چلی تھی۔احمد عمر شریف کو نصیر ترابی کے سنگت میں شاعری کا عارضہ لاحق ہو چکا تھا۔جناح کالج کی کینٹین کے در و دیوار اُس کی کچّی پکّی غزلیں ایک زمانے تک بھگتاتے رہے تھے،لیکن یہ نہیں کہ اُس کا کہا صدا بہ صحرا ثابت ہوا ہو۔وہاں ایک آدمی ایسا ضرور تھا جسے اُن کی غزلوں نے اپنا اسیر کرلیا تھا۔وہ اُن کے مصرعے گنگناتا بلکہ عالمِ سرشاری میں باقاعدہ گایا کرتا تھا۔الحسن کافی ہاؤس پہنچنے تک عمر شریف کا مرض لا علاج ہو چکا تھا۔یہ الگ بات کہ غزل کے ساتھ احمد عمر شریف کی ہمرہی زندگی بھر کا سودا نہ بن سکی۔اُس نے رات دن کی قطار میں گیت کی الھڑ اوڑھنی اپنا ملبوس کرلی۔اس لباس میں خان کا جوبن کچھ ایسا نکھرا کہ اُس نے اسے گویا جزوِ بدن بنالیا اور پھر کرشن، عمر شریف کے من میں بانسری بجانے لگا۔لیکن ٹھہرئے!اس بیچ الحسن میں عمر شریف،نصیر کی منڈلی میں شامل نیّر سوز، نگار صہبائی، اطہر نفیس اور کتنے ہی دوسرے سرپھروں کے ساتھ ریاضت کا کشٹ بھی کاٹتا رہا تھا۔یہ ایک عجب درسگاہ تھی۔یہاں یہ سب بڑے چاؤ اور اہتمام سے اکٹھے ہوتے اور بھانت بھانت کے ناموروں کے بکھیرے ہیرے موتی چنا کرتے۔احمد عمر شریف کا نصیر ترابی سے معاملہ خاص سہی لیکن وہ آنکھ بچا کے نگار صہبائی کی دلبری بھی تاک جھانک لیا کرتا۔شاید اسی آنکھ مچولی نے وہ راہ سجھائی جس پر چل کے عمر شریف، نگار صہبائی کی طرح گیت کا قتیل ٹھہرا۔چاند سورج کی بھگدڑ میں جہاں بہت کچھ بھولا بسرا ہوا وہیں الحسن کافی ہاؤس میں بھی محض ایک کھٹی میٹھی یاد بن کے رہ گیا۔

وقت کی لپک جھپک کے باوجود خان کے من میں بانسری کی پرانی لے دھیمے سروں میں اپنی جگہ موجود تھی لیکن یہ پیٹ بڑا پاپی ہے۔عمر شریف کو زندگی کاٹنے کے لئے ایک نئ قسم کی رنگ کاری پر مجبور ہونا پڑا۔اُس نے جمع تفریق کے وظیفے کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں پھر اچانک ہی اُس کی رفتار میں ایسی تیزی آئی کے وہ قلانچیں بھرتا دکھائی دینے لگا۔اس سفر کے دوران اُس نے کتنی ہی اجنبی زمینوں پر مختلف رنگوں کی مٹّی کھنگالی۔کئی نامانوس زبانوں کی شیرنی اُس کی سماعتوں میں اتری۔وہ اپنی جھونک میں کتنی ہی پرائی زمینوں پر اپنا نقشِ قدم ثبت کرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔سچ ہے کہ پہیہ جب ایک بار گھوم جائے تو پھر شاید ایسا کچھ بھی نہیں رہ جاتا، جس کا ارمان دل کو اتھل پتھل کردے۔احمد عمر شریف جیسے وہ اسم جان گیا تھا جسے دہراتے ہی ہر دروازے کا وا ہو جانا جیسے لازم ہو جاتا ہے۔کامیابیوں کی یہ کتھا بظاہر بے حد حسین سہی،لیکن یہ اسی قدر مہلک اور جان لیوا بھی ہے۔اس جدو جہد نے احمد عمر شریف جیسے مضبوط اعصاب کے زیرک آدمی تک سے خون تھکوا دیا۔خوش آئند امر یہ تھا کہ اس سفر کے دوران اُس کے قدم کہیں ڈگمگائے نہیں ورنہ فتح مندی تو اچھے اچھوں کو بے تال کردیتی ہے۔ایسا ہونا شاید ممکن بھی نہیں تھا کیوں کہ یہ زوال

سے کمال کی جانب ایک جست تھی۔اصل میں سختی سہا ہوا آدمی نرمی بھی سہولت سے سہار جاتا ہے۔

دنیا داری کے اس ہیر پھیر میں جب کبھی بانسری کی لے تیزی پکڑتی تو عمر شریف سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کاغذ پر لفظ کاڑھنے بیٹھ جاتا۔ یہ گویا سر اور معنی کو یک جان کرنے کا مشغلہ تھا۔شاید اسی لئے سریلے خان کے گیتوں میں آٹھواں سر اپنی جھلکیاں دکھاتا نظر آتا ہے۔گیتوں کی یہ پھوار آئے دن کا سلسلہ نہیں تھا۔اب عمر شریف کی فراغت تنگ ہو چکی تھی۔اُس نے بہت مشقت سے اپنے اندر کے آسیب کو قابو کر لیا تھا۔اب تو بانسری کی آواز بھی جیسے اُس کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تھی۔

جب احمد عمر شریف خاکہ نگار سے معاملے میں آیا، اُس گھڑی تک وہ اپنے مقدّر کی کتنی ہی تپنگیں لوٹ چکا تھا۔اب ایسا کچھ بھی نہیں رہا تھا جس کی طلب آدمی کو بے آرام کر سکتی ہو۔مگر کیا کیجیے کہ آدمی میں شکر گزاری کا وصف، پھل کے رس کی طرح دھیرے دھیرے اپنا راستا بناتا ہے اور عمر شریف ٹھہرا ایک تخلیق کار۔اُس کی تخلیقات ہر آن اُس سے اپنا حقِ شناخت طلب کرتیں۔ پھر خالق کو بھی کتاب لائے بغیر اپنے ہونے کا اطمینان کیونکر حاصل ہو؟ خان کو بھی اس مسئلے کی چیستاں نے ایک زمانے تک پریشاں کئے رکھا۔اس دوران کئی بکھیڑے اور بھی تھے۔ملازمت کی ہیرا پھیریاں، بچّوں کو بدیس بھجوانے کے آنکڑے۔اس دھما چوکڑی میں ترجیحات اپنا آگا پیچھا بدلتی رہیں۔اس دوڑ بھاگ میں کتاب پسِ پشت جا پڑی تھی۔ایک دن اس معمول کے اوزان اچانک بدل گئے۔ مالک کے ماتھے کی غرّاتی لکیروں نے عمر شریف کا دل مالکان اور ملازمت سے اچاٹ کر دیا۔اُس نے لاکھ کی ڈھیری یوں ٹھکرا دی تھی جیسے وہ ٹکے کی ہانڈی ہو۔یہ جرأت رندانہ ایسی نہیں تھی کہ بس یک لخت آموجود ہوئی ہو۔اس کے اشارے کتنے ہی دن سے اپنے جلوے دکھا رہے تھے۔عمر شریف ہوش مندی سے آتے دنوں کی پیش بندی کرتا رہا تھا۔ بڑا بیٹا ڈاکٹری پڑھنے ولایت پہنچ چکا تھا۔منجھلا پرواز کے لئے پر سمیٹے بیٹھا تھا۔گھر میں آراستگی اور آسودگی کا دور دورہ تھا۔ عمر شریف نے گویا ٹھٹول کے لئے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔یہ میرے دوست کا معتبر اور مصروف رہنے کا نیا بہانہ تھا۔اس سمے کے آتے آتے عمر شریف کی خاکہ نگار سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔فراغت نے ملاقاتوں کے ناغے بھی کم کر دیئے۔کوئٹہ عنابی میں اب خان کے گیت آئے دن اٹھلاتے، اپنی چھب دکھلاتے دکھائی دیتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب احمد عمر شریف اپنے بھیتر بجنے والی بانسری کی سرمستی میں گم رہنے لگا تھا۔اُس کی گفتگو میں بابا بلھے شاہ، حضرت امیر خسرو اور اولیاء کرام کے تذکرے رہنے لگے تھے، پھر انگلیاں بھی مختلف نگینوں سے جگمگانے لگیں۔ ہاتھوں پیروں میں کڑے پڑ گئے۔قلب کی ڈانواں ڈولی نے جیسے احمد عمر شریف پر آگہی کا کوئی نیا در کھول دیا تھا۔اب وہ دنیا سے منہ پھیر کے رابطہ رکھنے کا چلن اختیار کر چکا تھا۔اُس کے باطن سے پھوٹنے والی سچائی نے سوچی سمجھی بے نیازی کو بے اختیاری کے سپرد کر دیا۔اس بدلے ہوئے آموختے کا تقاضہ تھا کہ وہ کاروبار سے ہاتھ اٹھالے اور ایسا ہوا بھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دفتر میں تالے پڑ

گئے۔اس بے کاری کے باوجود تشویش کا کوئی پہلو نہیں تھا کہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوا کرتا ہے۔عمر شریف کا کاروبار کیا تمام ہوا کہ جانیے اُس کا تو روپ رنگ ہی بدل گیا۔اُسے تو جیسے اپنے ارمان نکالنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔کتنے ہی کام تھے جنھیں وہ طاق نسیاں کے سپرد کر کے بھلائے بیٹھا تھا۔اب خواہشوں کی اک لنگار سر نکالے اُس کا منہ تکتی رہتی، لیکن اب عمر شریف حصولِ آرزو کے لیے ترکِ آرزو کا نکتہ جان چکا تھا۔وہ دامن جھٹک کے اپنے اصل اہداف کی جانب رواں دواں رہنے لگا۔گیتوں کی گہما گہمی میں اُس کی کتاب اب پہلی ترجیح کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔

ایک روز آلۂ سماعت پر عمر شریف نے جھلملاتی آواز میں 'گیتا گیت' کی اشاعت کا مژدا سنایا۔گیتوں کے اس مجموعے کی جس طور پذیرائی ہوئی، وہ عمر شریف کا حق ہونے کے باوجود حیرت کی بات تھی۔تخلیق سے عام بیزاری اور کالک پھرے ذوق کے اس دور میں ایک ادب پارے کا اعتراف اپنی جگہ نہایت اہم واقعہ تھا۔عمر شریف کے گیتوں کی گونج ارضِ پاک سے انگلستان تک سنائی دی۔

اب اور رکیا رہ گیا تھا جس کی احمد عمر شریف آرزو کر سکتا ہو؟ خاکہ نگار نے بشاشت سے سوچا.....لیکن کہاں! طلب کی تو جیسے ایک لڑی بندھی ہے۔ابھی ایک خواہش تکمیل نہیں پاتی کہ دوسری سر اُٹھائے آموجود ہوتی ہے اور ہر طلب ایسی خودسر اور نٹ کھٹ کے جب تک اُسے پورا نہ کر دیا جائے آدمی کو چین نہیں پڑتا۔اب عمر شریف دوسری کتاب کے پھیر میں پڑا ہوا ہے لیکن اب اس کے قلبِ ضعیف میں وہ پہلی ایسی بات کہاں؟ آدمی اپنی پہلی کوشش میں ہی اتنی جان مار دیتا ہے کہ دل ہار جائے، لیکن کسے معلوم کہ یہ سفر آغاز کرنے سے پہلے کی تھکن ہو؟

خاکہ نگار کو اس بدلے ہوئے منظر نامے میں کئی چیزیں آڑی ترچھی نظر آتی ہیں، مگر ممکن ہے کہ اس ٹیڑھ میں ہی سیدھ چھپی ہو۔اس میں بہر حال کوئی شک نہیں کے خان اپنی پٹڑی بدل چکا ہے۔اس سفر میں نکلنے والوں کی حیرت اُن کے ساتھیوں کے لئے بھی گم ہو جانے کے کئی سامان رکھتی ہے۔خاکہ نگار کے لئے بھی یہی مناسب ہے کہ اس کم کو کافی جانے اور اپنی راہ پکڑے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ لفظ کی ہلاکت خیزی واقعی اُس کا کام تمام کر دے۔

◀◀ ● ▶▶

FLAT NO.A-424,CASSIM COMPLEX,
BLOCK 18 GULISTAN E JOHER KARACHI PAKISTAN

● حبیب حق

جسے میر کہتے ہیں صاحبو!

ایک شام، کھانا کھانے کے بعد، جب اُن کے سر میں ہلکا ہلکا سا درد تھا (’کہیں زکام کی شروعات تو نہیں ہو رہی۔‘)، تو میر صاحب نے جولیا کے یہاں جانے کی سوچی۔ اکتوبر کا ماہ ختم ہو رہا تھا، درختوں کے تقریباً سارے پتّے پیلے پڑ کر گر چکے تھے۔ جاڑوں کی شروعات تھی۔ سنا تھا کہ اس سال سردی شدید پڑنے کے خدشات ہیں، اور میر صاحب اندر ہی اندر خوف زدہ ہو رہے تھے۔ اُنھیں سڑکوں پر جمی ہوئی برف پر کار چلانی سخت ناپسند تھی، اور جیسا کہ پرشوتّم کہا کرتا تھا۔ ’سالی گاڑی یوں قابو سے باہر ہو جاتی ہے، جیسے کہ ایک کتّا اُٹھان پر آئی ہوئی کُتیا کو دیکھ کر۔‘ تمام دن میر صاحب چند پرانی عربی کتابوں کے نسخوں کی فوٹو کاپیوں سے دست بدست رہے تھے، جو انھوں نے پیرس کی قومی لائبریری سے منگوائے تھے۔ ذہن تھک سا بھی گیا تھا اور تازہ دم بھی لگتا تھا (’کہیں اس کی وجہ سے ہی تو میری تکلیف نہیں؟‘) وہ جولیا کے دروازے تک پہنچے۔ ایک لمحہ کو ٹھٹکے۔ اور پھر کال بیل کو دبایا۔ ایک منٹ گزر گیا۔ دوسری بار وہ دبانے ہی جا رہے تھے کہ دروازہ کھلا، اور فریم میں لگی مس جولیا پیٹروسین کھڑی تھیں۔ دونوں کے لئے فردوس کسی کے ساتھ (وہی جیوش لڑکی؟..... اور کون ہو سکتی ہے۔) نیا گرافال دیکھنے گیا ہوا تھا۔

’یقیناً اُسی جیوش لڑکی کے ساتھ!‘

’آپ کیوں کر جانتے ہیں؟‘..... کیا فردوس نے.....؟،

’نہیں! دیکھنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔‘

’پہلیاں نہ بجھواؤ‘ میرا، ’ارے جناب‘ پہیلی تو آپ خود ہیں! اور خود ہی بجھا رہی ہیں۔‘ تیزی میں میر صاحب یہ کہہ تو گئے، پھر اُنھیں ذرا احساس ہوا، اور ایک ہلکی سی خفت۔ پر ایک دیوار گرانے کا احساس بھی۔

’دیکھئے، میر صاحب، میں آپ کے متعلق بہت دنوں سے غور کر رہی ہوں۔ یقن مانیے، میں بھی تھوڑا سا غور کر سکتی ہوں..... بہر حال، آپ آئیں، اور تشریف رکھیں۔ کافی پیئیں۔ پھر باتیں ہوں گی۔‘

تپائی پر ایک پتلی سی کتاب کھلی پڑی تھی۔ جولیا کافی بنانے گئی، تو اُنھوں نے کتاب اُٹھا کر دیکھا۔ جنسی معاملات پر ایک عام سی کتاب تھی، جو کہ کسی بھی کوئسک میں مل سکتی تھی، تصویروں سے مزّین۔ میر صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ جولیا کو اس کتاب کے پڑھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ شاید وقت گزاری کے

لئے اس سے اچھی کتابیں مل نہیں سکتی تھیں۔ تصویریں خاصی جان دار تھیں، جن میں لڑکے لڑکیاں مبارزت کے مختلف طریقوں میں مصروف دکھائی دیے گئے تھے۔ جولیا یوں آج کل بہت ہی سنجیدگی سے جرمن زبان کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ (’میں محض دو چار جملے بول لینے کے لئے اس زبان کو سیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں، اور اُنھیں سمجھنے کے لئے بھی۔‘) جب وہ کافی کے دو بڑے پیالے کر آئی، تو از راہ مذاق میر صاحب نے تقریباً آنکھیں میچتے ہوئے، اُس سے کہا۔

’ایسی کتابیں پڑھنے کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟..... آپ تو خود ان کتابوں سے زیادہ جانتی ہوں گی۔‘

’ہو سکتا ہے! آپ نے تو کبھی جاننے کی کوشش نہ کی ہوگی! علاوہ بریں، تجربات اور معلومات کو وسعت دینا تو کوئی غلط بات نہیں..... اور اگر آپ اس کتاب کو پڑھیں تو نت نئی باتیں معلوم ہوں گی۔‘

’مثلاً‘ [میر صاحب کی بھوری آنکھیں ذرا سی سیاہ پڑ گئیں تھیں، اور اُن میں دس سالہ بچے کی آنکھوں جیسی چمک تھی]،

’آپ خود پڑھ کر دیکھ لیں۔‘ [نیلی اور سبز آنکھیں خاموش تھیں، اور فردوس کے ونک کی آرزومند]

’نت نئی باتیں کون معلوم کرنا چاہتا ہے..... ہم تو بھئی، پرانی لکیر کے فقیر ہیں ہم تو پرانی باتیں ہی جاننا چاہتے ہیں۔ پرانے جو ہو چکے۔ محبت کے پرانے طریقے، محبت میں مبتلا ہونے کے راز محبت کو قائم رکھنے کے راز۔ اور سب سے بڑھ کر یہ جاننے کے لئے بے تاب کہ اگر کوئی لڑکی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے، تو کیوں کر اُس کی آنکھوں میں جھانک کر پتہ چل سکتا ہے کہ وہ دیوانی ہو رہی ہے۔‘

یہ سن کر جولیا نے صرف محظوظ ہوئی، بلکہ کھل کھلا کر ہنس پڑی، اور اُس کی آنکھیں پھیل سی گئیں، اور پوچھا۔

’میر صاحب، آپ کی پرانی دوست اب کیا آپ سے نہیں ملتی ہیں؟ پرانے طریقوں والی دوست؟‘

’اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ پرانی یا نئی سب کی سب دوست آپ ہی ہیں، تو کیا آپ یقین کریں گی؟‘

’یقین تو ہرگز نہیں کروں گی، لیکن میرا خیال ہے کہ ہم وہ دوست نہیں ہیں جس کا تذکرہ ہم فی الحال کر رہے ہیں۔‘

’بن سکتے ہیں، کیوں؟‘ [وہی دس سالہ بچے کی آرزو تھی، آنکھیں اُسی طرح معصوم تھیں]

’جی نہیں، شکریہ!..... میرے زخم، ابھی مندمل نہیں ہوئے ہیں۔‘

’ایرانی زخم؟ یا انگلستانی زخم؟‘ [میر صاحب کو نہ صرف جولیا کی جرأت پر رشک آیا، بلکہ اپنی پر بھی۔]

’ایران میں کسی لڑکے نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ جب میں انگلستان آئی تو لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر، اور اُن کے اختلاط پر غور کر تعجب تو ضرور ہوا تھا، جیسے کہ کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔‘

’لڑکا انگریز نہ تھا، میر صاحب۔ لڑکا سویت یونین کے جورجیا ریاست کا مسلمان تھا، جس نے اول مجھ سے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں باتیں کرنی شروع کیں تھیں، اور میں اُس کا جواب دیتی چلی گئی تھی..... اور

پھر اُس نے دھیرے دھیرے میرا دل جیت لیا۔ ایسا بانکا انسان ہے میر صاحب، کہ آپ دیکھتے رہ جائیں۔ نڈر اور لپک کر جام اُٹھا لینے والا۔ میں اکثر سوچتی تھی کیونکر ایسے لڑکے سویت یونین میں پیدا ہو سکتے ہیں، اور وہاں زندہ رہ سکتے ہیں۔ وہ تو آگ لگا دے، اور دم کے دم میں آگ بجھا دے۔ وہ تو آتی ہوئی ٹینک کے پہیوں تلے لیٹ جائے۔ گولیاں برساتی ہوئی بندوقوں کے سامنے مسکراتا ہوا کھڑا ہو جائے..... ایسے لوگ اب دنیا میں پیدا کہاں ہوتے ہیں؟ اور وہ جو رجیا جیسی جگہ پیدا ہو گیا، جس نے اسٹالسن کو پیدا کیا تھا.....'

'جولی، میں تمھارے زخم کریدنا نہیں چاہتا.....' [میر صاحب ایک قسم کی مشرقی ہیجان میں مبتلا ہو گئے تھے، جہاں حقائق پر پردے ڈالے رہنا تہذیب کے معیاروں میں سے ایک ہے۔]

'نہیں میر صاحب، آپ میرے زخم نہیں کرید رہے ہیں، اسے مندمل کرنے میں میری مدد کر رہے ہیں..... میں نے اُس کے ساتھ سارے لندن کے مشہور مقاموں کو دیکھا۔ کیا نہیں دیکھا ونڈسر جا کر شیرون کو دیکھا، بکنگھم پیلس کے باہر گھومے۔ گارڈوں کی وردیاں چھو کر دیکھیں، ہائیڈ پارک میں عورتوں کے ظلم کے خلاف ایک ٹالسٹائے قسم کے انسان کو بولتے سنا۔ ہر جگہ گئے۔ برٹش موزیم نے ہمارے حواس شل کر دیے..... ایک روز جب کہ ہم لوگ لندن کی بس کے اوپر کے حصہ میں بیٹھے چلے جا رہے تھے اور اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا، اور اس کی بہت ہی ہلکی آنکھیں ناچ رہی تھیں، تو اُس نے جھک کر مجھ سے کہا تھا کہ وہ اب تک جنسی طور پر کنوارا ہے، اور مجھ سے ہم بستر ہونا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کنوارگی کی بیماری صرف اسے لگی ہوئی ہے، اور میں اس سے پاک ہو چکی ہوں..... میر صاحب، جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، عبدالرحمٰن میرا دوست تھا..... جی ہاں، اس کا نام عبدالرحمٰن رشیدوف تھا۔ اور وہی وہ میرا دوست تھا جس سے میری ملاقات جنسی طور پر ہوئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم ملے اس لئے تھے کہ ہم مرد اور عورت تھے۔ وہ شاید مجھ سے ایک سال کے لگ بھگ بڑا تھا، لیکن میر صاحب، اُسکی اٹھان قابل رشک تھی۔ دُبلا پتلا شخص تھا، پر اُس کے بازو بھرے بھرے تھے اور سینہ چکلا تھا۔ وہ با آسانی وزنی سامان اٹھا لیتا تھا، او راکثر بڑے بڑے بالوں کو جھٹک کر کہا کرتا تھا کہ وہ سردیوں کے موسم میں، جب کہ کوموسوول کا کیمپ لگا کرتا تھا، برف پر ایک کمبل اوڑھ کر سو جایا کرتا تھا..... میں نے اب تک کسی بھی مرد کو جنسی اعتبار سے بوسہ نہیں دیا تھا، اور نہ ہم ایک دوسروں سے چپٹے تھے، ہم بستر ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ پہلے تو مجھے ایسا لگا کہ وہ محض مذاق کر رہا ہے۔ اور میں ہنس کر ٹال گئی۔ پر میر صاحب میرا دل اُس پر آ گیا تھا۔ اُس کی انگلیوں نے یوں میری انگلیوں کو دبوچ کر رکھا تھا کہ وہ بات جو وہ مجھے اپنی زبان سے نہیں کہہ پا رہا تھا، انگلیوں کی زبانیں کہہ رہی تھیں، اُس کے ہونٹوں کی ہلکی سی تبسم کہہ رہی تھی۔ اور میر صاحب، جوانی کچھ اسی چیز ہوتی ہے کہ اگر لڑکے اور لڑکیاں قریب آ جائیں تو پہلی چیز جو ذہن میں آتی ہے، وہ جنسی ملاپ کی تمنّا کی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب سے پہلے بڑھ کر اس دیوار کو جو فرد اور فرد کے درمیان کھڑی ہے، اُسے توڑ دیا جائے۔

دونوں ایک دوسرے کے جنسی اعضاء کا معائنہ کریں، اور اُنھیں کام میں لائیں..... میں کم از کم عورتوں کے متعلق تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہیں، گو ہم عورتوں میں قوتِ ارادی بہت ہی زبردست ہوتی ہے، اور یہ وہ قوت ہے جو ہمیں جنسی طور پر ہمہ وقت ملوّث ہونے سے روکتی ہے۔ آپ کسی عورت کو دیکھ لیں۔ اُس کے اندر بیسیوں بار مخصوص مردوں سے ہم آغوش ہونے کی تمنّا اُبھرے گی، لیکن وہ ملوّث ایک یا دو ہی سے ہو پائے گی۔ شاید یہ راز نسل کی سلامتی برقرار رکھنے کے لئے ہے، شاید کوئی اور ارتقائی کھیل کھیلا جا رہا ہے..... اب آپ خود کو دیکھیں، مجھے آپ سے تھوڑی سی محبت ضرور ہو چلی ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں، لیکن میں آپ سے جنسی اعتبار سے نزدیک ہونا نہیں چاہتی، کم از کم فی الحال.....'

جولیا زوروں سے ہنسنے لگی، اور اس ہنسی میں تھوڑی سی خفّت اور تھوڑی سی حیا بھی تھی۔ میر صاحب کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھرے۔ اُنھیں بھی خواہش..... یہ خواہش جسے جولیا صاف صاف لفظوں میں، جنسی ملاپ، کہہ رہی تھی، بے تاب سی کر رہی تھی، اور اُس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خواہش کہ اپنے جنسی کنوارے پن کو جولیا کے حوالے کر دیں۔ لیکن وہ جوش، وہ دیوانگی، وہ ایک قسم کی کم ظرفی جو اکثر زنا بالجبر کی سی چیز ہو جاتی ہے وہ اُن میں اب تک نمودار نہیں ہوئی تھی۔ میر صاحب شریف انسان تھے۔ مولوی صاحب کو خون اُن کی رگوں میں دوڑ رہا تھا، اور گو کہ اُن کے جدّ اعلیٰ حضرت علی نے کہا تھا کہ 'ہم عورتوں کے متوالوں میں سے ہیں۔' لیکن یہ متوالہ پن اُنھیں ذہنی طور پر کچوکے لگا رہا تھا، قوتِ تناسُل کے طور پر نہیں۔ اور پھر، جیسا کہ وہ سوال کرتے رہتے تھے۔ 'جنس ہے کیا؟' کم از کم جب سے وہ نیویارک آئے تھے اور لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے دیکھا تھا، جب سے یہ سوال اُنھیں پریشان کرتا آیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ بنیادی طور پر یہ ایک قوت ہے جو ذی جان ہستیوں کو اپنی نسل چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ لیکن جانوروں میں جنسی خواہشات ہر وقت زندہ رہتے نہیں رہتیں۔ اُن کا ایک وقت ہوتا ہے۔ انسانوں میں سیکس بنیادی طور پر مباشرت کرنے پر مجبور کرتی ہے، جنسی نشے کی جانب لے جاتی ہے، یہ کوئی ابراہیمؑ نہیں ہوتا جو آتش نمرود میں کود جانے پر تیار رہتا ہے، یہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا رشتہ شیطان سے قریب تر ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ اس نشے کے ذریعہ انسانوں نے نہ صرف خود کو اس سیارے پر زندہ رکھا ہے، بلکہ اس پر تقریباً پوری طرح قبضہ بھی کر رکھا ہے۔ میر صاحب خیال میں ایک شریف انسان کی ایک شریف معاشرے میں رہنے کی نشانی یہ ہے کہ وہ آگ میں کود پڑنے سے پہلے جنس مخالف کی رضامندی حاصل کر لیتا ہے، اور اگر زنا کا بھی ارتکاب کر رہا ہو تو یہ حرکت بالجبر نہیں ہوتی ہے۔ معاشرے کی روایات کا اس رضامندی کے حاصل کرنے میں، اور خود اس نشے کو تیز تر یا کم تر کرنے میں بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن، چاہے ہم کچھ بھی کہیں، بنیادی محرک وہی شئے ہوتی ہے جسے ہم سیکس کا نام دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں فرائڈ کو پڑھنا چاہتے تھے، لیکن بنیادی طور پر مذہب کے طالب علم ہوتے ہوئے اُنھوں نے فرائڈ سے زیادہ یونگ کو پڑھنا چاہا۔ ابھی تک

انھوں نے باقاعدہ طور پر اُسے پڑھانا شروع کر دیں گے..... جولیا چُپ ہوگئی تھی، ریڈیٹر ہلکی ہلکی آوزیں نکال رہا تھا، جیسے کسی کی دبی دبی سسکیاں نکل رہی ہوں، اُسکی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں، یہاں سے بہت دور، اور میر صاحب اُس کے لئے محض ایک ریکارڈنگ مشین بن کر رہ گئے تھے۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

ایک ہفتے تک عبدالرحمٰن مجھے پریشان کرتا رہا۔ پہلے تو میں ٹالتی گئی۔ کیونکہ اول تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں کر ایسی باتیں کر سکتا ہے۔ میر صاحب مجھے ابتداء میں کچھ ایسا لگا کہ ہماری محبت کچھ ایسی ہے جسے پلوٹونک کہتے ہیں، پھر میں دو تین دونوں تک اُس سے نہ ملی۔ وہ جب بھی میرے گھر آیا، میرے کہنے پر ہمارے بٹلر بہزاد نے اُسے یہ کہہ کر بھگا دیا کہ مِس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... اور وہ آرام کر رہی ہیں۔، میری بار بار یہ خواہش ہوئی کہ میں اُٹھ کر باہر آ جاؤں اور اُس کے گلے سے لگ جاؤں۔ لیکن اب مجھے اُس سے ذرا خوف سا آنے لگا تھا۔ دو تین دن یونہی گزر گئے۔ میں زیادہ تر بستر پر پڑی رہتی، یا ٹی، وی، دیکھا کرتی۔ اُس کے ساتھ بس کے اوپری حصہ پر لندن گھومنے کا سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا، اور اس کا اپنی نیلی نیلی آنکھیں جھپکا کر محبت کے آخری ترل تک پہنچنے کی آرزو۔ پھر اس کا ایک خط ملا۔ جو غلط سلط انگریزی میں لکھا گیا تھا، پر محبت کی بکواس سے پُر جملوں سے بھرا پڑا تھا۔ اب تک وہ خط میرے پاس ہے۔ اُس خط کا ایک ایک جملہ میرے دل پر نقش ہے۔ میں اسے آپ کو سناؤں گی نہیں، کیونکہ یہ محض پاگل پن ہے۔ پر محبت پاگل پن کے سوا اور ہے بھی کیا.....؟

جولیا اُٹھی۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ نیویارک میں تارے دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ لیکن جب میر صاحب نے کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا۔ اور آسمان کی جانب سر کو اُٹھایا تو اُنھیں ایسا محسوس ہوا کہ کئی ایک ستارے کھڑکی کے پاس آ کر جولیا کی باتیں سن رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب مجنوں، لیلیٰ کے فراق میں، نجد کے ریگستانوں میں گھومتا پھرتا تھا، تو ستارے، جانور، چاند، درخت سب کے سب اُس کے پاس آ کر اُس کی داستان سنا کرتے تھے، اور دلاسے دیا کرتے تھے۔ جولیا باورچی خانے میں دوبارہ کافی بنا رہی تھی۔ میر صاحب کھڑکی سے ہٹ کر کچن میں آئے۔ چیزیں صاف سُتھرے طور پر رکھی ہوئی تھیں۔ سینک میں دو تین برتن پڑے تھے۔ ظاہر ہے جولیا نے کھانے کے بعد سنے ہوئے برتن رکھے تھے۔ فریج آہستہ آہستہ بول رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو۔ 'باہر جاؤ! باہر جاؤ!'، میر صاحب کا دل بے قرار ہونے لگا، کہیں متوالا پن تو طاری نہیں ہو راہ ہے، انھوں نے سونچا، لیکن کیا متوالا پن؟ ابھی تو میرے ہوش ہی ٹھکانے پر نہیں ہیں اور میں نے یہ فیصلہ ہی نہیں کیا ہے کہ میں جولی کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہوں..... کیا مجھے محض اُس کی فرج چاہئے، یا ساتھ ساتھ اُس کی محبت بھی، اور یہ بھی کہ ہم ساتھ ساتھ نہ صرف ایک دوسرے میں فنا ہونا چاہیں گے، بلکہ اُس ہستی مطلق میں بھی جو ہمارا سب کا خالق ہے..... مجھے تو کچھ بھی پتہ نہیں، دوبارہ وہ دونوں اپنی اپنی پرانی جگہوں پر لوٹ آئے۔ میر صاحب نے اپنے پتلون کی بیلٹ ذرا ڈھیلی کی۔ جولیا بسکٹ کا ایک ڈبہ اُٹھا لائی

تھی۔ دونوں نے ایک ایک چاکلیٹ لگے بسکٹوں کو لیا، اور کافی کی چُسکی لی۔ میر صاحب نے سونچا کہ انھیں چاکلیٹ کھانی نہ چاہئے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اکثر اُنھیں قبض کی شکایت ہونے لگتی ہے۔ اور ملک اف بیگنیشیا کے تین چار چمچے پینے پڑتے ہیں۔ جولیا خاموش تھی۔ اُس نے دوسرا بسکٹ لیا، اور میر صاحب نے سادے، نمکین بسکٹوں کی جانب دھیان دیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ باہر ذرا تیز بارش ہونے لگی تھی، پتہ نہیں ستارے کھڑکیوں سے لگے بیٹھے ہیں، یا آسمان کی وسعتوں میں واپس چلے گئے؟ میر صاحب کو کافی پسند آ رہی تھی۔ اُنھیں تھوڑی سی گرمی کا احساس ہوا۔ کمر میں تھوڑے درد کا۔ اُنھیں پتہ چلا تھا کہ لینین گراڈ کی سرکاری لائبریری میں ابتدائی صوفیوں پر ایک کتاب فارسی میں موجود ہے، جو دراصل ایک قدیم ترعربی نسخے کا ترجمہ ہے، جس میں حسن بصریؒ پر کچھ نئی باتیں کہی گئیں ہیں۔ اُس نُسخے کی فوٹو کاپی دستیاب کرانی چاہئے، میر صاحب نے سونچا۔ اُن کے دل کی دھڑکن ہموار تھی، اور جوشِ جنوں صحرا میں دیوار کی جستجو نہیں کر رہا تھا۔

جولیا نے ہلکے بھورے رنگ کا سلیکس پہن رکھا تھا۔ اور جب وہ صوفے پر پیروں کو اُٹھا کر بیٹھی تو اس کے زیریں حصوں کے نقوش نمایاں ہو گئے تھے۔ گہرے نیلے رنگ کی جرسی اُس نے ڈال رکھی تھی، جس کے دو اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سیاہ براصاف نظر آ رہی تھی۔ اُس کے سینے فرنچ لڑکیوں کی مانند اَدھ کچے سیبوں کی مانند چھوٹے چھوٹے تھے۔ کانوں میں سیاہ اسٹیل کے رِنگ تھے اور بالوں کو پشت پر پھیلا رکھا تھا۔ میر صاحب کی خواہش ہو رہی تھی کہ اُسے آنکھوں میں بیٹھا لیں، پر چھونے کی تاب اُن میں نہ تھی۔ جولیا ایک سوٹڈ یشن نرس کے مانند چاق و چوبند اور ایفی شینٹ لگ رہی تھی، گو اس کی سبز اور نیلی سی آنکھیں خواب دیکھنے میں لگن دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس نے پھر بولنا شروع کیا۔

'میر صاحب، کوئی ایک ہفتہ بعد مجھے ایسا لگا کہ میری زندگی اُس کے بغیر اُس زخمی ہرن کی سی ہے جسے کوئی گولی مار کر اُس کے تکلیف کی شدت کو کم نہیں کر دیتا، اور وہ محض تڑپتی رہتی ہے۔ مجھے لگتا تھا میں کانٹوں کی سیج پر سوئی ہوں، اور کھانے کے بجائے زہر مار کر رہی ہوں..... دُنیا ایک تاریک سا سیارہ تھی جو اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر منزلیں طے کر رہی تھی..... مجھے سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، اور کیا نہ کروں۔ کہاں جاؤں کہاں نہ جاؤں کیونکہ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ اب کی بار اگر اُس نے مجھ سے کچھ مانگا تو میں اُس کی ساری خواہشیں پوری کرنے میں خود کو بے قرار پاؤں گی۔ کیونکہ خواہشوں کو پورا کرنے کی تمنّا میرے دل کو بے قرار کئے دے رہی تھی۔ میرا روآں روآں اُس کی تمنّا میں بے آب تھا۔ عبدالرحمٰن رشیدوف میرا محبوب تھا، میرا پریم پجاری تھا، میری زندگی تھی، ہم دونوں کی روحیں ایک دوسروں میں ضم ہو چکی تھیں۔ میں اُس کے ہلکے سبزی بالوں سے کھیلنا چاہتی تھی، جو بھورے اور سیاہ بالوں کے گچھوں کے ساتھ اُسکے کانوں سے نیچے تک آ رہے تھے۔ میں اُس کے خون جیسے ہونٹوں کی سُرخی سے اپنے ہونٹوں کو رنگ دینا چاہتی تھی۔ عبدالرحمٰن لندن یونیورسیٹی کے ایک ٹرینگ کالج میں انگریزی سیکھنے بھیجا گیا تھا۔ اُسے پہلے اُس نے

ماسکو یونیورسیٹی کے انگریزی کے انسٹی ٹیوٹ سے ڈپلوما حاصل کیا تھا۔لیکن مجھے جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ اُس کی ساری سرگرمیاں اپنے مسلمان ہم وطنوں کی بہبودی کے لئے وقف تھیں۔اُس نے مجھے بتایا تھا کہ سارے سویت وسط ایشیا میں مسلمانوں کے اندر ایک تحریک اُٹھ رہی تھی کہ اپنی ثقافت، اپنی زبان، اپنے مذہب اور اپنے رسم ورواج کو زندہ رکھنا ہے اُنھیں ختم ہونے نہ دینا ہے.....اُس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ روسی حکومت اُس کی سرگرمیوں کے متعلق ایک حد تک واقف تھی، اور اُس پر گہری نظر رکھی جارہی تھی۔وہ قطعی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنا ملک چھوڑ دے، اور جلاوطنی قبول کرلے۔ وہ تو جارجیا واپس جا کر کسی اچھی یونیورسیٹی میں رہ کر، انگریزی زبان پڑھا کر، تحریک کی مدد کرنا چاہتا تھا۔اُس نے ایک روز جذبات میں آکر مجھ سے پوچھا تھا۔'کیا تم میرے ساتھ چل کر ہماری تحریک میں شامل ہونا چاہوگی؟،عبدالرحمٰن خالص ترک اور جذباتی اور جذباتی نوجوان تھا۔اُسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں کیونکر اُسکے ملک جاسکتی تھی۔میں ایک عیسائی سرمایہ دار کی عیسائی بیٹی، جسے ایک نہ ایک دن اپنے کاروبار کو چلانے میں مدد کرنا ہے.....اور اگر اُس نے شادی کی تو کسی آرمینین کرسچین رشتے دار سے کرے گی جو اُس کے کاروبار کو چلانے میں اُسکی مدد کرے گا.....مجھے سویت یونین اور وہاں کے مسلمانوں سے کیا لینا دینا تھا.....عُشاق جو ہیں وہ اتنی معمولی بات کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ عبدالرحمٰن تو میرے جسم سے لذت حاصل کرنے کیلئے، بے تاب تھا، اور اس جھونک میں آن کر اُس نے یہ بھی فرض کرلیا تھا کہ میں اُس سے شادی کرنے کو بھی تیار ہوجاؤں گی۔گو یہ حقیقت ہے میر صاحب، میں دراصل اسی ڈر سے تو اُس سے بھاگ رہی تھی، کیونکہ مجھے یہ احساس ہوچلا تھا کہ میں بھی اُس کے جسم سے لذت حاصل کرنا چاہتی ہوں.....باکرہ پن کھودینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مجھ سے عمر میں چھوٹی لڑکیاں اِس پُل صراط کو بآسانی پار کرچکی تھیں، اور مزے کی زندگیاں گزار رہی تھیں۔ مجھے تو ڈر یہ تھا کہ کہیں میں اُسکے ساتھ جارجیا جانے پر تیار نہ ہوجاؤں، اسلام نہ قبول کرلوں، اور اپنے پیارے پاپا کو ایک ایسا صدمہ پہنچاؤں جس سے وہ شاید جاں بر نہ ہوسکیں۔ میں ایسا ہرگز نہ کرنا چاہتی تھی.....

جولیا کچھ سوچنے لگی تھی۔میر صاحب اُس کی سنجیدگی، اُس کی گہرائی، اور اُس کے سمجھنے کے طریقوں پر عَش عَش کررہے تھے۔ جولیا کی عمر کوئی بائیس سال کی ہوگی، اُس پر یہ سمجھداری! اور یہ وسعت!! دیکھنے سے وہ محض ایک انتہائی دلکش، معصوم بچی معلوم ہوتی تھی، جو لباس اور طور طریقوں سے کھلنڈری سی لگتی تھی۔لیکن اس لڑکی نے درد کے جام کو پیا تھا۔اُسے اِس بات کا احساس ہوچلا تھا کہ وہ کون ہے، زندگی میں آگے چل کر اُسے کیا کرنا ہے، کون کون سی رکاوٹیں تقدیر نے اُس کی راہ میں کھڑی کررکھی ہیں۔وہ شاید یہ بھی جانتی تھی کہ کن کن رکاوٹوں کو اسے پھلانگ جانا ہے، اور کس کس کے سامنے ہتھیار ڈال دینے ہیں۔ زندگی کیونکر، میر صاحب سوچنے لگے، ایسی ہستیوں کو جنم دیتی ہے، کچھ دنوں کے لئے شور وغوغا کرنے دیتی ہے، اور پھر اپنی دامن میں سمیٹ لیتی ہے، اور اگر اُنھیں ہلاک نہیں کردیتی تو تیس اور پینتس سال کی عمر کے بعد ایسے لوگ یا تو اپنے ماضی

کے سہارے چلتے دکھائی دیتے ہیں، یا اپنا چولا یوں بدلتے ہیں کہ میدان کارزار پہچانے ہی نہیں جاتے۔ کتنے حضرات گریٹا گاربو کو اب جانتے ہیں، جو کہ شاید ہالی ووڈس کی سب سے زبردست ہروئن گزری ہے، سوائے اُن کے جو فلموں کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جولیا نے دوبارہ پھر بولنا شروع کردیا تھا، اُس کے سینے کے کبوتر پرواز کرنا چاہتے تھے، اُس کے لبوں کی لالی تحلیل سی ہوگئی تھی، کانون کی بالیاں ذرا زیادہ جنبش میں تھیں۔

'دس دنوں بعد برٹش میوزیم کے پاس اُس سے میری ملاقات ہوئی، جب میں گھٹن سے تنگ آکر گھر سے باہر آکر لندن کی سڑکوں کو ناپ رہی تھی۔اُس نے آکر مجھے دبوچ سالیا۔اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں سیاہی کے ڈورے تھے، اور شکووں کے ساتھ ساتھ نفرت کی ایک دو چنگاریاں بھی تھیں۔ میری طبیعت بھی یہی چاہی کہ اُس کے ساتھ بس لپٹی رہوں، اور اپنی محبت اور نیک نیتی کا مظاہرہ اپنے بدن کی حدّت کے ذریعہ کروں۔اُس نے نہ معلوم کیا کیا کہا، اور میں نے کیا کیا۔ پر مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ہم ایک بس میں بیٹھ گئے اور ساری راہ ہلکے ہلکے وہ مجھ سے شکایتیں کرتا، پوچھتا رہا، بتاتا رہا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہم کتنی بسوں پر سوار ہوئے، اُترے، اور دوسری بس پکڑی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جب کہ ہم چیلسی کے علاقے میں تھے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کے حوالے اپنے جسموں کو کردیں گے۔یقین مانیے، میر صاحب، میرے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا، مجھے باکرہ پن کی کوئی خاص پرواہ نہ تھی، مجھے اپنے خاندان کی حُرمت ستارہی تھی۔عبدالرحمٰن بے قرار تھا۔وہ اُسی دن اپنی اور میری باکریت کھونا چاہتا تھا۔میں ایک بیوپاری باپ کی بیٹی ہوں۔آپ نے یہ اندازہ اب تک لگالیا ہوگا۔ میرے اندر حکمت عملی کے سارے جوہر موجود ہیں۔اس لئے ہم نے سمجھ بوجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ دوسرے روز عبدالرحمٰن کے ڈگس میں ہم محبت کا کھیل کھیلیں گے.....میر صاحب میں آپ کو کیوں کر بتاؤں کہ رات بھر مجھ پر کیا گزری، مجھے صرف ایک ڈر تھا، ہم بستر ہونے کے بعد کہیں میں اُس کے جال میں یوں نہ پھنس جاؤں کہ وہ مجھے میرے خاندان سے الگ کردے۔ مجھے کئی گھنٹے تک نیند نہ آسکی، اور جب آئی تو سارے وقت میں ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ مجھے عبدالرحمٰن سے، اپنے عاشق سے، ڈر سا لگنے لگا تھا، میں اُس سے گھبرارہی تھی.....آپ میر صاحب نہیں جانتے خاندان کی عظمت، شان، رکھ رکھاؤ کیا چیزیں ہوتی ہیں! [میر صاحب خوب جانتے تھے۔کئی سو سال سے جانتے تھے] میں کیونکر اپنی دنیا سے قطع تعلق کرسکتی تھی۔الگ ہوکر میں اپنی مخصوص انفرادیت کھوسکتی تھی۔ میں تو بس سبزی کی ایک گانٹھ ہوکر رہ جاتی۔ ایک بار عبدالرحمٰن نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اُسے محبت اور تحریک میں سے کسی ایک کو پسند کرنا پڑے گا، تو، مجبوراً اور لاچار اُوہ تحریک کی جانب جائے گا۔اسی طرح اگر مجھے محبت اور خاندان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آئے گی تو میرے قدم میرے خاندان کی طرف بڑھیں گے.....پھر بھی دوسرے روز ہم ایک مقررہ مقام پر، رسل اسکوائر کے نزدیک، ملے۔عبدالرحمٰن دبلا پتلا پر طویل القامت شخص ہے۔وہ سارے سفر بس میں مجھ پر جُھکا سارہا۔اُس کے سگریٹ کی خوشبو میرے نتھوں میں پیوست ہوتی رہی۔ میری دونوں

جانگھیں پھڑک سی رہی تھیں، اور میں نے اُنھیں دبا کر رکھا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن کا کمر سیدھا سادہ سا تھا۔ یک بڑا سا پلنگ صاف ستھرے کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک لانبی سی میز تھی جس پر کتابیں قرینے سے سجائی گئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی میز پر پانی کا ایک جگ، ایک تسلہ اور صابن دانی پڑی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اُسے جسم کی صفائی کا بہت خیال رہا کرتا ہے۔ کمرہ سچ مچ بہت صاف ستھرا تھا، سوائے اس کے ایک کونے میں کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ میں جب سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آئی تھی تو میرا بدن کانپ رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ کیا ہونے والا تھا، اور میر صاحب آپ یقین مانیے، میں اُس سے خوف زدہ نہ تھی۔ میں تو صرف اس بات سے ڈر رہی تھی، اور مجھے قطعی معلوم نہ تھا، کہ اُس سے آگے کیا ہوگا۔ دن کے کوئی ایک بجے تھے۔ موسم گہر بار بلکہ تاریک سا ہو رہا تھا سارے میں مکمل خامشی تھی۔ صرف سڑکوں پر گاڑیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں، جیسے کہ پیانو پر ایک بھاری نوٹ بجا چلا جا رہا ہو۔ ہاں کبھی کبھی بریک لگنے کی آواز اس نوٹ کو ڈسٹرب کر دیتی تھی۔ میں نے آنکھیں اُٹھا کر عبدالرحمٰن کی جانب دکھا۔ میری آنکھیں نہ جانے کیوں جھکی چلی جا رہی تھیں۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں، ایسی کہ جیسے کہ چند قطرے ٹپک پڑنے کو ہوں۔ ہلکی سی بھوری مونچھوں کے نیچے لب تھر تھرا رہے تھے۔ میں نے اُس سے ذرا ہکلاتے ہوئے کہا کہ دونوں کھڑکیوں کے پردے کھینچ دے۔ دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی فارسی بول رہا تھا، جس میں بار بار ترکی الفاظ آ رہے تھے۔ میں دھم سے بستر پر گر کر بیٹھ گئی، اور وہ میرے برابر آ کر، پر مجھ سے ذرا دور، اُسی بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُسکے مذہب میں شادی سے پہلے سیکس میں ملوّث ہونا گناہ عظیم میں سے ہے۔ نہ معلوم کیوں کر میں اُسے کہا کہ وہ جس ملک کا باشندہ ہے سنا ہے وہاں لوگ مذہب میں یقین نہیں رکھتے ہیں۔ یہ سن کر وہ مسکرایا۔ 'تم بہتر جانتی ہو، بہت بہتر جانتی ہو..... پھر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم یوں قریب آ کر ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں..... پھر آگے ہماری زندگی کا راستہ کھلا پڑا ہے.....' میں صحیح معنوں میں ڈر رہی تھی۔ میں جو ٹانگوں کے درمیان جو شے تھی اس کی وجہ سے گھبرا نہیں رہی تھی۔ میں نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ عبدالرحمٰن میرا پہلا عاشق ہے، اور رہے گا۔ میں اپنے دل اور روح کے لئے خوف زدہ تھی۔ کیونکہ اُسنے فوراً ہی کہا۔ 'جولی، تمھیں مجھ سے شادی کرنی ہے، اور میرے ساتھ وطن کو جانا ہے۔' 'وطن' کے لفظ کو اُس نے اُس عقیدت اور جذبے کے ساتھ ادا کیا کہ میں اب تک اُسکی حلاوت محسوس کر رہی ہوں..... ہم ایک دوسرے سے ذرا دور دور بیٹھے تھے۔ سیکس کی خواہش ہمارے اندر ضرور تھی، پر اب تک اُبل کر باہر نہ آئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شاید دعائیں مانگ رہا تھا۔ اُس کے لب ہل رہے تھے، پر کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ میر صاحب اُس کمرے میں گزارے گئے کوئی ڈھائی گھنٹے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک ایک بات، ایک ایک حرکات مجھے یاد ہیں۔ دل کے نہاں خانے میں انھوں نے مستقل جگہ بنالی ہے۔ میں گھنٹوں اُن گزارے ہوئے لمحات پر باتیں کر سکتی ہوں..... کیونکر وہ زیرلب بڑبڑاتا ہوا میرے ذرا قریب آیا، میں نے اُس کی جانب سرکنے کی کوشش کی تو مجھے

ایسا لگا کہ میرے پیر پتھر کے ہو گئے ہیں۔ میرا سینہ دھڑک دھڑک کر رُک سا گیا تھا۔ میرے ہونٹ کسی شے کی تلاش میں تھے، سوکھ رہے تھے، اور بے چین تھے۔ عبدالرحمٰن گہری گہری سانسیں لے رہا تھا، جیسے وہ سگریٹ کے گہرے کش لے رہا ہو، سڑک کی جانب سے بچوں کی کئی ایک بلند آوازیں اُٹھیں، اور رُک گئیں۔ اُس کے سنہرے بال بکھر گئے تھے، جنھیں وہ بار بار کھجلا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند سی ہو رہی تھیں۔ اُن میں شاید تاب نہ تھی کہ میرے زرد چہرے کی جانب دیکھ لے۔ پھر اس کا مذہب اسے تازیانے لگا رہا تھا۔ میری آنکھیں کیمرے کی آنکھوں کے مانند کھلی ہوئی تھیں، اور ساری چیزوں اور ساری حرکتوں کا جائزہ لے ہی تھیں۔ میز پر رکھی کتابوں کی قطاریں تھیں۔ دو ایک پر خاصی گرد جمی ہوئی تھی، جیسے کہ کسی نے باہر سے لا کر ڈال دی ہو۔ میز پر منہہ اور ہاتھوں پر لگانے والی کریم کی ایک ٹیوب پڑی تھی۔ چند سکّے نیم تاریکی میں چمک رہے تھے۔ کپڑوں کے ڈھیر کے اوپر ایک جائے نماز پڑی ہوئی تھی۔ پردے کھینچ جانے سے کمرہ نیم تاریک سا اور ذرا ڈراؤنا سا بھی ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں سب دیکھ رہی تھیں، پر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اُن میں خوف کی ایک لہر دوڑ رہی تھی، جیسے کہ مکمل تاریکی چھا جائے گی اور ایک نکیلے ناخنوں والا جانور آ کر میرے ہونٹوں کو نوچ جائے گا۔ اکتوبر کے آخری دن تھے۔ آج سے دو سال پہلے کی یہ بات ہے۔ باہر چند لُنڈ مُنڈ درخت پردوں کے کناروں سے دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ٹانگیں پتھر ہو جانے کے باوجود میں اس کی جانب کھسکی۔ وہ گم صُم آنکھیں بند کئے، بیٹھا، اپنا چہرہ میری جانب کیے، سکتے میں تھا۔ وہ ذرا ذرا تھرتھرا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں نے بڑبڑانا بند کر دیا تھا۔ میں بھی کانپ رہی تھی۔ اور میں نزدیک ہوتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی، اور اُس کے مضبوط بازوؤں بڑھ کر میرے جسم کو حلقہ میں لے لیا۔ میں نے اپنے چہرے کو اُٹھا کر اُس کے مزید سرخ ہوتے ہوئے لبوں پر اپنے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔ زندگی میں میں پہلی بار کسی مرد کا بوسہ یوں لے رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ کچھ پھڑ پھڑائے۔ اور ہم دیر تک اپنے ہونٹوں کی پھڑ پھڑاہٹ کم ہونے کا انتظار کرتے رہے، اور ہونٹوں کے ذریعہ اس محبت کا اظہار کرتے رہے جو خدائے تعالیٰ بہت کم انسانوں کے دلوں میں پیدا کرتا ہے۔ ہم کائنات کی آفاقیت کا مظہر تھے۔ ہم انسان دوستی کا اعلان تھے۔ ہم خدائی صداقت کے ان حقائق کی تصویر تھے جو ہم سب کے سب بھول چکے ہیں، اور دلوں میں محبت کے بجائے نفرت کی آگ لیے پھرتے ہیں۔ ہمارے لب زندگی کی آواز تھے۔ میری خواہش ہوئی کہ اس کا سینہ کھل جائے اور میں اس کے اندر سما جاؤں۔ میں ذرا الگ ہو کر نہ جانے کیوں کر، نہ جانے کس جذبے کے تحت، اپنا اونچے گلے کا سوئیٹر اتارنے لگی، اور وہ اپنی قمیص۔ شاید ہمارے لبوں نے ایکٹانگوں کے درمیان لجلجاہٹ سی ہو گئی ہے۔ میں اُس لطف کو محسوس کر رہی تھی، جیسے کبھی کبھی نیم خواب میں محسوس ہوا کرتی ہے۔ میں بالکل بھول چکی تھی کہ میں ننگی بستر پر پڑی ہوں، اور میرے تقریباً آدھے جسم پر عبدالرحمٰن ننگا، نیم بے ہوش، نیم ہوش مند پڑا ہے۔ پھر مجھے ہوش سا آنے لگا اور مجھے ایسا لگا کہ بہت ساری کوششوں کے بعد، جب کہ وہ بار بار گھبرا کر زیرِ لب کچھ بولنے لگتا

تھا، عبدالرحمٰن نے وہی جگہ پالی تھی جس کی اُسے عرصے سے تلاش تھی، اور پچھلے پندرہ بیس منٹ اُس کے لیے پندرہ بیس ہزار سال کے برابر ہو گئے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ جب ہزار صعوبتوں کے بعد اُس نے میرے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی تو مجھے ایک ہلکی سی تکلیف ہوئی تھی، جیسے کوئی باریک سی پِن چبھو رہا ہو، اور میں نے گھبرا کر پہلو بدل لیا تھا، اور عبدالرحمٰن نے کراہتے ہوئے، ایسے جیسے کہ بھیڑ کے بچے کو ذبح کیا جاتا ہے، ایسی ہی آواز اُس نے نکالی تھی اور رقیق جیسا مادّہ میری ساری ٹانگوں پر پھیلا دیا تھا۔ پھر شاید، کم از کم مجھے نیند سی آ گئی تھی، گو میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی مدہوش ہو چکا تھا۔ مجھے سکون، کراہیت، آسودگی اور گندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں سو سی گئی۔ میرا خیال ہے کہ دس پندرہ منٹوں تک میں سوتی رہی اور جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا کہ میرے بدن پر ایک چادر پڑی ہوئی ہے اور عبدالرحمٰن نزدیک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اُس نے پینٹ پہن رکھی تھی اور اوپری حصّہ کھلا تھا۔ میں چادر کے نیچے مادر زاد ننگی پڑی تھی، اور میرا جسم گیلا گیلا سا لگ رہا تھا۔ کیا آپ کو پتہ ہے میر صاحب، جب ایک عورت اپنے جسم کو ذرا تحقیرانہ اور ذرا ہمدردانہ انداز سے دیکھتی ہے تو اُس کے دل میں کیا آتا ہے، سب سے پہلے تو اُسے مر جانے کا دل چاہتا ہے، یا خود کو چاقو مار لینے کا۔ میں نے خود کو چاقو تو نہیں مارا، بلکہ آنکھیں کھول کر عبدالرحمٰن کی جانب بے بسانہ انداز میں دیکھا، بھیڑ کے بچے کی مانند جب اُسے ذبح کرنے سے پہلے پکڑ کر دبا دیتے ہیں۔ میز پر رکھے جگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا۔

'میں باہر چلا جاتا ہوں، تم بدن صاف کر لو۔' اُس نے شاید خود کو پہلے ہی صاف کر لیا تھا۔ پھر اُس نے اپنی قمیص اُٹھائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے اُٹھ کر پہلے تو کنڈی چڑھائی، پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اندھیرا چھا چکا تھا، اور بارش کے قطرے یوں ٹپک رہے تھے جیسے میری کوئی سہیلی مجھ پر رو کر اب چپ ہو چلی ہو۔ مجھے پاپا کا خیال آیا اور میں نے اپنے ننگے جسم پر ایک بار پھر نظر کی۔ میرا جسم ہاتھی کے دانت کی مانند چمک رہا تھا۔ میری کمر کی لوچ مجھے ذرا تیکھی سی لگی۔ پھر میں گندے کپڑوں کے ڈھیر سے ایک تولیہ اُٹھا کر تسلے کے پاس آئی اور جب تولئے کو پانی سے بھگو کر اپنے جسم کو صاف کرنے لگی، حالانکہ مجھے مطلق کوئی گندگی دکھائی نہ دی، تو دیکھا کہ خون کے چند قطرے مجھ سے لپٹے ہوئے ہیں۔ میں پھر بستر تک آئی تو دیکھا کہ اُس پر بھی چند قطرے گر کر جذب ہو چکے ہیں۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے، میں نے خود سے کہا 'ابھی تو میرا وقت آیا نہیں ہے۔' پھر یک بیک میرے ذہن نے بات سمجھ لی۔ 'تو یوں بکر ختم ہوئی۔' میں نے دوبارہ خود سے کہا۔ 'کوئی بہت ہی تکلیف دہ بات تو نہیں!' پر میرا دل اندر سے کچھ اور کہہ رہا تھا، جس پر میں دھیان ہی نہیں دے رہی تھی، کیونکہ وہ مجھ پر ملامتیں کر رہا تھا، اور میں ملامتوں کو فی الحال سُننا نہیں چاہتی تھی، کیونکہ میں نے عورت ہونے کا ایک مکمل ثبوت اس وقت پیش کیا تھا، اور میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے اس افتخار کو ٹھیس لگائے، کوئی مجھ سے میری اس خصوصیت کو مجھ سے الگ کر دے..... پھر میں نے ہاتھ منہ دھوئے۔ پرس سے سامان نکال کر خود کو سنوارا۔ کپڑے پہنے اور دروازے کو کھول

دیا۔ عبدالرحمٰن لجایا لجایا سا باہر کھڑا تھا، اور سگریٹ پھونکے چلا جا رہا تھا۔ مجھ سے عمر میں کوئی دو سال بڑا تھا۔ طویل القامت تھا۔ مضبوط جسم کا انسان تھا، پر اُس وقت بھیگی بلّی جیسا دکھائی دے رہا تھا میرے دل میں اسے یوں سر بہ زانو دیکھ کر ہلکی سی خواہش ہوئی کہ اس کھیل کو دوبارہ کھیلا جائے۔ لیکن اسے یوں دیکھ کر میرے دل نے ایک اور فیصلہ کرنے کی سوچی، گو اس کی یاد مجھے ساری زندگی ستاتی رہے گی، میرا اس کے ساتھ بندھ جانا نہ تو مناسب رہے گا اور نہ ممکن ہے۔ میرے لیے وہ محض ایک تجرباتی آلہ نہ تھا، وہ تو میری زندگی کا ایک اٹوٹ حصّہ بن گیا تھا، لیکن ایک ایسا حصّہ جسے روزمرہ کے کام میں لایا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بج چکے تھے اور لندن تاریکی کی بانہوں میں تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ یہ شہر وہی شہر تھا، جہاں کہ ایک مسلمان تُرک کے ہاتھوں ایک آرمینیئن عیسائی کی زندگی کا ایک اہم باب پلٹا گیا تھا،

جولیا یک بیک رُک گئی۔ اُس کی آنکھیں خواب گیں تھیں۔ اُس کے بالوں کے گرد ہلکا ہلکا سا ہالہ چھا رہا تھا۔ پھر اُس نے اپنی چوکور اومیگا گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بجنے والے تھے۔ نیویارک اور لندن کی گھڑیوں میں تین گھنٹے کا فرق ہے۔ لندن میں سڑکوں پر ٹریفک چلنا شروع ہو گیا ہوگا۔ یہاں ایک دو بھاری بھاری ٹرکوں کے چلنے کی آوازیں کبھی کبھی آ رہی تھیں۔ اِن آوازوں کو میر صاحب خال خال سنا کرتے تھے، کیونکہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک، ڈیڑھ بجے رات تک جگنے کے عادی تھے، اور پھر فوراً گہری نیند میں مدہوش ہو جانے والوں میں سے تھے۔ جولیا نے میر صاحب کی آنکھوں میں اپنی نشہ آور آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

'میر صاحب، اب آپ جائیں۔ کل باقی باتیں ہونگی..... ورنہ پھر مجھے نیند نہیں آئے گی۔'

'میں تو صاحب بستر پر جا کر دھم سے گر کر سو جاؤں گا۔'

میر صاحب اسے لپٹا لینا چاہتے تھے، پر مشرقی تہذیب اس کی اجازت نہ دیتی تھی، اس لیے رک گئے۔ گو اس رکاوٹ پر اُنھیں ذرا جھنجلاہٹ سی ہوئی، اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ ایک دو اپارٹمنٹ سے ٹی، وی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں سے دو عورتوں کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ میر صاحب مگن سے ہو گئے تھے اور سچ مچ کپڑے تبدیل کر کے فوراً سو گئے۔ اُنھوں نے غسل کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔ اُن کا دماغ فکر کر رہا تھا۔

دوسرے روز میر صاحب اپنے کام میں بہت ہی مشغول رہے۔ کئی ایک جگہوں سے اُنھیں فوٹو کاپیاں منگانی تھیں۔ پھر نیویارک لائبریری جا کر ایک دو ریفرنسیس کو چیک کرنا تھا۔ شبلی اکادمی اعظم گڑھ میں صوفیوں پر ایک بہت ہی قدیم مخطوطہ پڑا تھا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے اس کی نقل کی بابت درخواست کرنی تھی۔ رات کا کھانا بھی اُنھوں نے یونیورسیٹی کے کیفے ٹیریا میں کھایا، جہاں اُنھیں دو چار دوست گپ بازی میں مصروف دکھائی دیے۔ اُن سے جلد پیچھا چھڑا کر وہ گھر آئے۔ فوراً غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر سات بجے سے پہلے جولیا کے مکان کی کال بیل دبائی۔ فردوس آج تک نہیں لوٹا تھا، نیاگرا فال کی

یہ ٹرپ دلچسپ ہوتی جارہی تھی۔

''میں تو سمجھی کہ آپ نے میری پُر درد داستان سُن کر بقیہ حصّوں کو سننا نہ چاہا۔'' [جولی ہنستی ہوئی بول رہی تھی، اس کی آنکھیں ذرا غم زدہ تھیں۔]

''جولی! تم تو شاید جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں..... میں تم سے کب دور ہونا چاہتا ہوں۔''

شاید میر صاحب ٹھنڈ سے گرم مقام پر آ گئے تھے تبھی اُنھوں نے یہ اعلان بے ساختگی کے ساتھ کر دیا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اُنھوں نے فوراً ہی جولیا کو خود سے چمٹا لیا، یوں کہ اُن کے دونوں بازوؤں نے جولیا کو شکنجے میں گرفتار کر لیا۔ یہ ایک نری جذباتی حرکت تھی، جس کا اظہار غالباً اب تک میر صاحب نے کسی کے ساتھ بھی نہیں کیا تھا۔ جولیا ذرا سی گھبرا گئی، اِدھر اُدھر دیکھا، میر صاحب کے ٹھنڈے سے چہرے پر نظریں جمائیں، اور پھر ہنستی ہوئی اُن کی بانہوں سے الگ ہوتے ہوئی بولی۔

'صبر کیجیے میر صاحب، صبر..... دیکھو میر! گو ہماری اور تمھاری راہیں بالکل جدا اور مختلف ہیں، لیکن کچھ دنوں کے لیے ہم دونوں قریب آ سکتے ہیں، اور یہ نزدیکی مجھے پوری اُمید ہے، خالص دوستانہ طور پر ہوگی، جہاں کبھی کبھی ایک آدھ غلطیاں سرزد ہو جانی لازمی ہیں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ تم مجھ سے شادی کی درخواست کبھی نہ کرو گے۔ تم ٹھہرے خالص مسلمان، اور اُس ملک کے جو خود کو پاک سرزمین کہتا ہے۔ اور پھر تمھارے ہاں شاید کا ندان سے باہر شادی کرنا مسموم نہیں مانا جاتا جیسا کہ ہمارے ہاں..... پھر اگر تم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھے مسلمان بناؤ گے، اور یہ میں نہیں کر سکتی، کیونکہ فی الحال میں اپنے ہی مذہب کے احکام کو کوئی خاص نہیں مانتی ہوں، تو دوسرے مذہب کو مان کر اُس کے احکام کو کیونکر مانوں گی، اور آپ یاد رکھیں میر صاحب، میرا یقین ہے کہ ہمارے مذہب سے بڑھ کر کوئی دوسرا مذہب نہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں..... پر، میر، ہم اور تم دوست ہیں، اور دوست رہیں گے۔ اس پر مجھے مکمل یقین ہے، اور یہ بھی کہ اگر کبھی کوئی موقع آ گیا تو ہم لَو ربھی بن جائیں گے، لیکن محض دوستی تک۔'

'موقع تو ابھی آ گیا ہے!' [میر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی، اُنھیں محبت کا چرّخ چوں گردشیں دلا رہا تھا۔]

'موقع کو آپ میر صاحب ذرا برقرار تو ہونے دیں..... ابھی تو محض سیماب پا ہیں، اور اکثر آپس میں غلطیاں جو راہ پکڑ جاتی ہیں، وہ اسی سیمابی کیفیت کو مستقل سکون سمجھ کر کی جاتی ہیں..... آیئے، اندر آئیں، میں کافی بناتی ہوں۔'

● م۔ ص۔ ایمن

شریف زادی

میرا تعلق ایبٹ آباد سے ہے۔ اپنے علاقے میں مناسب روزگار نہ ہونے کے سبب میں نے راولپنڈی میں کرائے کی ایک دکان لے کر کپڑے کا کاروبار شروع کیا۔ دکان کے قریب ہی ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان بھی کرائے پر لے لیا۔ چھوٹے سے کمرے میں اکیلا ہی رہتا تھا۔

جمعرات کی شام دکان ذرا دیر پہلے بند کرتا اور بذریعہ بس، اپنے گھر اپنے بچوں میں چلا جاتا، اور ہفتے کی صبح وہیں سے سیدھا دکان پر آ جاتا۔

میں شادی شدہ ہوں۔ دو بچے بھی ہیں۔ بیوی بھی ماشاءاللہ بہت سگھڑ ہے۔ میرے والدین کی بہت اچھی طرح خدمت کرتی ہے۔ انہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیتی۔ اس لئے گھر سے اپنے بچوں سے طویل دوری مجھے ناگوار نہیں گزرتی۔ دکان پر ایک ملازم بھی رکھا ہوا تھا، جو میرا ہاتھ بٹاتا۔

بلال، یعنی ملازم کی ضرورت کی اہم وجہ نماز تھی۔ دکان کے باہر بھی ڈسپلے کے لئے مال رکھا ہوتا تھا۔ نماز کے لئے بار بار دکان بند کرنے سے بہتر تھا کہ ایک سے بھلے دو ہو جائیں۔

جمعہ کے دن دکان بند ہوتی اور بلال کی بھی چھٹی ہی ہوتی۔ حالانکہ دیگر دکاندار حضرات، جمعہ کے دن بھی دکان کھولتے تھے اور خود چھٹی کر کے تمام دن کے لئے دکان ملازموں کے حوالے کر جاتے تھے۔

ہفتے کی صبح میری دکان قدرے تاخیر سے کھلتی تھی کہ مجھے ایبٹ آباد سے آتے آتے اکثر دیر ہو ہی جاتی۔ البتہ اس کے علاوہ روزانہ فجر کی نماز کے فوراً بعد میں دکان کھول لیا کرتا تھا، جبکہ مارکیٹ بھر کی تمام دکانیں ہنوز بند ہی ہوتی تھیں۔

نماز فجر کے بعد گھر پر میرا کوئی کام تو ہوتا نہیں تھا۔ بلال جب آتا تو میں کبھی قریبی ہوٹل میں ناشتہ کرنے چلا جاتا۔ کبھی اسے بھیج کر دکان پر ہی ناشتہ منگوا لیتا تھا۔ دوپہر کا کھانا البتہ اکثر ہم دونوں اکٹھے کھایا کرتے تھے۔ رات کے کھانے کا معمول یہ تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد دکان بند کرتے۔ بلال اپنے گھر چلا جاتا اور میں ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتا اور پھر گھر جاتا۔ برسوں سے میرا یہی معمول چلا آ رہا تھا۔

ایک صبح حسب معمول فجر کی نماز پڑھ کر میں اپنی دکان پر پہنچا، تو دور سے ہی مجھے اپنی دکان کے تھڑے پر کوئی سویا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا کہ ''لو بھئی اب اسے جگانا بھی پڑے گا۔''

یہ چرسی موالی، یا فقیر قسم کے لوگ عموماً رات کے وقت جہاں موقع دیکھتے ہیں سو جاتے ہیں اور صبح اٹھ کر کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں۔ان کا کوئی گھر بار نہیں ہوتا، اگر ہوتا بھی ہے تو ان کی حرکتوں کی وجہ سے ان کے بڑے انہیں گھر سے نکال دیتے ہیں، کہ 'کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے'۔

چرسی موالیوں کی حد تک تو ٹھیک ہے، انہیں اٹھاؤ تو خاموشی سے اٹھ کر کسی دوسری دکان کے سامنے جا بیٹھتے ہیں۔ڈر لگتا ہے کسی فقیر سے۔کسی فقیر کو جگایا جائے تو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ دل دہل جاتا ہے۔یہ سوچ کر ہی جھرجھری آجاتی ہے کہ کہیں بد عا ہی نہ دے دیں۔

دکان کے تھڑے پر سوئے ہوئے شخص کو دیکھ کر دل سے یہی دعا نکلی کہ 'یا خدا! یہ کوئی فقیر نہ ہو!'

قریب جا کر جب اسے جھنجوڑنے کا ارادہ کیا تو کچھ عجیب سا لگا۔

یہ کوئی فقیر یا موالی نہیں لگ رہا تھا۔اس نے قیمتی شال اوڑھ رکھی تھی۔یقیناً یہ کوئی مسافر ہوگا جو رات اپنے علاقے کی گاڑی نہ ملنے کے سبب یہیں سو گیا ہوگا۔چند ہی لمحوں میں بے شمار خیالات میرے دماغ میں آئے اور گئے۔بہر کیف میں کب تک اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا؟ دکان تو کھولنا ہی تھی۔ میں نے نرمی سے اس کا گھٹنا ہلایا اور کہا۔

''اٹھو بھئی اپنا بستر کہیں اور لگاؤ مجھے دکان کھولنا ہے!''

مسافر، یا جو کوئی بھی وہ تھا اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ بیٹھا۔

یکا یک میرے پسینے چھوٹ گئے۔

وہ عورت تھی۔بھرپور اور انتہائی خوبصورت جوان عورت!۔

میں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔سٹریٹ لائٹ روشن تھیں۔ چند دکانوں کے اشتہاری بورڈ بھی روشن تھے۔لیکن ان کی روشنی ماند پڑ رہی تھی کیونکہ سورج طلوع ہونے والا تھا۔اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔

اس ملگجی روشنی میں اس عورت کا خوابیدہ حسن عجیب رومان پرور تھا۔ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے گھبرا کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

چوروں کی طرح محتاط انداز میں ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھا کہ مجھے کسی نے اس عورت کے ساتھ اس طرح دیکھ لیا تو، برسوں سے بنی عزت خاک ہو جائے گی۔لیکن تا حد نظر کوئی بھی نہ تھا۔یہ سب لوگ رات دیر تک دکانیں کھلی رکھتے ہیں اور صبح سورج طلوع ہونے کے بعد بھی دیر تک سوئے رہتے ہیں۔ مارکیٹ میں دکانداری بھی دیر سے ہی شروع ہوتی ہے۔اک میں ہی سویرے آجاتا ہوں۔میں نے بتایا ناں کہ میرا یہاں کوئی کام تو تھا نہیں بس گھر سے دکان، دکان سے گھر۔

میرا ملازم بلال بھی دیر سے ہی آیا کرتا تھا۔بلال کے آنے سے پہلے پہلے میں جھاڑ پونچھ کا کام

خود ہی کر لیا کرتا تھا۔ڈسپلے کا مال ٹانگتا، جھاڑ ولگاتا، اور بیٹھ کر تلاوت کیا کرتا تھا۔دکانداری کی حالت یہ تھی کہ بعض اوقات تو پہلا گاہک ہی سہ پہر تین بجے کے بعد آتا۔اور اس وقت تو کسی کے آجانے کی ذرا بھی امید نہ تھی۔ رات بھر گھوم پھر کر پہرہ دینے والا چوکیدار بھی نماز پڑھنے جاتا ہے تو آرام سے ہی آتا ہے۔میری دکان کھل جانے کے بعد اسے یوں بھی اطمینان ہو جاتا ہے۔

''یہ آپ کی دکان ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

میں نے ہمت کر کے اسے دیکھا۔وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔گول چہرہ، گال! جیسے دو سیب رکھے ہوئے ہوں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، دوپٹے سے سر اور پیشانی کو ڈھکا ہوا تھا۔

''جی.....جی.....میری ہے۔'' میں ہکلایا۔

وہ مسکرائی شاید میری ہکلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''معافی چاہتی ہوں! میں پوچھے بغیر آپ کی دکان کے آگے سو گئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔'' مجھے سمجھ نہیں آئی کہ مجھے اس موقع پر کیا کہنا چاہئے تھا یہ سب کچھ میرے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔

وہ تھڑے سے اتر کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''آپ دکان کھولیں۔میں کہیں اور جا کر سو جاتی ہوں۔''

''آپ کون ہیں۔کہاں رہتی ہیں؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''میں بھی کہیں رہتی تھی۔'' اس نے ایک گہری یاسیت سے پُر سانس خارج کی۔

''میرا بھی کوئی گھر تھا۔اب دیکھئے قسمت کہاں لے جائے۔'' کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ایک جانب چل دی۔میں نے دکان کھولتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ایک خیال آیا کہ اسے روکوں پھر یہ سوچ کر کہ کسی نے دیکھ لیا تو میری عزت تار تار ہو جائے گی۔میں خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔چوکیدار کے آنے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔

''جانے دو.....میرا کیا ہے؟'' میں نے سر جھٹک دیا۔

میں شٹر اٹھا کر دکان میں داخل ہوا۔دکان کے اندر ابھی اندھیرا ہی تھا۔پنکھے کے سوئچ آن کئے۔ پچھلے حصے کے بلب جلائے۔شوکیس پر رکھا ہوا مال باہر لٹکانے کے لئے اٹھایا۔حسب عادت ساتھ ہی ساتھ تلاوت بھی کرتا رہا۔

☆☆☆

اچانک ہی وہ عورت دوبارہ آگئی۔

اب کے اس نے شال کا ایک کونا ایک ہاتھ سے اپنی ناک پر روک رکھا تھا۔صرف اس کی آنکھیں

ہی دکھائی دے رہی تھیں

''سنئے!.....اس مارکیٹ میں کوئی بیت الخلاء نہیں ہے؟..... مجھے ذرا.....'' اس نے ٹکڑوں میں بات کی، تاہم جملہ پورا ہوئے بغیر میں اس کی بات سمجھ گیا۔

''یہاں قریب ہی سیڑھیاں ہیں ان کے نیچے ایک بیت الخلاء ہے تو سہی، لیکن اس وقت وہ بند ہوگا۔ پہلے کھلا رہتا تھا چرسی افیمی گند پھیلا دیتے تھے اس لئے اب رات کو بند کر دیا جاتا ہے''

''اگر آپ کو ضرورت پڑ جائے تو کیا کرتے ہیں؟'' اس نے پوچھا

''ہاں.....تو تھوڑی دیر میں کھل جائے گا۔ جس کے پاس چابی ہوتی ہے، اس کی دکان نزدیک ہی ہے.....نو بجے تک آ جائے گا'' میں نے کہا

''پھر میں کہاں جاؤں؟'' اس نے کہا

''جی ی ی ی.....'' میں نے حیران ہو کر کہا کیونکہ میرے خیال میں اس کا یہ سوال بے تکا تھا'' یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تم اپنے گھر جاؤ!''

''گھر.....؟'' وہ ہنسی'' میرا کوئی گھر ہوتا تو ساری رات آپ کی دکان کے تھڑے پر نہ گزارتی؟''

مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ واقعی اگر اس کا گھر ہوتا تو ایک ہی شال میں میری دکان کے تھڑے پر سوئی ہوئی نہ پائی جاتی ۔ چوکیدار نے بھی اگر اسے سویا ہوا دیکھا ہوگا تو چرسی افیمی یا بھکاری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا، کہ اکثر چرسی موالی دکانوں کے آگے سوئے رہتے ہیں ۔ سٹیشن نزدیک ہونے کی باعث بسا اوقات دوسرے شہر سے آئے ہوئے مسافر بھی یہی کرتے ہیں سٹیشن سے نکل آتے ہیں اپنے علاقے کی کوئی گاڑی نہیں ملتی تو کسی دکان کے آگے سو جاتے ہیں۔ اور دکانیں کھلنے سے پہلے پہلے خود ہی اٹھ بھی جاتے ہیں یا پھر دکاندار آ کر اٹھا دیتے ہیں۔

''تو تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟'' میں نے کہہ دیا

''نہیں! میرا کوئی گھر نہیں ہے!.....میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ میرے تین بھائی ہیں ۔ شادی شدہ.....ان کی بیویاں مجھے نوکرانی سے زیادہ نہیں سمجھتیں۔ میں سارا سارا دن ان کے آگے سارے کام کرتی ہوں ان کے، ان کے بچوں کے.....اور جب رات ہوتی ہے تو سب اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتی ہیں۔ میں صحن میں پڑی رہتی ہوں۔ بارش اگر ہو جائے تو ساری میرے اوپر ہوتی ہے۔ سمٹی سکڑتی بیٹھ کر رات گزار دیتی ہوں کوئی بھی مجھے اپنے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ بھائی بھی مجبور ہیں پرائی عورتوں کے آگے یتیم سگی بہن کی بات سننے کی بھی انہیں فرصت نہیں.....میں بھائیوں کا گھر چھوڑ آئی ہوں ان سب کو سوتا ہوا چھوڑ آئی ہوں.....'' اس کا لہجہ دل پگھلا دینے والا ہوتا گیا

''کہاں ہے تمہارے بھائیوں کا گھر؟''

''میں نے کہا ناں کہ میں چھوڑ آئی ہوں!.....اس کا مطلب یہی ہے کہ میں.....چھوڑ آئی ہوں۔ میں وہاں دوبارہ جانا نہیں چاہتی.....'' اس نے سر ہلایا تو اس کی ناک کی نوک پر ٹکا شال کا کونہ ڈھلک گیا اور اس کا دلکش چہرہ نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ اس نے بھی دوبارہ چہرہ ڈھانپنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

''پھر بھی کون ہیں تمہارے بھائی؟.....کہیں قریب ہی رہتے ہیں؟ کیا میں انہیں جانتا ہوں؟.....''

''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا مجھے ان کے حوالے کریں گے۔ مجھے یقین ہے مجھے کوئی بھی تلاش نہیں کرے گا''

''نہیں نہیں میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔''

'' مجھے اس وقت بیت الخلاء کی شدید ضرورت ہے۔ آپ کو پتہ ہے صبح جاگنے کے بعد سب سے پہلے کیا کام کیا جاتا ہے؟'' وہ زیر لب مسکرائی

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہاں تو ایسا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ میں نے بتایا ناں کہ جس دکاندار کے پاس اس مارکیٹ کے بیت الخلاء کی چابی ہے، وہ نو بجے تک آئے گا، بلکہ زیادہ تر دکاندار نو بجے کے بعد ہی آتے ہیں۔''

''تو میں نو بجے تک بیٹھی رہوں.....؟ میں کیسے سمجھاؤں؟.....میں.....'' وہ بے بسی سے بولی۔

میں اس کی حالت سے بے خبر نہیں تھا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔

''میں یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ اگر اس وقت' آپ کو بیت الخلاء جانا پڑ جائے تو کیا کریں گے؟''

''اول تو میں نمٹ نمٹا کر آیا ہوں پھر بھی کوئی ضرورت پڑ ہی جائے تو میرا گھر دور نہیں ہے۔''

''پھر مہربانی کریں مجھے اپنے گھر لے چلیں صرف ایک لوٹا۔ صرف ایک لوٹا پانی مجھے چاہئے ہوگا.....بس!.....''

''لیکن میں.....میں کیسے؟.....'' میں ہکلا کر بولا۔

صورت حال میرے لئے مزید سنگین ہو گئی تھی۔ میں یہاں 'چھڑا' رہتا تھا۔ چھڑوں کو ویسے بھی کوئی مکان کرائے پر نہیں دیتا۔ یہ تو مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے بیوی بچے ایبٹ آباد میں ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں شریف آدمی ہوں اب تک میرے گھر پر کوئی محلّہ دار کوئی رشتہ دار تک نہیں آیا جسے کوئی کام ہوتا ہے وہ دن میں کسی بھی وقت دکان پر آ جاتا ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرے گھر نہ ٹی وی ہے نہ کوئی باتیں کرنے والا۔ رات کو عشاء کے بعد میں صرف سوتا ہوں۔ اور صبح سویرے اٹھ کر مسجد اور وہاں سے سیدھا دکان پر.....ایسے میں کسی محلّہ دار نے میرے گھر سے کسی عورت کو نکلتا یا داخل ہوتا دیکھ لیا تو مکان ہی خالی کروا دیں گے۔

''نہیں! میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔'' میں نے دوٹوک کہا۔ پتہ نہیں کون عورت ہے؟ میں اس کے ساتھ ذرا سی نیکی کروں اور محلے بھر میں بدنام ہو جاؤں۔

''پھر کسی ایسی جگہ کا پتہ بتائیں جہاں میں.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر چپ ہو گئی۔ میں

سب سمجھ رہا تھا لیکن کیا کرتا؟

''مسجد کے استنجا خانے ہیں لیکن وہ بھی بند کر دیئے گئے ہوں گے۔'' میں نے بات کی لیکن اس بات پر مجھے خود ہی افسوس بھی ہوا کہ ایک عورت مسجد کے استنجا خانے میں کیسے جا سکے گی؟

''میرے پاس کپڑوں کا یہی ایک جوڑا ہے جو میں پہنے ہوئے ہوں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر یہ بھی گندا ہو گیا تو.....'' اس نے خوفناک صورت حال کا نقشہ کھینچا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس مارکیٹ میں مزید دو گھنٹے تک نہ کوئی گاہک آئے گا نہ کوئی دکاندار۔ بہت ہوا تو اخبار والا آ کر بند دکانوں میں اخبار اڑس کر چلا جائے گا یا پھر چوکیدار ہو گا جو ٹہلتا ہوا آئے گا اور مجھے اپنی شکل دکھا کر گویا مجھے گواہ بنا کر یا حاضری لگوا کر دائیں سے بائیں چلا جائے گا۔

اس عورت کا میری دکان میں زیادہ دیر تک موجود رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا، کہ چوکیدار نے اسے یہاں صبح ہی صبح دیکھ لیا تو بھی بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔

''مجھے تکلیف ہو رہی ہے..... یہاں ایسی کوئی ہسپتال وغیرہ بھی قریب نہیں ہے جہاں.....'' اس نے جملہ پھر ادھورا چھوڑ دیا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتی تھی کہ میں ادھورے جملے سے ہی اس کا موقف سمجھ رہا ہوں۔

''نہیں.....! ہسپتال دور ہے ہسپتال جانے کے لئے گاڑی کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔''

وہ دکان سے باہر نکلی۔ دائیں بائیں دیکھ کر بولی۔

''یہاں دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔ کسی دکان کی آڑ میں بیٹھ جاؤں؟''

وہ ایک 'مذموم' سے کام کے لئے میرے اجازت مانگ رہی تھی۔ یہ اس سے بھی برا تھا کیونکہ سب دکاندار جانتے تھے کہ میں سب سے پہلے آتا ہوں۔ سب مجھ سے ہی پوچھتے۔ اور مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔

''ادھر آؤ!'' میں نے اسے دکان کے اندر بلایا۔

''دیکھو! میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔''

''تو کیا عزت دار آدمی بیت الخلاء کبھی نہیں جاتا'' وہ تیزی سے بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں اور کسی نے دیکھ لیا تو میں.....''

''کون دیکھے گا؟ کسے اتنی فرصت ہے کہ آپ کی نگرانی کرے۔ آپ چلیں آپ کی بیوی سے میں خود ہی بات کر لوں گی۔ اسے اپنی مجبوری بتا دوں گی۔''

''میں اپنے گھر میں چھڑا رہتا ہوں..... بیوی بچے نہیں ہیں میرے ساتھ۔''

''پھر کیا ہوا! میں کوئی ہمیشہ کے لئے تو آپ کے گھر نہیں جا رہی!''

''یہ بات نہیں ہے.....'' میں جلدی سے بولا۔

''اچھا سنو! یوں کرتے ہیں تم یہاں سے سیدھی چلی جاؤ بینک تک..... بینک تک پہنچو گی تو میں

تمہارے قریب سے گزروں گا۔ ہم راستے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ مجھے دیکھتی رہنا اور میرے پیچھے پیچھے آتی رہنا۔ میں جس گھر میں داخل ہوں گا تو تم بھی اپنے آگے پیچھے دیکھ کر اس گھر میں گھس جانا۔ اگر اس وقت کوئی تیسرا شخص گلی میں موجود ہو تو تم میرے گھر داخل نہ ہونا آگے نکل جانا..... سمجھیں؟''

''سمجھ گئی۔'' وہ بولی

''ٹھیک ہے تم نکلو! میں چند منٹ میں دکان بند کر کے آتا ہوں۔''

''زیادہ منٹ نہ لگا دینا، میرا مثانہ پھٹ جائے گا۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

میں نے باہر لٹکانے والے ہینگر اٹھائے اور دکان سے باہر نکل آیا کہ اگر کوئی شخص مجھے دیکھ رہا ہو تو مال ٹانگ دوں گا۔ حسب توقع مارکیٹ سنسان ہی تھی۔

وہ سست روی سے چلتی ہوئی کچھ آگے نکل گئی تو میں نے جلدی سے ہینگر دوبارہ شوکیس پر رکھ دیئے۔ ایک ہی تالا اٹھایا اور شٹر کو حتی الامکان بے آواز نیچے کیا لیکن وہ شٹر ہی کیا جو آواز نہ کرے۔ وہ عورت پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ شٹر بند کر کے بھی میں دھڑکتے دل کے ساتھ چند لمحے وہیں کھڑا رہا کہ شٹر کی آواز سن کر ہی شاید چوکیدار آ نکلے۔ لیکن شاید چوکیدار کسی اور جانب نکل گیا تھا یا شاید مسجد سے ہی نہ نکلا ہو۔

بہر کیف میں تیزی سے چلتا ہوا اس عورت سے آگے نکل گیا دو گلیاں چھوڑ تیسری گلی میں میرا گھر تھا۔ چند بچے بستے لٹکائے سکول کی جانب رواں دواں تھے۔ کچھ کے ساتھ ان کی ماں، کسی کے ساتھ باپ یا بھائی بھی تھے لیکن میری گلی خالی ہی تھی۔

میں نے جلدی سے تالا کھولا اور اندر گھسنے میں قطعی دیر نہیں لگائی، کیونکہ اس وقت میرا گھر میں گھسنا بھی خلاف معمول تھا۔ کوئی پڑوسی دیکھ لیتا تو سوال کر سکتا تھا۔ اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

میرا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ابھی میری سانسیں اعتدال پر بھی نہیں آئی تھیں کہ وہ عورت گھر میں داخل ہو گئی۔

''تمہیں دیکھا تو کسی نے نہیں؟'' میں نے عجلت سے پوچھا۔

''نہیں کوئی بھی نہیں تھا گلی میں۔'' کہتے ہوئے وہ بیت الخلاء میں گھس گئی۔

☆☆☆

میں نے صراحی سے پانی انڈیلا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں تھا لیکن منہ تک لے جانا مشکل ہو رہا تھا۔ خدشہ تھا کہ پانی سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔

میرے نتھنوں سے شائیں شائیں کی آواز نکل رہی تھی اور دل مجھے اپنے کنپٹیوں میں دھڑکتا

ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پانی کا گلاس میں نے قریب رکھی تپائی پر رکھ دیا۔

وہ عورت بیت الخلاء سے باہر نکلی میری جانب دیکھتے ہوئے خجالت سے مسکرائی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے بے حد احسان کیا ہے مجھ پر۔''

''تمہارے شکریئے کو میں چاٹوں یا فریم کروا کر دیوار پر لٹکاؤں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ درشت ہو گیا تھا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟.....''اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔

''چھڑے آدمی کو کوئی بھی شریف آدمی اپنا مکان کرائے پر نہیں دیتا اور شریف محلے میں تو چھڑے آدمی کو مکان کا ملنا بے حد مشکل ہوتا ہے..... یہ میری شرافت ہے کہ مجھے یہاں مکان مل گیا ہے۔''میں نے کہا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''میں کوئی انگریزی تو نہیں بول رہا۔تم چھڑے کا مطلب نہیں سمجھتیں؟''میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

''میں یہاں اکیلا رہتا ہوں.....اکیلا.....تم میرے گھر آ تو گئی ہو.....فارغ بھی ہو گئی ہو تمہیں آتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا۔اس کی کیا ضمانت ہے کہ جونہی تم باہر قدم نکالو میرا کوئی پڑوسی بھی عین اسی وقت گھر سے باہر نکلے۔ یہ سمجھو کہ میری عزت کا جنازہ نکل گیا۔''

''آپ.....آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں.....میں خود بہت پریشان ہوں۔ان شاء اللہ آپ کی عزت پر میری وجہ سے کوئی حرف نہیں آئے گا..... یہ میرا وعدہ ہے۔'' وہ ایک عزم سے بولی۔

''تم نہیں سمجھو گی میری پریشانی!''میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا آدھے کمرے میں چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک تپائی تھی جس پر روزمرہ ضرورت کے چند برتن بے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی میز تھی جو چارپائی سے قدرے اونچی تھی اس پر قرآن مجید اور چند اسلامی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔

''آپ نے سچ کہا۔میں واقعی آپ کی پریشانی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔لیکن اب سمجھ آ گئی ہے۔میرا خیال تھا کہ آپ گھر بار والے ہیں آپ کی فیملی ہو گی۔بیوی بچے ہوں گے۔ان کا مسئلہ ہو گا۔لیکن آپ صحیح سوچ رہے ہیں.....اگر مجھے کسی نے آپ کے گھر سے نکلتا ہوا دیکھ لیا تو آپ ہی کی نہیں میری عزت بھی.....''

پتہ نہیں اس کی یہ بیماری تھی یا عادت کہ جملہ ادھورا چھوڑ دیتی تھی۔

''بہر حال آپ پریشان نہ ہوں۔اللہ بہتر کرے گا۔''

''پریشان کیسے نہ ہوں..... مجھے دکان پر جانا ہے۔میرا ملازم آنے والا ہے۔اگر دکان بند ہوئی تو وہ سیدھا گھر آ جائے گا اور اسے میں دروازے سے واپس نہیں بھیج سکتا۔وہ اندر ضرور آئے گا۔اس لئے کہ میں چھڑا ہوں۔لیکن تم نہیں سمجھو گی 'چھڑے' کا مطلب!''

''اگر آپ کو دکان پر جانا ہے ناں.....تو چلے جائیں.....میں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکلوں گی.....جب مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہو گا۔۔آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے.....میں اپنی وجہ سے محلے میں آپ کی عزت خراب نہیں ہونے دوں گی.....''

میں سوچ میں پڑ گیا.....ترکیب اچھی تھی۔

''لیکن دن بھر میرے دروازے کو تالا لگا رہتا ہے۔کیونکہ میں رات کو گھر پر ہوتا ہوں اور دن کو دکان پر، جمعہ کے دن دکان کی چھٹی ہوتی ہے تو میں اپنے بیوی بچوں میں چلا جاتا ہوں۔اگر کسی نے دن دیہاڑے میرا دروازہ کھلا دیکھا تو بغیر دستک دیئے ہی اندر آ جائے گا،اس لئے کہ.....''

''آپ چھڑے ہیں.....''اس نے میری بات کاٹ کر جملہ پورا کر دیا۔

''آپ دکان پر جائیں اور باہر سے تالا لگا جائیں۔میں آپ کے آنے تک یہیں رہوں گی بلکہ اپنی نیند بھی پوری کر لوں گی۔اور پھر رات کے اندھیرے میں چلی جاؤں گی۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

''جہاں بھی منہ اٹھا۔آپ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے میری وجہ سے اپنا نقصان نہ کریں۔مجھے شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے آپ دکان بند کر کے گھر آئے ہیں۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گھر میں بند کر کے تالا لگا کر دکان پر چلا گیا اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

جس کا خدشہ تھا وہ ہو گیا۔یعنی گلی میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی اگر وہ عورت میرے گھر سے نکلتی تو لامحالہ دیکھ لی جاتی اور لوگ میرا جلوس نکال دیتے۔بلکہ مجھے اس محلے سے ہی نکال دیتے۔نہ صرف یہ بلکہ مجھے یہاں سے اپنا کاروبار بھی سمیٹنا پڑ جاتا۔گھر کو تالا لگا کر مجھے بے حد سکون محسوس ہوا۔لیکن یہ سکون عارضی ثابت ہوا۔

دکان پر جا کر بھی مجھے بار بار یہ خیال ستاتا رہا کہ میں ایک غیر عورت کو گھر میں بند کر آیا ہوں۔عورت ہے آخر زندہ جان ہے۔چھینک کھانسی پر انسان کو اختیار نہیں ہے۔اگر کسی نے اس کی آواز سن لی اور دروازے پر تالا دیکھا تو یہ بھی میری بدنامی ہو گی۔لوگ کہیں گے پتہ نہیں کب سے عورت کو اندر قید کر رکھا ہے۔کس مقصد کے لئے قید کیا ہوا ہے؟

بلال آیا اور جب اس نے ناشتے کی بات کی تو یکا یک مجھے خیال آیا کہ ناشتہ تو اس عورت نے بھی نہیں کیا ہو گا۔میں نے بلال سے کہا کہ تم دکان پر بیٹھو میں ناشتہ گھر پر ہی کر آتا ہوں۔تھوڑی دیر کمر بھی سیدھی کر لوں گا۔یہ میرا معمول نہیں تھا لیکن کبھی کبھی میں اس طرح گھر چلا جایا کرتا تھا۔اور ایسا عموماً ہفتے کے دن کیا کرتا تھا،کہ سفر کی تھکن ہوتی تھی۔

☆☆☆

میں نے نانبائی سے دو افراد کا ناشتہ لیا دودھ،انڈے،چینی،چائے کی پتی لی اور گھر کی راہ لی۔

اتنی ہی دیر میں اس عورت نے گھر کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ بستر جھاڑ دیا تھا۔ نئی چادر بچھا دی تھی۔ دیواریں صاف کر کے پورے گھر میں جھاڑو بھی لگا دی تھی۔ کمرے میں کبھی میں نے پوتا نہیں لگایا تھا۔ اس نے اندر باہر پوتا لگا کر ساری دھول مٹی دھو ڈالی تھی۔

یہ سب کچھ اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کر لیا تھا۔ مجھے ناشتے سے لدا پھندا دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''یہ کس لئے؟''

''تمہارے لئے۔'' میں نے کہا۔

''اپنے لئے، بلکہ دونوں کے لئے۔''

''چلیں حساب برابر ہو گیا۔ آپ نے میرا خیال رکھا۔ میں نے آپ کا خیال رکھا کہ ایک 'چھڑا' آدمی اپنے گھر کی صفائی نہیں کرتا، تو میں سارا دن اس گھر میں بند رہ کر اور کچھ نہیں تو صفائی ہی کر ڈالوں۔''

گھر میں گھستے ہی ہمیشہ عجیب سی یساند میرا استقبال کیا کرتی تھی۔ آج سب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ مجھے وہ عورت کچھ اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔

''چلو ہاتھ دھولو! ناشتہ کریں۔''

''ضرور کروں گی..... میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔'' وہ بولی۔

''ارے تو بتایا کیوں نہیں؟..... میں جاتے جاتے دے جاتا!'' مجھے افسوس سا ہوا کہ یہ پوچھنا تو میرا کام تھا۔

''آپ کو دکان سے دیر ہو رہی تھی۔ آپ کہہ رہے تھے کہ دکان بند ہوئی تو ملازم گھر آ جائے گا!''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس وقت مجھے بلال کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

بہر کیف ہم نے ایک ہی بلکہ واحد چارپائی پر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اجنبیت ختم ہو گئی تھی

''آپ مجھے کپڑے دھونے کا صابن لا دیں۔ میں بستر کی چادر دھو ڈالوں۔ دیکھیں کتنی گندی ہو رہی ہے؟ آپ کو کیسے نیند آ جاتی ہے اس گندے بستر میں؟'' وہ بولی۔

''میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے صابن لا دیں۔''

اس نے دوبارہ کہا تو میں نے تکلفاً منع کرنے کی بجائے اس کے کہے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جا کر قریبی دکان سے کپڑے دھونے کا صابن لے آیا

''کوئی سبزی وغیرہ بھی لے آتے۔ میں پکا دیتی۔ فارغ ہی تو ہوں۔'' ایک اور فرمائش تیار تھی۔

میں سبزی بھی لے آیا اس نے نہ جانے کہاں کہاں سے میلے کپڑے کھینچ نکالے تھے۔ میں نے کہا۔

''باقی کے کپڑے رہنے دو۔ صرف بستر کی چادر دھو ڈالو بس! صابن کم پڑ جائے گا پھر اور منگواؤ گی۔''

''منگواؤں نہیں تو کیا خود جا کر لاؤں گی؟'' وہ مسکراتی تو جانے کیوں میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا گویا سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں دکان پر، کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو دوپہر میں لے آؤں گا۔''

''کپڑے دھونے کے برتن نہیں ہیں تمہارے ہاں، اس چھوٹے سے برتن میں مشکل سے دھلیں گے۔'' اس نے غسل خانے کا ٹب دکھاتے ہوئے کہا۔

''تم چند گھنٹوں کی مہمان ہو پھر چلی جاؤ گی ایسی چیز خریدنے کا مجھے کیا فائدہ؟ جو تمہارے بعد میرے کام نہ آئے؟''

وہ پھر مسکرائی۔

''میں خرید کر لانے کا نہیں کہہ رہی۔ یہ کہہ رہی ہوں.....'' کچھ کہتے ہوئے وہ رکی گویا الفاظ تول رہی ہو۔ پھر قدرے توقف سے بات بدل کر بولی۔

''چلیں میں گزارا کر لوں گی۔''

میں دکان چلا گیا۔ لیکن دل گھر میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ لیکن اس بار کسی خدشے یا اندیشے کی بجائے خوشگوار سا احساس حاوی تھا۔

ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو میں نماز پڑھ کر گھر چلا گیا وہ بھی نماز پڑھ رہی تھی۔ اسے نماز پڑھتا دیکھ کر مجھے یک گونہ روحانی تسکین ہوئی کہ یہ عام عورتوں کی طرح نماز ٹرخانے والی نہیں ہے۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا اور اسے نماز پڑھتے دیکھتا رہا۔

''ترکاری تو میں نے بنا دی ہے۔'' وہ نماز سے فارغ ہوئی ابھی جائے نماز پر ہی تھی کہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''چمچ سے کھائیں گے؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''مطلب یہ کہ پکانے کے لئے سبزی مصالحہ تو آپ نے لا دیئے۔ میں نے سالن بنا دیا۔ ہمارے ہاں سالن کو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔'' وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ہوٹل سے پکا پکایا کھانا لا لا کر کھانے کا عادی تھا۔ کبھی گھر میں آٹا گوندھنے اور پکانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ میں فوراً اٹھا، قریبی ہوٹل سے چند روٹیاں لے آیا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے گھر کی واحد چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھ کر کھایا۔ اس نے سالن بھی بہت عمدہ بنایا تھا۔ یا شاید میں نے بہت دن بعد گھر کا پکا کھایا تھا۔

دکان پر گیا تو بلال سے کہہ دیا کہ تم کھانا کھا لو جا کر۔ میں کھا آیا ہوں۔ یہ بات بھی خلاف معمول نہیں تھی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ میں نماز پڑھ کر آتا تو پھر وہ جاتا اور نماز پڑھ کر کھانا کھا کر آتا تھا۔ کبھی ہم دکان پر

ہی منگوا لیتے اور اکٹھے کھا لیتے۔

رات کو جب میں گھر کی جانب جا رہا تھا تو میرے پاس پھلوں کے دو تھیلے بھی تھے۔

☆☆☆

مطلع شام سے ہی ابر آلود تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی لگتا تھا قریب ہی کہیں بارش ہو رہی ہو۔ رات کھانا کھا کر ہم فارغ ہوئے تو بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

''لو! بارش بھی شروع ہو گئی۔''

''تو کیا ہوا؟ یہ تو قدرتی کام ہیں۔''

''قدرتی کام تو ہیں۔ تمہارے لئے مسئلہ ہو جائے گا۔ تم کیسے جاؤ گی؟ برستی بارش میں؟''

''میں.....؟ میں کل چلی جاؤں گی! مجھے کون سی جلدی ہے؟'' وہ اتنی آسانی سے بولی گویا بارش اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔

''تو کیا رات بھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے ؟'' مجھے تھرتھری آ گئی۔

''مجبوری ہے! اب بارش میں کہاں جاؤں گی؟ خود سوچیں آپ؟''

''میری بھی مجبوری کو دیکھو ناں! میرے گھر میں ایک ہی چارپائی ہے۔ اس پر تم سوؤ گی یا میں؟''

''آپ ہی سو جانا۔ میں فرش پر ہی لیٹ جاؤں گی۔ مسافر ہوں مجھے تو کہیں بھی نیند آ جائے گی۔''

میں دعا کر رہا تھا کہ بارش تیز نہ ہو بلکہ ختم ہو جائے تو یہ عورت میری جان چھوڑے ورنہ کل پھر اسے 'قید' کر کے دکان پر جانا پڑے گا۔ بارش تیز تو نہ ہوئی لیکن ختم بھی نہ ہوئی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی تھی۔

اس نے اپنے لئے فرش پر ہی ایک چادر بچھا لی تھی اور اپنی شال لے کر لیٹ بھی گئی تھی۔ اسے لیٹے دیکھ کر مجھے غصہ آ رہا تھا، کہ یہ عورت مجھے بدنام کرنے کے پروگرام پر پوری طرح عمل کر رہی ہے۔ یہ کب جائے گی اور میری جان میں جان آئے گی۔

''ابھی سو جاؤ! لیکن صبح سویرے تمہیں نکلنا ہو گا جس طرح اندھیرے میں آئی ہو اسی طرح،.....
میں اپنی بدنامی نہیں چاہتا۔''

''ٹھیک ہے مجھے صبح اذان کے وقت جگا دیجئے گا۔ میں نماز پڑھ کر نکل جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کروٹ بدل لی۔

میں نے بھی بتیاں بجھا دیں اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

''آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟'' اندھیرے میں اس کی آواز اُبھری۔

''وہ ایبٹ آباد میں ہیں۔''

''انہیں آپ نے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟''

''ایبٹ آباد میں میرا ذاتی گھر ہے، میرے والدین ہیں۔ میرے بچے پڑھ رہے ہیں۔ میں جمعرات کی شام کو چلا جاتا ہوں اور دو راتیں اور جمعہ کا ایک دن اپنے بچوں میں گزار کر ہفتے کی صبح واپس آ جاتا ہوں۔''

''آپ کی بیوی یہاں نہیں آتی؟''

''کیسی بات کرتی ہو؟ اسے کیا ضرورت ہے یہاں آنے کی؟ یہاں سارا دن اکیلی رہے گی۔ خود میں دکان پر رہوں گا۔ اس کی فرمائشیں کون پوری کرتا پھرے گا؟ اور پھر یہ گھر کوئی دو افراد کے رہنے کا ہے؟''

کچھ دیر خاموشی رہی۔

''ایک بات کہوں آپ سے؟'' اسی نے خاموشی کو توڑا۔

''اب تک ساری باتیں بغیر پوچھے کرتی رہی ہو اور اب ایسی کیا بات ہے جو مجھ سے پوچھ کر کرنا چاہتی ہو؟''

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر یہ خاموشی طول پکڑ گئی۔

''آپ نے اب تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے یہ پوچھنے کی۔ جہاں تمہاری مرضی ہو چلی جاؤ!'' میں نے فوراً کہا۔

''یہاں سے جاؤ..... جہاں جی چاہے جاؤ'' اس نے شاید میرے لہجے میں بیزاری محسوس کی ہو گی۔

چند منٹ خاموشی رہی۔ میں سمجھا کہ اب سو گئی ہو گی میں نے بھی حسب معمول ایت الکرسی کا ورد شروع کیا۔ میری عادت سی ہو گئی ہے کہ نیند آتے تک میں ایت الکرسی پڑھتا رہتا ہوں۔

بارش کی وجہ سے ٹھنڈ کا احساس بڑھ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے تو اسے بھی ٹھنڈ لگ رہی ہو گی۔ وہ تو ٹھنڈے فرش پر لیٹی ہوئی ہے۔ سوچا کہ اٹھ کر بتی جلاؤں اور کمبل نکال کر اسے بھی دوں اور خود بھی کوئی کپڑا وغیرہ لے لوں ورنہ ٹھنڈ کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔

ہاتھ بڑھا کر میں نے بلب کا سوئچ آن کیا دیکھا تو وہ چارپائی سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔

''یہ کیا؟ میں سمجھا کہ تم سو گئی ہو گی!''

''نیند آئے گی تو سو جاؤں گی۔'' اس نے قدرے رکھائی سے کہا۔

میں نے اس کے لہجے کی قطعی پروا نہیں کی۔ بکس میں سے کمبل نکالا۔ میرے پاس وہ ایک ہی کمبل تھا۔ اسے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ لو! سردی بڑھتی جا رہی ہے۔'' ایک چادر اپنے لئے بھی نکال لی۔ کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا بارش اگرچہ کمرے میں نہیں آتی تھی تاہم تیز ہوا کے ساتھ کبھی کبھی بوچھار آ ہی جاتی تھی۔ نمی کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے دوبارہ بتی بجھا دی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

''آپ نے میرا نام بھی نہیں پوچھا ابھی تک؟''

وہ شاید ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی کمرے کا دروازہ بند کرنے سے گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔

''نام پوچھ کر کیا کروں گا ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

''مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں؟''

''کہیں بھی جاؤ گی تو پچھتاؤ گی۔ بہتر یہ ہے کہ جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ اپنے بھائیوں کے پاس جاؤ۔''

''بھائی.....؟'' وہ ہنسی

''میرے بھائی ..... بھائی نہیں رہے۔ وہ اپنی بیویوں کے شوہر ہیں، اور میری بھابیوں کو یہ احساس ہے کہ اگر میں ان کے پاس رہی تو میرے بھائی میری شادی کی فکر کریں گے۔ انہوں نے میری شادی کہیں کرنے کی کوشش بھی کی تو اس میں کچھ نہ کچھ خرچہ ضرور ہوگا۔ اس لئے بھابیاں مجھے اپنے میاؤں کے نزدیک نہیں دیکھنا چاہتیں۔ میں اپنے گھر میں رہتے ہوئے اپنے بھائیوں سے بات کرنے کو ترستی رہی۔ مجھے یقین ہے کہ آج کی رات میری بھابیاں سکون سے سوئیں گی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں نے کہیں اپنا منہ کالا کر لیا ہوگا اور ایک رات گھر سے باہر گزار کر دوبارہ ان کے گھر کبھی نہیں آسکتی۔ انہوں نے میرے بھائیوں کو خوب خوب بھڑکا دیا ہوگا، میرے خلاف!''

میں خاموش رہا۔ میں کہتا بھی تو کیا کہتا۔

''ایک بات کہوں!.....اگر برا نہ مانیں تو؟'' وہ بولی۔ میں خاموش ہی رہا۔

''آپ کا کوئی جاننے والا کوئی دوست ہے تو اس سے میرا نکاح کروا دیں۔''

میں اُٹھ بیٹھا۔ کتنی مشکل بات اس نے کس قدر آسانی سے کہہ دی تھی۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں نے اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ میرے جاننے والوں کو خبر ہونے سے پہلے پہلے تم میرے گھر سے چلی جاؤ اور تم چاہتی ہو کہ میں جان بوجھ کر اپنے دوستوں کو تمہارے وجود سے آگاہ کروں؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بالکل چپ ہو گئی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی تو میں پھر لیٹ گیا۔ میرے پاس سونے کا یہی وقت ہوتا تھا۔ میں دن میں نہیں سو سکتا تھا۔

☆☆☆

فجر کی اذان سے کچھ پہلے میری آنکھ کھلی تو میں نے اٹھ کر بتی جلائی۔

دیکھا تو چارپائی سے نیچے کمبل گرا ہوا تھا اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ کوئی ہے۔ معاً یاد

آیا کہ یہ تو وہی عورت ہے جو کل صبح سے میرے گھر میں 'قید' ہے۔

پھر ساری باتیں یاد آ گئیں۔ کمبل اٹھانے سے وہ بھی بیدار ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ جواباً میں بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔ میں سیدھا مسجد چلا گیا۔

نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ بھی نماز سے فارغ ہو چکی تھی۔

''ناشتہ میں گھر میں ہی بناؤں گی۔'' وہ بولی۔

''صرف سامان لا دیں۔''

''ابھی تو تمام دکانیں بند ہیں، دیر سے کھلیں گی۔ ناشتہ کرتے کرتے دیر ہو جائے گی۔ اس وقت سب لوگ گھروں میں بند ہیں۔ اکا دکا نمازی ہیں وہ بھی تھوڑی دیر میں اپنے اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم اب دیر بالکل نہ کرو۔ رات تو بارش کی وجہ سے رک گئیں لیکن اب رکنے والی بات نہ کرنا۔ جتنا جلدی ہو نکل لو۔'' میں نے دوٹوک کہا۔

''کیسے آدمی ہیں آپ؟ کوئی گھر سے جا رہا ہو تو کہتے ہیں ٹھہرو، ناشتہ کر کے جانا یا چائے پی کر جانا .....کھانا کھا کر جانا اور آپ ایسے وقت میں گھر سے نکال رہے ہیں جب کہ ناشتے کا وقت ہے؟''

''تمہیں میرے گھر آئے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چلے ہیں، اور یہ چوبیس گھنٹے میرے لئے بڑے بھاری گزرے ہیں۔ اس لئے کہتا ہوں کہ دیر کئے بغیر نکل لو ورنہ کل والا مسئلہ پھر پیدا ہو جائے گا۔''

''اگر میں نہ جانا چاہوں تو آپ زبردستی کریں گے؟''

''زبردستی تو نہیں نکال سکتا لیکن تم میری پوزیشن کو سمجھو۔ کل کوئی نہیں آیا تو آج ضرور کوئی نہ کوئی آ جائے گا۔ آخر کب تک تم میرے گھر پڑی رہو گی مجھے سکون سے کوئی کام کرنے دو۔ میرے لگے بندھے معمولات ہیں۔''

''میں نے آپ کو اپنی مجبوری بتا دی ہے پھر بھی آپ مجھے اپنے گھر سے نکال رہے ہیں۔''

''تم میری ذمہ داری نہیں ہو!'' میں نے فوراً کہا۔

''مجھ پر تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

''ایک بات کہوں، اگر اجازت ہو تو؟'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''بولو جلدی بولو۔''

''مجھے اپنے گھر سے نہ نکالیں! میں آپ کی خدمت کروں گی۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں تمہیں کیسے اپنے گھر رکھ سکتا ہوں .....ایک جوان عورت کو؟ ایک ہی رات میرے لئے عذاب سے کم نہیں تھی۔ اور تم مستقل رہنے کی بات کر رہی ہو؟''

''دیکھئے میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بھائیوں سے مجھے قطعی بھی امید نہیں ہے کہ وہ مجھے تلاش

کریں گے یا میرا گھر بسائیں گے۔آپ شریف النفس آدمی ہیں۔آپ کے گھر رات بھر رہ کر مجھے انوکھے تحفظ کا احساس ہوا ہے میں آپ کے گھر سے جانا نہیں چاہتی۔آپ جیسا شخص مجھے پوری دنیا میں نہیں ملے گا۔''

''لیکن میں تمہیں اپنے گھر کیسے رکھ لوں؟ کیوں میری عزت کا جنازہ نکال رہی ہو؟؟''

''آپ مجھے اپنی ذمہ داری میں لیں۔مجھ سے خود نکاح کر لیں۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا؟ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔اس مہنگائی میں ایک بیوی کا صحیح طور پر بھی حق ادا کرنا مشکل ہے۔دو کا کیسے ادا ہوگا؟''

''میں کچھ بھی نہیں مانگتی،صرف پناہ مانگتی ہوں آپ سے!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''میں کوئی شیطان ہوں جو مجھ سے پناہ مانگ رہی ہو؟'' مجھے یہی سمجھ آئی۔

''آپ کی پناہ مانگتی ہوں معاشرے میں بکھرے ہوئے شیطانوں سے۔'' اس نے 'کی' پر زور دے کر وضاحت کی۔لگتا تھا یہ عورت اسلامی تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ ہے۔

''اللہ کے واسطے مجھے اپنے گھر سے نہ نکالئے۔مجھے اپنی نوکرانی بنا کر رکھئے میں آپ کی خدمت کروں گی۔''

میں نے کہا۔

''ایسے کیسے ہوسکتا ہے تمہیں معلوم نہیں اسلام میں کسی غیر مرد کے ساتھ عورت کا بغیر نکاح کے اکیلے رہنا کتنا قبیح فعل شمار ہوتا ہے؟''

''اسی لئے کہتی ہوں کہ مجھ سے نکاح کر لیجئے!''

''نہیں نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔سو مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔تم جاؤ! بس کہیں اور چلی جاؤ۔کسی ایسے شخص کا گھر بساؤ جسے بیوی کی ضرورت ہو۔میری ایک بیوی ہے۔کافی است ومعافی است۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''تو آپ ہی اپنے کسی دوست عزیز سے میرا نکاح پڑھوا دیں۔میرا کون ہے یہاں جاننے والا۔کون ہے میرا سرپرست؟''

''پھر وہی بات! میں لوگوں کے سوالات سے بچنا چاہتا ہوں۔میں نہیں چاہتا کہ جہاں سے گزروں لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں۔مجھے دیکھ کر آپس میں چہ مگوئیاں کریں۔''

''آپ کو کیا اندیشہ ہے؟ لوگ کیا سوال کریں گے آپ سے اور آپ کو کس سوال کا جواب دینے میں مشکل پیش آرہی ہے؟''

''کئی سوال ہیں۔تم نہیں سمجھو گی۔چھوڑو ان باتوں کو۔''

''دیکھئے میں آپ کو اپنی آپ بیتی سناتی ہوں.....اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی زوجیت

میں خود رکھیں یا اپنے کسی دوست کی زوجیت میں دے دیں۔خود نکاح کر لیں گے تو فائدے میں رہیں گے۔سوچئے! صبح اُٹھتے ہیں ناشتہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہوٹلوں یا نانبائی کی دکان پر تیار نہ ہو جائے۔کپڑے دھوبی سے دھلواتے ہیں۔وہی استری کر کے دیتا ہے۔دوپہر کا کھانا بھی ہوٹل پر رات کا کھانا بھی ہوٹل سے! میرے ہوتے ہوئے آپ کی یہ پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔آپ صبح سویرے ناشتہ کر کے دکان پر جائیں گے۔دوپہر کا کھانا تیار ملے گا رات کو گھر آئیں گے تو میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھائیں گے۔لباس تیار ملے گا گھر صاف ستھرا ملے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....''

''ابھی کچھ نہ کہیں، میری بات پوری سن لیں.....میرے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔میں سب سے چھوٹی ہوں۔سب کی شادی ہوگئی ہے۔بہنیں لاہور بیاہی گئی ہیں۔میری شادی سے پہلے ہی میرے والدین کا انتقال ہوگیا۔اب میں اپنے بھائیوں پر بوجھ ہوں۔بھابیاں یہ چاہتی ہیں کہ میں سارا سارا دن ان کے کام کروں۔ان کے بچوں کا خیال رکھوں۔انہیں کھلاؤں لیکن نہ ان سے کھانا مانگوں نہ لباس۔یعنی کسی نوکرانی کی طرح صبح سے شام تک ان کے کام کروں اور شام ہوتے ہی گھر سے نکل جاؤں۔اگر میں ان کے گھر رہی تو میرے بھائی میری شادی کی فکر کریں گے۔انہیں کچھ نہ کچھ جہیز میں بھی دینا پڑے گا۔رہیں میری بہنیں تو اول انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ میری بھابیوں کا میرے ساتھ کیا سلوک ہے، دوسرے یہ کہ میں ان کے پاس بھی نہیں جا سکتی۔جب بھائی اپنے نہیں ہیں تو بہنوئی کیا کر سکیں گے؟ میری قسمت اچھی ہے کہ رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلی، سٹیشن پہنچی۔بے ٹکٹ سفر کر کے یہاں پہنچی۔چلتے چلتے تھکی تو ایک دکان کے تھڑے پہ لیٹ گئی۔دن بھر کام کر کے بھی تھکی ہوئی تھی اور بھوکی بھی۔رات بھر کی جاگی ہوئی بھی تھی۔آنکھ لگ گئی پھر آپ نے مجھے جگایا۔میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔آپ کے گھر مجھے سکون مل رہا ہے۔میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں لوگوں کو کیا جواب دوں گا تمہارے بارے میں؟''

''کچھ بھی نہیں۔آپ کسی دوسرے سے ان کے گھر کے بارے میں، ان کی بیوی کے بارے میں کیا سوال کرتے ہیں؟ مجھے بتائیں۔لوگ آپ کو کیا جواب دیتے ہیں۔وہی جواب آپ بھی دے دینا۔''

''دیکھو تم میرے گھر بیت الخلاء کے لئے آئی تھیں۔اسے 'بیت لخالا' نہ سمجھو۔جاؤ میری جان چھوڑو.....تم میری بیوی نہیں ہو!.....لوگ جانتے ہیں کہ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں یہ مکان دو افراد کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔اس کمرے میں دوسری چارپائی کی جگہ بھی نہیں ہے۔باورچی خانہ نہیں ہے۔بس صحن میں ایک چولہا رکھا ہوا ہے۔وہ بھی کھانا پکانے کے لئے نہیں بلکہ سردی کے موسم میں پانی گرم کرنے کے لئے۔''

''آج مجھے میرے کہنے پر اپنے گھر دن گزارنے دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جیسے ہی رات کو آپ گھر آئیں گے میں چلی جاؤں گی۔ وہ بھی اگر آپ نے اجازت دی تو.....''

''میری طرف سے تمہیں ابھی اجازت ہے۔'' میں فوراً بولا۔

''ساری رات میں اس بات پر غور کرتی رہی ہوں۔ آج دن میں آپ غور کرلیں۔ پھر جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔'' وہ بولی۔

''میں نے سوچا ہے کہ آپ مجھے اپنے نکاح میں لے لیں۔ جیسے آپ رہتے رہے ہیں۔ ویسے ہی اپنے معمولات رکھیں۔ دکان جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا جائیں۔ میں گھر کے اندر ہی رہوں گی۔ کہیں آنا جانا تو ہوگا نہیں۔''

''نکاح اتنا بھی خاموشی سے نہیں ہوتا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ لوگوں کو محلے داروں کو گواہ بنانا پڑتا ہے۔ یہ جو ڈھول بجتے ہیں ناں یہ اسی بات کا اعلان ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کس کی شادی ہے؟ اس طرح جسے دعوت نہیں بھی ہوتی وہ بھی گواہ بن جاتا ہے کہ فلاں کی بیٹی یا بیٹے کی شادی ہوگئی ہے۔''

''نکاح کے لئے اپنے دو دوستوں کو راز دار بنالیں۔ انہیں بتائیں کہ مجھے پریشانی ہے۔ پہلی بیوی میرے ماں باپ کی خدمت کررہی ہے تو دوسری کو یہاں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ہوٹلوں کا کھانا کھا کھا کر بیزار ہوگیا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس ان دو افراد کو ہی یہ معلوم ہو کہ میں آپ کی دوسری بیوی ہوں.....ورنہ دوسروں کو صرف یہ بتائیں کہ میری بیوی ہے۔ میرے ساتھ رہتی ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ میں آپ کی پہلی بیوی ہوں یا دوسری!''

''تمہیں پتہ ہے دوسری شادی کرنے کے لئے پہلی بیوی سے اجازت لینا پڑتی ہے۔''

''میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں رکھتی۔ جس طرح آپ اپنے بیوی بچوں میں جمعرات کے دن جاتے ہیں۔ جاتے رہیں باہر سے تالا لگا کر جاتے رہیں میں گھر کے اندر ہی بند رہوں گی۔ میرا کون ہے؟ کس کے پاس جاؤں گی؟.....آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی بیوی یہاں نہیں آتی۔ اسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس صورت میں بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کی پلاننگ مکمل تھی۔ وہ ہر طرح سے مجھے گھیر رہی تھی کہ میں اس سے عقد ثانی کروں ہی کروں۔ مجھے سوچتا دیکھ کر بولی۔

''آج آپ سوچ لیں کہ مجھے یعنی ایک بے بس و بے سہارا لڑکی کو اس طرح بے آسرا اکیلے اپنے گھر سے نکالنا بہتر ہے یا مجھے سہارا دینا۔ اپنا گھر بسا لینا۔ حق مہر کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بس واجبی سا رکھیں میری کوئی شرط نہیں ہے۔ مجھے صرف ٹھکانہ چاہئے۔''

☆☆☆

میں ناشتے کا سامان لے آیا۔ اس نے ناشتہ بنایا ہم دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ پھر میں حسب

معمول گھر کو تالا لگا کر دکان پر چلا گیا۔ اس کی پیش کش پر خوب غور کیا۔ مجھے عقد ثانی میں کوئی خرابی دکھائی نہ دی۔ میں نے سوچا کہ جس طرح میں پہلے جاتا رہا ہوں اسی طرح اب بھی دو راتوں اور ایک دن کے لئے چلا جایا کروں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی کہ میں نے دوسری شادی کرلی ہے۔ میرا ملازم بلال ہی ایک ایسا شخص ہے جو میرے گھر بے کھٹکے آتا جاتا ہے۔ اسے بتانا ضروری ہے کہ اب میرے گھر میری بیوی ہوتی ہے۔ اس طرح بے دھڑک اندر نہ آئے۔

ایک فیصلے پر پہنچ کر میں پرسکون ہوگیا دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ گھر جا کر میں نے اس کے سامنے اپنا پلان رکھا۔ اس نے اتفاق کیا۔ راولپنڈی میں کوئی بھی میرا رشتہ دار یا 'گرائیں' نہیں تھا۔

جمعرات کے دن میں نے بلال کو ہوشیار کردیا۔ دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھاتے ہوئے اسے کہہ دیا کہ ہفتے کے دن میری بیوی بچے بھی آرہے ہیں۔ ہوٹلوں کا کھانا کھا کھا کر میرا معدہ تباہ ہوگیا ہے۔ اب مجھے گھر کے استعمال کے لئے سامان کی، کچھ برتنوں کی بھی ضرورت پڑے گی۔ وہاں سے سامان لانا مناسب نہیں ہے۔ سب کچھ نیا خریدنا پڑے گا۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

کچھ سامان تو میں نے جمعرات کے دن ہی خرید کر دکان میں رکھ دیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ میں پرسوں گھر لے جاؤں گا۔ اس سے اسے یہ تاثر دیا کہ میں دکان سے رخصت ہو کر سیدھا بس سٹاپ پر جاؤں گا۔

میں نے اس کے دو دن کے کھانے کا بندوبست یہ کیا کہ چند پیکٹ بسکٹ، دودھ اور جوس کے چند ڈبے خرید کر اس کے حوالے کئے کہ بھوکی نہ رہے۔

اس رات میں خلاف معمول رات تاخیر سے بس میں بیٹھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایبٹ آباد بھی دیر سے ہی پہنچا۔ گھر والے پریشان ہوگئے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ کام زیادہ ہے۔ ہفتے کی صبح کی بجائے میں جمعہ کی نماز کے فوراً بعد ہی چلا جاؤں گا، تاکہ ہفتے کی صبح جلدی دکان کھول سکوں۔

اس تاخیر کو جواز بنا کر میں نے دو مقصد حاصل کرلئے تھے۔

چنانچہ ہفتے کی صبح آنے کی بجائے میں رات کو ہی راولپنڈی پہنچ گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر بتی جلائی تو وہ چارپائی پر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سونے دیا اور خود فرش پر سوگیا۔ رات جانے کب اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے بتی جلائی تو میں اسے فرش پر ہی دکھائی دیا۔ اس نے مجھے اسی وقت بیدار کردیا اور اصرار کر کے مجھے چارپائی پر سلا دیا۔ اور خود فرش پر لیٹ گئی۔

صبح ناشتہ کر کے میں دکان پر گیا۔ بلال آیا تو اس نے آتے ہی پوچھا کہ بچے آگئے ہیں؟ میں نے کہا۔

''بچے نہیں آئے ان کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ البتہ تمہاری بھابی آگئی ہے۔'' نکاح سے پہلے اسے بلال کی بھابی بنانا کچھ عجیب سا تھا لیکن کیا کرتا؟ کیا کہتا؟؟

میں نے اس کے لئے سلے سلائے تین سوٹ لئے۔ ایک برقعہ لیا۔ دکان میں رکھے ہوئے برتن

اُٹھائے اور گھر چلا گیا۔ وقت ضائع کئے بغیر اس عورت کو لباس بدلنے کا کہا اور کہا۔

''اب تم مجھے اپنا نام بھی بتاؤ اور اپنے باپ کا نام بھی۔''

''میرا نام شریف زادی ہے، باپ کا نام فرہاد ہے۔ اپنے گاؤں کا نام نہیں بتاؤں گی۔ بتانا ہی نہیں چاہتی اس لئے پوچھیں بھی نہیں۔''

مجھے اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ میں نے شریف زادی کو ساتھ لیا اور عدالت پہنچ گئے۔

وہاں نکاح ہو گیا تھا۔ اب وہ میری منکوحہ تھی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی کہ یہ میری دوسری بیوی ہے۔

میرے معمولات یکسر بدل گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی میں گھر جا کر کھاتا۔ بلال کو پہلے بھیج دیتا۔ وہ ہوٹل سے کھا آتا تھا۔

بدھ تک تو خیریت گزری۔ اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ اب میں ایبٹ آباد جانے کا کیا کہوں گا؟ کیونکہ بیوی ساتھ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اب میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں؟

اس کا حل یہ نکالا کہ بلال سے کہا کہ وہ دکان اپنے وقت پر ہی بند کرے۔ میں ذرا جلدی جاؤں گا تمہاری بھابی بھی ساتھ ہو گی، تاکہ روشنی روشنی میں گاؤں پہنچ جاؤں۔ اس طرح میں عصر کے وقت دکان سے رخصت ہو کر شریف زادی کے دو دن کے کھانے کا بندوبست کیا، اور گھر آ گیا۔ رات کو حسب معمول گھر کو تالا لگایا شریف زادی اندر ہی 'قید' تھی۔

اس بار بھی میں ہفتے کی صبح آنے کی بجائے رات کو ہی آ گیا تھا۔

روزمرہ معمولات یہی ہو گئے تھے۔

☆☆☆

اس 'عقد ثانی' کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میری دکان پر دو افراد آئے۔ یہ دونوں ہی میرے لئے اجنبی تھے۔ سلام کرنے کے بعد ایک بولا۔

''ہم لاہور سے آئے ہیں۔ ہمیں آپ سے کوئی بات کرنا ہے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے بلال کی جانب دیکھا۔ بلال سمجھ گیا کہ میری موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتے۔ وہ دکان کے دروازے تک جا پہنچا جہاں تک اسے ہماری آواز سنائی نہ دے۔

''بڑی مشکل سے پتہ چلایا ہے آپ کا!'' ایک بولا۔

''میرا نام سلیم الزماں ہے اور یہ فیاض ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کی بیوی ہماری سالی ہے۔ اپنی بھابیوں سے ناراض ہو کر آ گئی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ غلط ہاتھوں میں پڑنے کی بجائے وہ آپ کے پاس آ گئی ہے اور آپ نے اس سے نکاح کر کے عزت دی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں اس سے ملوا دیں۔ ہم اس

سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔''

شریف زادی نے بتایا تھا کہ لاہور میں اس کی دو بہنیں رہتی ہیں۔ وہ ان کے پاس بھی نہیں جانا چاہتی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری بیوی کے کسی رشتہ دار سے رابطہ ہوا۔

میں انہیں لے کر گھر آ گیا۔ ان سے مل کر شریف زادی نے کوئی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جبکہ وہ دونوں اسے پا کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ہم چار افراد تھے۔ چارپائی پر ہم تینوں مرد بیٹھے تھے اور سامنے تپائی پر شریف زادی 'ٹکی' ہوئی تھی۔ وہ اس سے گلہ کر رہے تھے کہ اسے یوں نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہمیں اپنا سمجھ کر ہم سے اپنا مسئلہ کہا ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں انہیں یونہی باتیں کرتا چھوڑ کر بازار گیا۔ ان کی خاطر مدارات کے لئے کچھ بسکٹ وغیرہ لئے چائے کا سامان لیا۔ شریف زادی نے چائے بنائی، ہم سب نے پی۔ میں نے کہا۔

''آپ لوگ بیٹھیں باتیں کریں۔ میں دکان پر جا رہا ہوں دوپہر کے کھانے پر بات چیت کی جائے گی۔'' وہ بولے۔

''نہیں! ہمارے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ ہم جا کر اس کی بہنوں کو خوش خبری سناتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوں گی اور انہیں معلوم ہو گا کہ ایک شریف النفس شخص نے اس سے نکاح کر لیا ہے تو اور بھی خوش ہوں گی۔'' میں انہیں اصرار بالتکرار روکتا رہا لیکن وہ جلد ہی رخصت ہو گئے۔

''انہیں گھر نہیں لانا چاہئے تھا۔'' ان کے جانے کے بعد شریف زادی بولی۔

''کیوں بھئی؟ تمہارے رشتہ دار ہیں کیوں نہ گھر میں لاتا؟''

''میں اب اپنے کسی رشتہ دار سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ آج یہ ہمارے گھر آئے ہیں تو کل ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ آج یہ آئے ہیں تو کل کسی اور کو پتہ بتا دیں گے۔ آپ کا پتہ تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس لئے کہتی ہوں میرا کوئی بھی رشتہ دار آئے تو اسے گھر لانے کی بجائے دکان سے ہی رخصت کر دیں۔''

دن حسب معمول گزرتے رہے۔ میرے عقد ثانی کو یہ دوسرا مہینہ پورا ہونے کو تھا۔

ایک دن صبح ہی صبح شریف زادی کا ایک بہنوئی فیاض آیا اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ فیاض بولا۔

''آپ کے گھر جانا ہے۔ یہ شریف زادی کی بڑی بہنیں ہیں اس سے ملنا چاہتی ہیں۔''

میں مجبور ہو گیا۔ یہ ہمت ہی نہ ہو سکی کہ انہیں دکان سے ہی چائے بسکٹ کھلا پلا کر رخصت کر دیتا۔ ان کے ساتھ عورتیں، اور وہ بھی 'میری سالیاں' نہ ہوتیں تو شاید میں ایسا کر بھی ڈالتا۔ ناچار میں انہیں گھر لے آیا۔

شریف زادی کے رویئے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے میری یہ حرکت بے حد ناگوار گزری ہے۔ طوعاً و کرہاً اس نے انہیں برداشت کیا۔ لیکن ان کے رخصت ہونے کے بعد وہ مجھ سے خفا خفا سی ہو گئی۔ میں

نے منانے کی کوشش کی تو بولی۔

''میں نے کہا ناں کہ میرے ان رشتہ داروں کو منہ نہ لگائیں۔ان سے رکھائی سے پیش آئیں۔ آپ انہیں پھر گھر لے آتے ہیں۔''

''میں کیا کرتا؟ وہ تمہاری بہنیں ہیں۔لاہور سے اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہیں صرف تم سے ملنے۔ انہیں دکان سے ہی کیسے ٹہلا دیتا؟ خود ہی سوچو!''

''بہر حال آئندہ کوئی بھی میرا رشتہ دار آئے تو اسے گھر لانے سے پہلے مجھے ضرور بتائیں۔میں ان سے ملنا چاہوں گی تو گھر میں لائیں ورنہ صاف انکار کر دیں۔میرا ان رشتہ داروں نے بہت جی جلایا ہے۔میں ان سے سخت بیزار ہوں۔''

میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ ایسا ہی ہوگا۔اسے بتائے بغیر اس کا کوئی رشتہ دار گھر پر نہیں لاؤں گا۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سلیم الزماں اور فیاض دونوں آئے۔ان کے ہاتھ میں کچھ تحائف بھی تھے ایک بولا۔

''یہ ہمیں آپ کی سالیوں نے تحفہ دیا ہے۔ہمارے عزیزوں میں شادی ہے۔آپ دونوں کو دعوت ہے۔اگلے جمعہ کو شادی ہوگی۔آپ لوگ اول تو ابھی چلیں ہمارے ساتھ وگرنہ بدھ کے دن لازمی پہنچیں تاکہ مہندی مائیوں وغیرہ میں بھی شرکت کر سکیں۔ہم خود آئیں گے اور بدھ کے دن آپ دونوں کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے تاکہ آپ کو انجان راستوں کی پریشانی نہ ہو۔''

اب مجھے پھر مسئلہ درپیش ہوا۔واقعی شریف زادی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔اگر آج وہ ہمارے گھر آئے ہیں تو کل ہمیں بھی جانا پڑے گا۔غنیمت ہوا کہ انہوں نے گھر تک جانے اور شریف زادی سے ملاقات کا کہا بھی نہیں۔میں نے رسماً بھی انہیں گھر آنے کی دعوت نہیں دی۔بلال کو بھیج کر دکان پر ہی چائے سموسے منگوا لئے تھے۔وہ رخصت ہوئے تو میں اسی وقت وہ تحفے لے کر گھر پہنچا۔

شریف زادی نے دیکھا تو پھر ناراضی کا اظہار کیا۔اس نے کہا۔

''اسی لئے میں کہہ رہی تھی کہ میرے رشتہ داروں کو گھر تک آنے کی مہلت ہی نہ دیں۔''

تحفے کے پیکٹ کھول کر دیکھے تو وہ قیمتی لباس ثابت ہوئے وہ بجائے خوش ہونے کے بولی۔

''اب یہ تحفہ وصول کر لیا ہے تو کچھ دینا بھی پڑے گا؟''

''ہاں تو کیا ہوا؟ دے دیں گے۔کوئی کمی ہے ہمارے پاس؟''

''ایسا ہے تو آپ چلے جایئے گا۔میں بتا دوں! میں نہیں جانا چاہتی اپنے رشتہ داروں میں۔''

میں نے سوچا کہ رشتہ داری تو رکھنا پڑے گی جانا ہی پڑے گا۔یہ سوچ کر میں نے ایبٹ آباد فون کر دیا کہ 'اس ہفتے ایک دوست کی شادی ہے میں نہیں آ سکوں گا' دوسری جانب میں نے اندر ہی اندر تیاری

کر لی تھی۔بلال سے بھی کہہ دیا تھا کہ میرے عزیزوں میں شادی ہے۔شاید مجھے بدھ کے دن جانا پڑے۔

☆☆☆

بدھ کے دن وہ دونوں ہی آ گئے۔میں انہیں دکان پر بٹھا کر کسی کام کا کہہ کر گھر گیا۔شریف زادی کو سمجھایا۔

''یہ عزت کی بات ہے کہ وہ ہمیں خود لینے آئے ہیں۔چلو تیار ہو جاؤ۔''

لیکن وہ کسی صورت نہ مانی، یہی کہتی رہی کہ مجھے شوق ہے شادی میں شرکت کا تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں۔اسے مجبور نہ کروں۔

''دیکھو! رشتہ دار تمہارے ہیں اور تم ہی انکار کر دو گی تو مجھے وہاں کون پہچانے گا؟ تمہاری وجہ سے تو مجھے بھی دعوت دے رہے ہیں ورنہ مجھے کون پہچانتا ہے؟''

''میرا ایک ہی فیصلہ ہے کہ میں اپنے رشتہ داروں میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

''مجھے روکنا بھی آپ کی ذمہ داری ہے۔آپ کہہ دیں کہ میں اسے اجازت نہیں دیتا۔''

''کیسی بات کر رہی ہو؟ دعوت قبول کرنا تو سنت ہے۔میں کیسے منع کر دوں۔''

''میری خاطر منع کر دیں۔یہ سوچ کر منع کر دیں کہ میں گئی تو واپس نہیں آ سکوں گی۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ شادی پر جا رہے ہیں کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہے؟؟'' میں نے کہا۔

''آپ نہیں سمجھیں گے اس بات کو۔''

''تم سمجھنے کی کوشش کرو۔وہ دونوں دکان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔بڑی معیوب سی بات ہے کہ میں تمہارے رشتہ داروں کو گھر لانے کی بجائے دکان میں بٹھائے رکھوں۔''

''آپ تو پتہ نہیں کیا ہیں۔آپ کو فیصلہ کرنا بھی نہیں آتا!.....'' وہ مجھے سمجھانے لگی۔

''یوں کریں آپ انہیں گھر لائیں اور ان سے رکھائی سے پیش آئیں۔میرے بارے میں صاف صاف کہہ دیں کہ اس نے یہ کہہ کر مجھ سے شادی کی تھی کہ میں اپنے رشتہ داروں سے نہیں ملوں گی اس لئے میری اجازت نہیں ہے کہ یہ اپنے رشتہ داروں میں جائے۔اگر یہ میری اجازت کے بغیر اس گھر سے قدم باہر نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔''

''شریف زادی! ہوش میں ہو تم؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟؟'' میں لرز کر رہ گیا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔آپ انہیں بلا کر اسی طرح کہیں۔انہیں میری بھلائی منظور ہوئی تو خاموشی سے چلے جائیں گے۔اگر نہیں تو پھر مجھے اور آپ کو ساتھ لے جانے پر اصرار کریں گے۔کمال ہے، رشتہ دار میرے ہیں میں ان کی اتنی فکر نہیں کر رہی تو آپ کو کیوں اتنی فکر ہے؟''

میں خاموش ہو گیا میں نے سوچا کہ واقعی جب وہ اپنے رشتہ داروں میں خود ہی نہیں جانا چاہتی تو میں کیوں اصرار کر رہا ہوں؟

میں فیاض اور سلیم الزماں کو اپنے گھر لے آیا۔ ان کی خاطر مدارات بھی نہیں کی۔ انہیں چائے پانی کا پوچھا تک نہیں۔ گھر پہنچتے ہی میں نے اپنا رویہ بدلا اور بولا۔

''سلیم صاحب! میں نے اس عورت کو بالکل بے سہارا سمجھ کر سہارا دیا ہے۔ شادی سے پہلے اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے کسی رشتہ دار کے گھر نہیں جائے گی اور نہ ہی ان سے ملے گی۔ اس کے بقول یہ اپنے رشتہ داروں سے بیزار ہے۔ اگر یہ اپنی بہنوں کے گھر بھی جائے گی تو وہاں ایسے لوگ بھی ہوں گے جن سے یہ نہیں ملنا چاہتی بلکہ ان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ آپ ایک بار آئے۔ میں کچھ نہ بولا۔ آپ کو عزت دی دوسری بار اس کی بہنیں آئیں۔ میں نے انہیں بھی عزت دی کہ گھر آئے مہمان سے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ آپ تیسری بار آئے، تحفے تحائف لے کر آئے۔ ہمیں دعوت بھی دی اپنے گھر آنے کی اور آج ہمیں لینے بھی آ گئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں ہے کہ میں اپنا کاروبار چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ میری رشتہ داری ویسے ہی بہت ہے۔ وہاں جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شریف زادی نے جیسا کہا تھا کہ میں اپنے کسی رشتہ دار سے نہیں ملوں گی تو اسے اپنے وعدے کا پاس کرنا ہوگا۔ آپ لوگ آ کر اس سے مل لئے وہ بات الگ تھی لیکن یہ خود جا کر اپنے کسی رشتہ دار سے نہیں ملے گی۔ اس کی میں اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر یہ میری اجازت کے بغیر اس گھر سے قدم باہر نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ ہکا بکا ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''آپ ٹھیک نہیں کہہ رہے۔ آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔'' سلیم بولا۔

''میں بالکل ہوش وحواس میں ہوں اور آپ لوگوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ شریف زادی میری اجازت کے بغیر اس گھر سے باہر قدم نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔''

وہ کھڑے ہوئے تو تھے ہی، بغیر سلام کئے چلے گئے۔

شریف زادی کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی تھی۔

''اب یہ کبھی بھی نہیں آئیں گے نہ ہی کسی کو آپ کا پتہ بتائیں گے۔ یہی میں کہہ رہی تھی کہ خود میں جرأت پیدا کریں۔ خواہ مخواہ آپ نے انہیں ڈھیل دے رکھی تھی۔''

میں دکان پر چلا گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں سو کر اٹھا تو شریف زادی بستر پر نہیں تھی۔ میں سمجھا کہ وہ بیت الخلاء میں ہوگی۔ چارپائی پر پیر لٹکا کر کچھ دیر انتظار کیا۔ فجر کی نماز کا وقت جا رہا تھا اور شریف زادی بیت الخلاء سے نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔ قریب پڑی تپائی پر تہہ شدہ ایک کاغذ نظر آیا اس کے اوپر پانی کا خالی گلاس سیدھا رکھا ہوا تھا۔

میں نے بے خیالی میں ہی وہ کاغذ اٹھا لیا۔ پڑھنا شروع کیا تو میرے پیروں تلے سے زمین کھسکتی چلی گئی۔ شریف زادی نے ہی لکھا تھا۔

پیارے!

میں تمہارے قریب ہی رہتی ہوں..... اسی محلے میں ہی، تم مجھے نہیں جانتے..... لیکن میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی تھی اور اب کچھ دن ساتھ رہ کر مجھے یقین ہو گیا کہ تم میری توقع سے بھی زیادہ شریف النفس ہو۔ سچ کہتی ہوں اگر تم شادی شدہ نہ ہوتے تو میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزار دیتی۔

بات یہ ہے کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ میرا ایک پیارا سا بچہ بھی ہے۔ میں جب تک تمہارے گھر رہی، اپنے بچے سے دور رہی۔ اب میں اپنے بیٹے سے ملنے جا رہی ہوں۔

میں اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میرا شوہر مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ وہ مجھے لینے گیا تو میں نے کچھ دن اور رکنے کی فرمائش کی وہ نہ مانا اور مجھے ساتھ لانے پر اصرار کرنے لگا۔ میرے بہنوئی اور بہنوں نے بھی اسے کہا لیکن وہ اپنی ضد پہ اڑا رہا۔ بس میرے شوہر نے اس ذرا سی بات پر مجھے طلاق دے دی تھی۔ اور فوراً ہی پچھتایا تھا۔ اس وقت ہمارے گھر کے یہی افراد تھے جو تم سے ملے اور یہی گواہ ہیں میری طلاق کے۔ مجھے طلاق ہو گئی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ان سب سے کہا کہ یہ بات کسی سے نہ کہیں میں خود سنبھال لوں گی۔ اپنا گھر اُجڑنے نہیں دوں گی۔ اپنے بیٹے کو رلنے نہیں دوں گی۔''

شریعت کی رو سے کوئی دوسرا شخص مجھ سے نکاح کر کے طلاق دیتا تو اس کے بعد ہی میں اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی تھی۔ اپنے حسن پر مجھے اتنا ہی ناز ہے کہ کوئی بھی شخص مجھ سے نکاح کر کے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ میری نظر انتخاب تم پر پڑی۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھ سے نکاح کیا۔ کم لوگوں کو گواہ بنایا۔ میرے دو بہنوئیوں کے سامنے مجھے طلاق بھی دے دی۔ میں تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھر سے، تمہاری زندگی سے نکل آئی ہوں مجھ پر تمہاری دی ہوئی تینوں طلاقیں لاگو ہو گئی ہیں۔ اب میں عدت گزار کر اپنے سابقہ شوہر کے گھر دوبارہ جا سکوں گی۔ جو اخراجات تم نے مجھ پر کئے وہ میرا شوہر، میرے بچے کا باپ تمہیں لوٹا دے گا۔ میں خود عدت گزار کر تمہاری دکان میں آ کر دے جاؤں گی۔

اور ہاں! میرا اصل نام شریف زادی ہی ہے۔ لیکن تمہارے محلے میں مجھے کسی اور عرفیت سے پہچانا جاتا ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ تمہاری عزت بھی قائم رہے اور میرا کام بھی ہو جائے۔ تمہارے ساتھ گزارا ہوا میرا وقت کم سے کم لوگوں کو معلوم ہو اور کسی کو خبر نہ ہونے پائے کہ میں نے تم سے حلالہ نکلوایا ہے۔ شکریہ میرے معیار پر پورا اترنے کا۔

والسلام۔ شریف زادی

☆☆☆

میرے لئے جمعہ کا وہ دن گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے گھر بھی اطلاع دے دی تھی کہ میں شادی کی وجہ سے نہیں آؤں گا۔ دکان بھی بند تھی۔ گھر پر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اسلام آباد چلا گیا اور رات گئے واپس آیا۔

اس واقعہ کے تین یا چار مہینے گزر رے تھے۔ میں ظہر کی نماز پڑھ کر آیا تو بلال نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

''کوئی خاتون یہ دے گئی ہیں۔''

لفافہ کھولا تو اس کے اندر رقم تھی...... پتہ نہیں کتنی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ میں نے رقم بلال کو دے دی اور خط خود سنبھال لیا۔ بلال حیرت سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے اشارے سے کہا کہ وہ عیش کرے۔ میں نے چاہا کہ اس خط کو گھر جا کر تسلی سے پڑھوں گا۔ یہ تو سمجھ آ گئی تھی کہ یہ شریف زادی ہی تھی جسے معلوم تھا کہ میں اس وقت دکان پر نہیں ہوتا۔ اس نے وہ قیمت چکائی تھی جو میں نے اس پر خرچ کی تھی۔ اور میری دانست میں یہ رقم میرے لئے حلال نہیں تھی۔ بلال کے سامنے خط پڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرے چہرے کے تاثرات سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔ میں نے اس خط کا مطالعہ رات تک کے لئے مؤخر کر دیا۔

رات کا انتظار نہ کر سکا۔ بلال کسی کام سے دکان سے باہر نکلا تو میں نے خط نکال کر پڑھ لیا..... لکھا تھا

پیارے!

تمہاری خرچ کی ہوئی رقم لوٹا رہی ہوں۔ سابقہ شوہر سے میرا نکاح فی الحال نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ یہ فیصلہ میرا شوہر ہی کرے گا کہ وہ اس بچے کو 'میرا بچہ' سمجھ کر پرورش کرے یا تمہارا بچہ سمجھ کر تمہارے حوالے کر دے۔ اگر میرے شوہر نے وہ بچہ رکھنے سے انکار کر دیا تو میں تمہارے حوالے کر جاؤں گی۔ اس کے لئے تیار رہنا۔

خدا حافظ

والسلام شریف زادی

اب مجھے انتظار ہے کہ کب میرا بچہ مجھے ملتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ''شریف زادی کا بچہ!''

◄◄ ● ►►

M.S.Aimun
Aimun Library,Parsi Gate,Chanesar Goth
Karachi-75460(Pakistan)

317_346750348 not found.

سید انور جاوید ہاشمی

یہ غزل نہیں ہے، اس کے صرف تین اشعار ہی ہوئے تھے۔ بہت کوشش کی کہ اضافہ کریں مگر جس فضا میں یہ ہو گئے اس کا تاثر زائل کرنا گوارا نہیں۔

پرندے موسمِ گل کو جہاں پکارتے تھے
عجیب دھوپ تھی سائے تھکن اتارتے تھے

اُجالے چاندنی راتوں سے پھول سے شبنم
اُدھار مانگتے تھے ہم سخن سنوارتے تھے

معاصرین میں اب نفرتیں زیادہ ہیں
پُرانے لوگ محبت میں خود کو ہارتے تھے

◄◄ ● ►►

اُس کے کوچے میں کہاں یار چلا جاتا ہے
میں پہنچ پاتا نہیں یار چلا جاتا ہے

ایک مدت سے کوئی شعر انوکھا نہ لکھا
ایک مدت سے یہ آزار چلا جاتا ہے

قیمتِ شعر و سخن چاہے ملے یا نہ ملے
پھر بھی یہ فن سرِ بازار چلا جاتا ہے

جب بھی چاہا کسی دیوار کے سائے میں چلوں
میرا سایہ پسِ دیوار چلا جاتا ہے

◄◄ ● ►►

►► FLAT NO: B-301,
AL AMNA AVENUE,
7D/1 NORTH KARACHI

2514_52270740
not found.

سجاد ہاشمی

کچے خوابوں کی سحر یہ رنگ بھی دکھلا ئے گی
آئینہ دیکھو گے اور خود سے حیا آجائے گی

جب کبھی پھولوں کو چوما ہم نے؛ کانٹے چبھ گئے
زندگی اب اور تو کتنے سبق سکھلائے گی

زخم بھرنے بھی نہ پائے وار اُس نے کر دیا
دوستوں کو دوستی کیا خون میں نہلائے گی

دوستوں نے مار ڈالا اُس پہ یہ طرفہ ستم
دشمنوں کے قافلے سے یہ خبر گھر جائے گی

راہ میں سجاد وہ کانٹے بچھانے آئے گا
میں نہ پہنچا تو اُسے شرمندگی ہوجائے گی

افتخار حیدر

بچھڑنے کی قسم کھاتا ہے کوئی
مگر ایسے کہاں جاتا ہے کوئی

بھلانے کے جتن کرتا ہوں لیکن
مجھے رہ رہ کے یاد آتا ہے کوئی

محبت کا کہا اس سے ،تو بولی
پرانی بات دہراتا ہے کوئی

خیالوں میں کسی مہ رو کی خاطر
ستارے توڑ کر لاتا ہے کوئی

رقیبا...... مت گزر اب سامنے سے
تمھیں دیکھوں تو یاد آتا ہے کوئی

ہواؤ زور سے مت در بجاؤ
خیالوں سے چلا جاتا ہے کوئی

ترانہ ہجر کا نغمے کی صورت
غموں کی تال پر گاتا ہے کوئی

A-157 Abbas Town
Abul Hasan Asfahani Road
Gulshan-E-Iqbal Karachi

عزیز نبیل

ہزار قسم کے لوگوں میں راہ کرتا ہوا
گزر رہا ہوں سبھی سے نباہ کرتا ہوا

وہ ایک نام ،منوّر ہوا اندھیروں میں
نہ جانے کتنے غلاموں کو شاہ کرتا ہوا

مجھے پکار کبھی تو بھی اے مری دنیا
میں تھک چکا ہوں بہت تیری چاہ کرتا ہوا

یہ کیسا ڈر ہے جو آ پہنچا میرے خوابوں تک
بہت سے خواب جزیرے تباہ کرتا ہوا

گزر گیا کبھی مسجد کے سامنے سے نبیلؔ
ٹھہر گیا ہے کبھی لا اِلٰہ کرتا ہوا

کیا جانے کیسا خوف بسا ہے فضاؤں میں
سورج،ستارے،چاند، چھپے ہیں خلاؤں میں

میں اپنی دھوپ سر پہ اٹھائے نکل پڑا
دنیا بہت بلاتی رہی اپنی چھاؤں میں

کل شب مرے مکاں میں عجب روشنی رہی
روشن تھا اک الاؤ کہیں دور گاؤں میں

مدّت ہوئی میں آ چکا صحراؤں سے مگر
ذرّات اڑ رہے ہیں ابھی تک ہواؤں میں

کب تک پلٹ پلٹ کے تجھے دیکھوں زندگی
اب کچھ نیا نہیں ترے حیرت سراؤں میں

ویسے تو کچھ نہیں ہے مرے پاس آج بھی
اک آگ تھی، جو پھیلی ہے میری صداؤں میں

PO BOX 50090., SCD,
QATAR STEEL,
MESAIEED., QATAR

طارق متین

ترے خواب آنکھوں میں آ گئے مرے بام و در کو سجا گئے
کبھی رات بن کے سلا گئے کبھی صبح بن کے جگا گئے

مرے ہم نفس ترا شکریہ مری وحشتوں کو بڑھا گئے
نئی راہ مجھ کو دکھا گئے نئی منزلوں پہ لگا گئے

یہ مرے جنوں کی کرامتیں ترے عشق کی ہیں امانتیں
تری چاہتوں کے ہی سلسلے مجھے دیوداس بنا گئے

تری قربتوں سے چمک اٹھے مرے جسم و جاں کے سب آئینے
تجھے پا لیا تو لگا ہمیں کہ نئے جہان میں آ گئے

وہ محبتیں بھی عجیب تھیں وہ رفاقتیں بھی عجیب تھیں
وہ عجب دیار تھا دوستو جہاں جان اپنی کھپا گئے

مری زندگی تو عذاب تھی تری اک نظر سے پلٹ گئی
کئی خوشبوئیں ہوئیں ہمسفر کئی رنگ مجھ میں سما گئے

◀◀ ● ▶▶

دوستو ریت کی دیوار اٹھاتے کیوں ہو
گرنے لگتی ہے تو پھر شور مچاتے کیوں ہو

کوئی زخموں کا مداوا نہیں کرنے والا
زخمِ دل اپنا زمانے کو دکھاتے کیوں ہو

جنہیں کچھ بھی نظر آتا ہی نہیں اپنے سوا
ایسے لوگوں سے کوئی آس لگاتے کیوں ہو

تم طرفدار ہو کانٹوں کے تو کانٹوں میں رہو
اپنے گلدان میں پھولوں کو سجاتے کیوں ہو

خود ہی سو جاتے ہو جب سارا جہاں جاگتا ہے
چاہتے کیا ہو زمانے کو جگاتے کیوں ہو

اپنے کردار کو مٹی میں ملا کر طارقؔ
اپنے اسلاف کی عظمت کو گنواتے کیوں ہو

◀◀ ● ▶▶

▶▶ Lakhminya
Begusarai

راشد طراز

تو ہے تو رہگذر میں اُجالا ہے آج تک
دنیا وگرنہ کھیل تماشا ہے آج تک

بنیاد کس نے ڈالی تھی جنگ و جدال کی
ڈوبا ہوا لہو میں نظارہ ہے آج تک

تنہائی مجھ پہ ختم نہیں کائنات میں
تنہا تو شام کا بھی ستارہ ہے آج تک

کیوں کر نہیں کرے گی ہمیں یاد پھر بہار
رشتہ جو خونِ دل کا ہمارا ہے آج تک

راشدؔ طراز روح کو پیشِ نظر رکھا
کاغذ پہ لفظ یوں نہیں لایا ہے آج تک

◀◀ ● ▶▶

اندھیری رات کے لشکر کہاں سے آتے ہیں
یہ مہر و ماہِ منور کہاں سے آتے ہیں

اگر یہ حسنِ جہاں تاب کا کرشمہ نہیں
تو رنگ و نور کے پیکر کہاں سے آتے ہیں

وہ امتحاں نہیں لیتا جو اپنے عاشق کا
تو رہگذار میں پتھر کہاں سے آتے ہیں

ہجومِ تشنہ کو وہ دیکھتا نہیں ہے اگر
تو پھر زمیں پہ سمندر کہاں سے آتے ہیں

دلوں کی تہہ میں یقیناً وہ جھانکتا ہے کبھی
وگرنہ خیال کے محشر کہاں سے آتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں قانونِ حق اٹھاتے ہوئے
یہ ان کے ہاتھ میں خنجر کہاں سے آتے ہیں

یہ زندگی ہے یہاں مستعار کس سے طرازؔ
یہ ہنستے بولتے منظر کہاں سے آتے ہیں

◀◀ ● ▶▶

▶▶ Dilawarpur
Munger

عارف شفیق

جہاں میں اپنا ہونا بھی طلسماتی لگا مجھ کو
ازل سے جو ابد تک ہے وہ لمحاتی لگا مجھ کو

جسے دیکھا وہ اپنی ذات کے زنداں کا قیدی تھا
یہ سارا شہر ہی اپنا حوالاتی لگا مجھ کو

پرندے پھول پودے رنگ خوشبو اور ہوا اُجلی
سحر کے وقت کا منظر مناجاتی لگا مجھ کو

یہ ہمدردی غریبوں سے امیروں سے تری نفرت
یہ تیری سوچ کا پہلو بھی طبقاتی لگا مجھ کو

سبھی محرومیاں دکھ درد خوشیاں ایک جیسی تھیں
یہاں اپنا ہی جیسا ہر ملاقاتی لگا مجھ کو

عجب خوش فہمیوں میں خط اسے لکھا تھا اک میں نے
نہیں میں بھی جواب آیا تو اثباتی لگا مجھ کو

تھی اسی شاعری اک دکھ بھرے احساس کی دنیا
جو عارفؔ دیکھنے میں غیر جذباتی لگا مجھ کو

◀◀ ● ▶▶

کیسا ماتم کیسا رونا مٹی کا
ٹوٹ گیا ہے ایک کھلونا مٹی کا

اتروں گا آفاق سے جب میں دھرتی پر
بھرلوں گا دامن میں سونا مٹی کا

مر کر بھی کب اس سے رشتہ ٹوٹے گا
میرا ہونا بھی ہے ہونا مٹی کا

اک دن مٹی اوڑھ کے مجھ کو سونا ہے
کیا غم جو ہے آج بچھونا مٹی کا

آنکھوں میں مت رکھنا اس کی یاد کا چاند
دریاؤں میں خواب نہ بونا مٹی کا

اس کا سندر روپ ہے سونے چاندی سا
میرے گھر کا ہر اک کونا مٹی کا

پھر دھرتی کی چاہت کے تم لکھنا گیت
پہلے دل میں درد سمونا مٹی کا

آزادی کی خواہش زندہ رکھنے کو
پلکوں پر اک خواب پرونا مٹی کا

اونچا اُڑنے کی خواہش میں تم عارفؔ
ماؤں جیسا پیار نہ کھونا مٹّی کا

◀◀ ● ▶▶

▶▶ Block S.P-1, Al Karam
Square, F.C. Area Karanchi

فہیم جوگاپوری

شاہ نے چشم عدالت میں جو درہم لکھا
منصفوں نے بھی مرے گھاؤ کو مرہم لکھا

لکھنے والے نے ترا نام لکھا دھوپ کے دن
مرے حصے میں یہ برسات کا موسم لکھا

وہ چھلاوہ کہیں مل جائے تو پوچھوں اک دن
جس نے پھولوں پہ ترے نام کا موسم لکھا

ایک قطرے کو لکھا پہلے تو دریا سے عظیم
بعد میں اس نے سمندر کو بھی شبنم لکھا

ترے رخسار پہ برسات نے لکھے آنسو
تیرے آنچل پہ گھٹاؤں نے مرا غم لکھا

حال کیا پوچھتے ہو میری سیہ بختی کا
جس کو راتوں کی سیاہی نے بھی مدھم لکھا

اس کی تمثیل میں چھوٹا تو نہیں کچھ بھی فہیم
پھر بھی سورج نے کہا تو نے ذرا کم لکھا

◀◀ ● ▶▶

شہر ہی چھوڑ گئے ہنسنے ہنسانے والے
رات بھر چاند ستاروں کو جگانے والے

میرے ہی سامنے فنکار بنے بیٹھے ہیں
مری تصویر سے تصویر بنانے والے

آہوئے دشت کا اندازِ خرام ایسا ہے
چوک جاتے ہیں جہاں آ کے نشانے والے

ان ہواؤں کو یہ معلوم نہیں ہے شاید
کتنے طوفاں ہیں چراغوں کو بجھانے والے

جاگتی رات دعا کرتی ہے دن رات یہی
تجھ کو نیند آئے مری نیند اُڑانے والے

محو پرواز اسی ڈر سے پرندہ ہے فہیم
چین نے بیٹھنے دیں گے نہ زمانے والے

◀◀ ● ▶▶

▶▶ Dabunia Road
Siwan - 841226

ظفر صدیقی

موج بلا گزر گئی ساحل لئے ہوئے
جیسے کسی کا سر کوئی قاتل لئے ہوئے

مدت ہوئی کہ ہجر میں دیوانہ مر گیا
اب آرہے ہیں طوق وسلاسل لئے ہوئے

کس کی مجال ہے کہ مری راہ روک لے
چلتا ہوں سیل عزم کو شامل لئے ہوئے

یہ ہے مرا جگر کہ جو دشمن ہے جان کا
خود کو چلا ہوں مد مقابل لئے ہوئے

دانش وران شہر غلامی کو ہیں کھڑے
کرسیٔ علم ہے یہاں جاہل لئے ہوئے

اب خالی کرسیوں کو سناتے رہو غزل
محفل سے اُٹھ گیا کوئی محفل لئے ہوئے

منزل پہ سب پہنچ کے ظفرؔ محو جشن ہیں
ہم سو رہے ہیں خواہش منزل لئے ہوئے

◀◀ ● ▶▶

▶▶ Fulwari Sharif
Patna

فوزیہ اختر

اُس کی یادوں کے سائبان میں ہوں
کتنی محفوظ اِس جہان میں ہوں

ساکھ رشتوں کی پھر نہ کوئی بچی
اب جو رہنے لگی مکان میں ہوں

مجھ کو منزل کی جستجو ہے مگر
اِس سفر پر ملی تکان میں ہوں

جب سے عادی یہ دل جفا کا ہوا
میں مسلسل تری امان میں ہوں

بات میری ہی پھر چھڑی فوزیؔ
میں نہاں پیار کی زبان میں ہوں

◀◀ ● ▶▶

▶▶ C/O, Dr. Islam Clinic
9/ D, Topsia 2nd Lane
Kolkata - 700 039

رفیق راز

یہ میری کرچیاں ہیں کہ توڑا گیا ہوں میں
آئینۂ سکوت ہلاک صدا ہوں میں

یہ میں طواف کرتا ہوں تیرے مکان کا
مت کھول اتنی رات گئے در، ہوا ہوں میں

کس راہرو کے واسطے کس دھوپ میں یہاں
مدت سے مثل سایہ بچھایا گیا ہوں میں

گھبراؤ مت یہ کوئی بگولہ نہیں میاں
صحرائے جاں سے اپنے یہ شاید اٹھا ہوں میں

پھرتا ہوں کو بہ کو تری خوشبو لئے ہوئے
شہرت ہے تیری مجھ سے کہ بادصبا ہوں میں

اب کے تھا زہر ہجر کے موسم میں کچھ الگ
منظر سے تیرے رنگ کی صورت اڑا ہوں میں

مجھ کو تو اب چراغ سا جلنا ہے ساری رات
سورج غروب ہوتے ہی گھر آ گیا ہوں میں

ترتیب کائنات ہی زیر و زبر نہ ہو
ملک تخیلات کا سلطاں ہوا ہوں میں

آ راہِ چشم سے کبھی مجھ میں اتر کے دیکھ
اندر سے بے کنار کسی دشت سا ہوں میں

گم سم ہوں اور مہر بلب شور و شر کے بیچ
نغمہ سرا ہیں لوگ تو حیرت سرا ہوں میں

تیری صدا ہی آئی تھی پیچھے سے بار بار
اب کیا بتاوں سنگ میں کیسے ڈھلا ہوں میں

کرتا ہوں اپنے آپ سے اکثر مکالمہ
تجھ کو تو یہ خبر ہی نہیں کیا بلا ہوں میں

◀◀ ● ▶▶

رفیق راز

گرمی کوئی حروف کے بازار میں نہیں
اک بھی شعاع گوہر گفتار میں نہیں

کھلتا تو ہے کبھی کبھی اسرار غیب سا
آتا مگر وہ معرض اظہار میں نہیں

شب بھر جو تاب لا سکے میرے سکوت کی
ایسا تو کوئی غار ہی کہسار میں نہیں

یہ کرب ذات میرا ہی تخلیق کردہ ہے
شامل تمہارے ہاتھ اس آزار میں نہیں

اٹھو کہ ایک تحفۂ حیرت ہے منتظر
آثار مہر صبح کے آثار میں نہیں

بادِ نفس کے آگے ہے اس کی مجال کیا
دم اتنا اس کے شعلۂ انکار میں نہیں

ہر شئے رفیق راز ہے اندر سے کھوکھلی
سایہ بھی اب یہاں کسی دیوار میں نہیں

◀◀ ● ▶▶

اللہ رے وہ جمال جلال سحاب کا
چہرہ دمک اٹھا تھا جہان خراب کا

ہو آنکھ تو سکوت خرابہ ہے رنگ دہر
ہو کان تو کھنڈر ہے فسانہ عذاب کا

روشن لہو سے اس کے ہے اب تک یہ شہر شک
کیا ایلچی تھا مملکت آفتاب کا

ہوں پا بہ گل شجر کی طرح یوں سوال سا
جیسے ہوں منتظر میں فلک کے جواب کا

قائم ہے عکس موج گماں کا وہی طلسم
پیش نظر ہے آئینہ دائم سراب کا

تاثیر اب کے بارشوں میں کچھ عجیب ہے
شعلہ دکھائی دیتا ہے پودا گلاب کا

◀◀ ● ▶▶

رفیق راز

پیدا تو کرو خانۂ زنجیر میں جھنکار
قدغن ہے زباں پر تو کرو پاؤں سے اظہار
یا دیدۂ طیغم ہے سیہ دشت میں روشن
یا آنکھ عقیق یمنی سی ہے شرر بار
رہتے ہیں مرے دن بھی اسی خواب سے روشن
پھرتا ہوں ان آنکھوں میں لئے رات کا آزار
بھرنے ہیں کہانی میں نئے رنگ مجھے کچھ
ہونا ہے مجھے پردۂ اسود پہ نمودار
سر اپنا رکھا کس نے یہ نیزے کی انی پر
اک خشک سی ٹہنی کو کیا کس نے ثمر دار
کچھ نقش مٹے سے ہیں چٹانوں پہ ابھی تک
محفوظ ہیں کچھ موجۂ آواز کے آثار
ہم لوگ تو بس خاک اڑانے پہ ہیں مامور
کھلتے ہیں مقیموں پہ فقط دشت کے اسرار
آنکھوں کو ابھی خوابوں سے فرصت ہی نہیں تھی
بے وقت گری آخرِ شب دھند کی دیوار
دل دشت میں اب دیکھئے لیتا ہے کہاں دم
اک قافلۂ صر صر سفاک سیہ کار

◀◀ ● ▶▶

یہ مرا آنگن نہیں صحرا ہے میرے سامنے
یا مرے اندر کا ڈر پھیلا ہے میرے سامنے
ڈالتا ہوں روز اس میں نیکیاں دو چار میں
صورت کشکول یہ دریا ہے میرے سامنے
اب کھلا میں عکس لرزاں کے سوا کچھ بھی نہیں
کس نے یہ آئینہ سا رکھا ہے میرے سامنے
گھر کے یہ دیوار و در خاموش ہیں تو کیا ہوا
آپ کی تصویر تو گویا ہے میرے سامنے
اپنی تعبیریں لئے اب خواب آتے ہیں میاں
اب تو ہنگامہ بپا ہوتا ہے میرے سامنے
نہر کوثر ریت میں ہے نار دوزخ آب میں
دشت میرے پیچھے ہے دریا ہے میرے سامنے
ہانپتے سورج سے میں خود برسر پیکار ہوں
اور مرا سایہ پڑا تنہا ہے میرے سامنے
کیا قیامت ہے کہ پھر آنکھیں پھڑکتی ہیں مری
ہونے والا اب تماشا کیا ہے میرے سامنے

◀◀ ● ▶▶

رفیق راز

تنہائیوں نے صاحبِ عرفاں کیا تو پھر
اسرارِ ذات مجھ پہ اچانک کھلا تو پھر

فانوس کی زرہ پہ نہ اتنا بھروسہ کر
میداں ہوا کے ہاتھ ہی پھر بھی رہا تو پھر

جو در کسی بھی اسم سے اب تک کھلا نہیں
دستک دیئے بغیر ہی وہ در کھلا تو پھر

حیرت سے آشنا تری آنکھیں تو ہیں نہیں
سوجا، کہیں وہ غیب کا پردہ اٹھا تو پھر

اپنی انا کے خول سے باہر نہ آ ابھی
طوفان مثل خاک تجھے لے اڑا تو پھر

سلطانِ شب کے خوف سے گل تو کئے چراغ
اک آدھ خواب آنکھ میں روشن ہوا تو پھر

تو نے جو اختیار کیا ہے رفیق راز
تیری طرف ہی جاتا ہو وہ راستا تو پھر

◀◀ ● ▶▶

رکھے سوار کو گرم سفر رمیدہ شکار
رہے بلند ہمیشہ نشان گرد و غبار

گلے میں ڈال رکھی ہے سکوت کی زنجیر
مجھے تو وجد میں لاتی ہے روز اک جھنکار

زمیں سے تا بہ فلک اک برہنگی ہے عجیب
ہوائے جامد و ساکت ہے خاک سے بیزار

قدم کی چاپ سنے گا تو راستہ دے گا
ہٹے گا اپنی جگہ سے اک آن میں کہسار

میں ایک فعل مسلسل تو اسم اعظم ہے
ہمارے بیچ میں حائل ہے ایک حرف جار

ہزاروں چشمے تڑپتے ہیں ان کے سینوں میں
چٹانیں رکھتی نہیں ہیں مگر لب اظہار

ابھی نظارے میں شامل نظر کے رنگ نہیں
ابھی تو بیچ میں حائل ہے دھند کی دیوار

◀◀ ● ▶▶

رفیق راز

ڈوبا ہوا غنیم تھا لوہے میں، جل گیا
نکلی وہ آگ زخم سے میرے، پگھل گیا
آیا سکوت غار نشیں کا جواب کیا
بے حس پہاڑ آخر شب کیوں دہل گیا
تھا دیدنی وہ خود سے بچھڑ جانے کا سماں
سایہ سا کوئی نخل بدن سے نکل گیا
ایسا نہیں کہ حرف و سخن میں اثر نہ تھا
اس پر مرے سکوت کا جادو ہی چل گیا
میں نے کیا ہے چشم کو چشمہ تو اس نے بھی
دامن کو میرے دشت کیا خطرہ ٹل گیا
آئی ہے تو یہ رات بھی جائے گی دیکھنا
آخر طویل حشر کا دن بھی تو ڈھل گیا
اس نے رکھے ہیں عرصہ گہہ جاں میں کیا قدم
میدان کارزار کا نقشہ بدل گیا
معنی محاورے کے بھی تبدیل ہوگئے
دونوں سروں سے جل گئی رسی تو بل گیا
تاثیر پستیوں کی عجب ہے رفیق راز
گرتے ہی آبشار زمیں پر سنبھل گیا

◀◀ ● ▶▶

جاتی ہے جو دستار تو سر کیوں نہیں جاتا
اس دور کے سردار کا سر کیوں نہیں جاتا

صحرا میں چمکتا ہوا آئینہ سا کیا ہے
پانی ہے تو یہ سر سے گزر کیوں نہیں جاتا

ہم رینگتے کیڑے نہیں مخلوق خدا ہیں
تو تخت سلیماں سے اتر کیوں نہیں جاتا

کیا جانے کہ اب بارش غم سے بھی یہ چہرہ
مثل گل سر سبز نکھر کیوں نہیں جاتا

اس لمحے نے کیوں دھار لیا روپ صدی کا
بیتا ہوا یہ لمحہ گزر کیوں نہیں جاتا

در دیکھ کے دہلیز پہ رکتا ہوں اچانک
دل سے ابھی دیوار کا ڈر کیوں نہیں جاتا

کیا رقص شب تار بھی دیکھو گے سڑک پر
کیا بات ہے اے راز تو گھر کیوں نہیں جاتا

◀◀ ● ▶▶

▶▶ Indra Gandhi Road
Aghaat Barzala.,Srinagar.Kashmir

319_47979160
not found.

نذیر آزاد

بے منظری بازار کی ڈھلنے کے لئے ہے
ٹھہری ہوئی حالت بھی بدلنے کے لئے ہے

چمکے گا ترے دِل میں کبھی مہرِ شرر بار
ہونٹوں پہ جمی برف پگھلنے کے لئے ہے

رکھ دی گئی ہے پاؤں میں لغزش بھی ہُنر سے
سینے میں ہے دل اور مچلنے کے لئے ہے

جاناں یہ ترا تیر کہو میرے جگر میں
رہنے کے لئے ہے کہ نکلنے کے لئے ہے

طوفان، بھنور، موجِ بلا اصل ہے دریا
ساحل تو مری جان پھسلنے کے لئے ہے

◀◀ ● ▶▶

مُجھ کو میرے مولا کبھی مختار نہ کرنا
طائف کی گلی مصر کا بازار نہ کرنا
میں دھوپ میں جلتے ہوئے ذرّوں کی طرح ہوں
صحرا مجھے رکھ ریت کی دیوار نہ کرنا
احباب کے قدموں میں بڑے شوق سے رکھنا
پر مجھ کو کلاہِ سرِ اغیار نہ کرنا
رہنے دے خمیدہ سرِ تسلیم کو میرے
اُٹھوا کے اِسے ظلم کی تلوار نہ کرنا
رُسوا نہ مرا دستِ دعا ہو تہِ افلاک
میں سیکھ چکا ہوں کبھی تکرار نہ کرنا
میں اپنی صداؤں میں بہت ڈوبا رہا ہوں
اِتنا بھی مجھے واقفِ پندار نہ کرنا
ہوں حلقہء یاراں کی سیاست سے بہت خوش
رکھنا یہ بھرم ہاں مجھے ہُشیار نہ کرنا
بیزار ہوں دنیا سے کہ مرضی ہے تمھاری
دنیا کو مری ذات سے بیزار نہ کرنا

◀◀ ● ▶▶

نذیر آزاد

اُجڑے ہوئے گلشن میں صبا تک نہیں آتی
جوں شہرِ خموشاں میں قضا تک نہیں آتی

وہ شورِ سلاسل ہے نہ وہ طرزِ فغاں ہے
اِمسال قفس سے تو صدا تک نہیں آتی

جو نکہتِ انفاس کا کل تک تھا بسیرا
اُس کمرے میں تھوڑی سی ہوا تک نہیں آتی

کیا تشنہ لبی میری بھی منظور ہوئی ہے
کیوں اپنی طرف موجِ بلا تک نہیں آتی

مِلتی نہیں کیا ناز و ادا کی کوئی خیرات
بستی میں تو آوازِ گدا تک نہیں آتی

جب جان لِیا کام کی تاثیر ہے اُلٹی
خواہش تو کُجا لب پہ دُعا تک نہیں آتی

◀◀ ● ▶▶

گھر سے ہم جب بھی نکلتے ہیں گداؤں کی طرح
وہ کسی موڑ پہ ملتے ہیں عطاؤں کی طرح

یک بہ یک اُٹھتے ہیں پُر زور ہواؤں کی طرح
یک بہ یک چُھپتے ہیں تاریک گھٹاؤں کی طرح

ہم وہ فرمانِ شہنشہ ہیں کہ دربار سے دُور
کو بہ کو پھرتے ہیں آوارہ نداؤں کی طرح

ہم نے اُس طرزِ گدائی کو کیا ہے ایجاد
خود سے بھی ملتے ہیں ہم لوگ گداؤں کی طرح

میرے صحرائے معانی کے وہ رم خوردہ غزال
کیوں بھٹک جاتے ہیں گم گشتہ صداؤں کی طرح

◀◀ ● ▶▶

▶▶ Near Salsabeel
School Humhama
Budgam (J & K) 190021

علمدار عدم

تصویریں ، الفاظ بناتی ہیں اب بھی
اُلٹے سیدھے خواب سجاتی ہیں اب بھی

اب بھی اک انجانہ خوف ڈراتا ہے
آوازیں آواز لگاتی ہیں اب بھی

حالانکہ وہ سب تو یاد نہیں لیکن
نانی قصے روز سناتی ہیں اب بھی

عشق کا دریا اب بھی شور مچاتا ہے
ساحل سے لہریں ٹکراتی ہیں اب بھی

اب بھی پنگھٹ پر کچھ یادیں رہتی ہیں
پنگھٹ پر پریاں منڈلاتی ہیں اب بھی

ہم ہی مڑ کر دیکھ نہیں پاتے شاید
صدیاں جیسے روز بلاتی ہیں اب بھی

◀◀ ● ▶▶

ملگجے میں رہا روشنی کا بدن
اُس نے دیکھا نہ تھا زندگی کا بدن

میرے بچپن کے سب کھیل مرجھا گئے
مجھ میں پلتا رہا آگہی کا بدن

میں جو کہتا تو سب راز پر تولتے
مجھ میں خاموش تھا اَن کہی کا بدن

گھپ اندھیرا تھا ، تنہائی تھی اور میں
ساتھ لپٹا رہا روشنی کا بدن

اُس میں الفاظ و معنی کے سب رنگ تھے
پھر بھی روٹھا رہا شاعری کا بدن

◀◀ ● ▶▶

علمدار عدم

ابھی تو آخری سرحد پہ وار کرنا ہے
تری نظر نے تجھے سنگسار کرنا ہے

ملا ہے اِذن کسے پھر سفر پہ جانے کا
کسے عبور نیا ریگذار کرنا ہے

ٹھہر گئے ہیں جنوں کی ہر ایک سرحد پر
کہ آگہی کا ہمیں انتظار کرنا ہے

یہ اور بات ہے، اب راستہ ملے نہ ملے
سفر تو پھر بھی ہمیں اختیار کرنا ہے

وہ کربلا ہے، وہ صحرا ہے اور ستم گر ہے
یہ قافلہ ہے، اسے دشت پار کرنا ہے

◀◀ ● ▶▶

حصارِ ذات میں رہنے کی ہے سزا جیسے
شعورِ زیست لگے ہے خفا خفا جیسے

مرے جنون کا قصہ بھی ایسا قصہ ہے
تمہاری یاد کے لمحے جدا جدا جیسے

یہ اتفاق عجب ہے کہ شہرِ آزر میں
لبوں پہ نام تمہارا ہے بددعا جیسے

میں گمرہی کے جو نہی ذائقے تلاش کروں
مرے درون میں آئے ہے زلزلہ جیسے

یہی تو بات ہے میری زمیں کی مٹی میں
میں گھوم پھر کے وہیں پھر سے آ گیا جیسے

◀◀ ● ▶▶

● صبا اکرام

آنگن

رفتہ رفتہ دریچے بند ہوئے
اور دروازوں پر
پڑے تالے
ہم ہوئے دور تم سے
اور تم بھی
ہو گئے ہو جدا زمانے سے
اب کہاں کا وہ ملنا جلنا بھی
اور کہاں شام کی ملاقاتیں
کہ اب بھی آنگن میں
آسمان اپنے ساتھ ہوتا ہے
ہم بھی دکھ درد
اس سے کہتے ہیں
تم بھی قصے غموں کے
اس سے کہو
جانے کب آنگنوں پہ چھت پڑ جائیں!

C-102 Rufi Sweet Homes,
Gulshan-E-Omair, Karachi

● ثروت زہرا

بے پروں کی تتلی

یہ جھاڑن کی مٹی سے
میں گر رہی ہوں
یہ پنکھے کی گھوں گھوں میں
میں گھومتی ہوں
یہ سالن کی خوش بو پہ
میں جھومتی ہوں

میں بیلن سے چکلے پہ
بیلی گئی ہوں
توے پر پڑی ہوں
ابھی جل رہی ہوں
یہ ککر کی سیٹی میں
میں چیختی ہوں
کسی دیگچی میں پڑی گل رہی ہوں
مگر جی رہی ہوں

Fa1-12 Doctors Flates University Hospital
Sharjah University City Sharjah

8774_1002820
not found.

● پرویز شہریار

بی بی حوا کے نام

تجھ سے بچھڑ کے
اے بی بی حوا
ہم تیرے بچّے
بشری سمندر کے
پے در پے تھپیڑوں سے
دوٗر اور بھی دوٗر ہو گئے ہیں
بھیڑ میں کھو گئے ہیں
تمھارے ہمارے
درمیاں تھا جو حرف شیریں کا قصہ
وہ درد آشنا لمحہ، وہ ممتا سے لبریز رشتہ
اُس رشتے کی ڈور سے بندھے
ہم خلاؤں میں ہچکولے کھا رہے ہیں
پتنگوں کی مانند
ننھے بچّے کے ہاتھوں سے جوں
چھوٹ جائے
غبّاروں کی ڈور
اور بکھر جائیں جیسے
آسماں کی ناپید بلندیوں میں سبھی
ہم بھی،
اُن ہی غبّاروں کی طرح
اے بی بی حوا
تجھ سے بچھڑ کے

بھٹکتے رہے ہیں
ہر لمحہ اِس اُلجھتی بھول بھلیوں سی دُنیا میں
جی رہے ہیں
کسی طور
تیری ممتا کی چاہ میں، آس لگائے
شاید
خُدا کو
ہم پر بھی کبھی ترس آ جائے
اور.....
ناف کے اِس اُلجھے ہوئے رشتے کا سرا
دوبارہ کہیں جا کے پھر تجھ سے مل جائے
شاید
پھر کوئی دُنیا
کن فیکوُن سے
خلق ہو جائے!
جہاں باغِ بہشت کے مکیں ہوں
اور ہم ہوں
جہاں ابلیس کا نہ ہو گزر
جہاں شیطان کا نہ ڈر ہو
جہاں امن و آشتی ہو تمام!
اے کاش!
اپنا بھی ایسا گھر ہو
شجر ممنوعہ سے پرے

IV/48, NCERT Campus
Sri Aurobindo Marg
New Delhi-110016

● ایس۔ایم۔عباس

دوسرا بادل

برستے ہیں بادل/ اکثر برسات کے موسم میں
ہاں کبھی کبھی/ رہ جاتی ہے بارش/ مگر......سب بادل برستے ہیں
گھر کی چھت پر/ آنگن، صحن و گلی کوچہ میں
یا پھر...... کھلے میدان میں
ہوجاتے ہیں۔ندی نالے، کھیت، کھلیان جل تھل
موسم کا محکمہ بتاتا ہے/ پیمانہ سے ناپ کر
کہ کتنا پانی برس گیا ہے کل
لیکن ایک بادل سب سے الگ ہے
اچانک ذرا سی دیر میں/ لے آتا ہے کیسی کیسی گھٹائیں
جو برسنے لگتی ہیں دل کے آنگن میں
جلدی نہیں تھمتی ہ دل کی بارش
اٹھی رہتی ہیں رہ رہ کر کوئی لہر
کبھی کھی طوفان آسا بھی آجاتا ہے
اچانک کوئی باندھ ٹوٹتا ہے/ دل کے سیلاب کا پانی
امنڈ پڑتا ہے آنسو بن کر
بہتا رہتا ہے دیر تک/ یہ بارش کیسی ہے؟
کیسا طوفان اٹھتا ہے اچانک دل کے گوشوں میں؟
کاش کوئی دے سکتا اس کا جواب!
دل کی وادیوں میں اب تک آیا کتنا طوفان؟/ برسا ہے کتنا پانی؟
کاش کوئی لگا سکتا اس کا حساب!! نگ سے

◀◀ ● ▶▶

88- Tartala, Jaunpur, U.P

s\salis\Desktop
qaisar.jpg not
found.

● نوشی قیصر

میں کون ہوں

میں دیکھتی ہوں ہوں ہر صبح کی دھوپ کو
ہر شام کے ڈھلتے ہوئے سایوں کو
پتے جھڑتے ہیں جیسے اس طرف
ویسے ہی جھڑتے دیکھتی ہوں اس طرف
شام جیسے ہے خوب صورت اس طرف
ویسی ہی دیکھتی ہوں ڈھلتے ہوئے اس طرف
ہر صبح ہوتی ہے اک شردا سے جو اس طرف
تو صبح کا نور بھی دیکھا ہے میں نے اس طرف
سنی ہے میں نے اذانِ سحر جو اس طرف
تو گردواروں سے گربانی کی صدا اس طرف
کوئی بتائے گا مجھے
کیا اس طرف کھیتوں میں سرسوں اگا نہیں کرتی
وہاں کی مٹیاریں گیت گایا نہیں کرتیں
اس آسمان کا رنگ کیا نیلا نہیں
اس دھرتی کی مٹی کی خوشبو کیا سوندی نہیں
مجھ کو دیکھو میں سب دیکھتی ہوں
لیکن کچھ کہ نہیں سکتی ہوں میں
میں کونہ ہوں؟
سیما ہوں سرحدوں کی
کہ دو بھائیوں کے درمیان دیوار ہوں
مجھ کو کس نے بنایا یہ نہیں میں پوچھتی
بس اتنا بتا دے کوئی مجھے

کیا میں عمر بھر
دو اپنوں کو بچھڑا اور روتا دیکھنے کے واسطے درمیان میں
رہوں گی ہمیشہ کے لئے
ان کو ملنے سے روکتی
رہوں گی کیا میں سدا
سرحدیں ہوتی ہیں یوں تو
پہچان ہر ایک دیس کی
لیکن بھائیوں کو ملنے سے
کبھی روکا نہیں کرتیں
اپنوں کو دیکھنے کے واسطے
کسی کو ترسایا نہیں کرتیں
اے کاش کوئی جان پاتا
میرے دل کے درد کو
دو بھائیوں کی تکلیف کو
ہے دعا یہ میری کہ
ایکھائی اس طرف اور
دوسرا اس طرف جائے
اے خدا کر لے قبول میری دعا
میری ارداس میری پراتھنا

◀◀ ● ▶▶

113 -LOCKET ROAD
HARROW MIDDLE SEX HA3 7NY UK

● پرویز اختر

دوہے

جیون ہی بنواس ہے، دیکھو میرا حال
تم نے تو بس رام جی، کاٹے چودہ سال

☆

آنکھیں موندیں عمر بھر، بنتے رہے بس خواب
ہم نے سیکھے ہی نہیں، جینے کے آداب

☆

زادِ سفر کچھ بھی نہیں، میں کتنا نادان
جیون لمبا راستہ، ان دیکھا انجان

☆

افسر کوئی ڈاکٹر، فوجی کوئی کسان
اک شاعر کو چھوڑ کر، سارے لوگ مہان

☆

گھر، ور تو سب ٹھیک ہے، بہہ گئے سارے خواب
آیا ہے کس ڈھنگ سے ، اب کے برس سیلاب

☆

اک کو سوکھی روٹیاں، دوجا کھائے کھیر
دونوں کی ماں ایک ہی، الگ الگ تقدیر

☆

دنیا کی کیا سوچتے، تھمی نہ اپنی کھوج
اپنے ہی گھر بار کا، اُٹھا نہ ہم سے بوجھ

☆

کیا تجھ کو معلوم ہے، لالچ کا اتہاس
تنہا ہر اک آدمی، کون کسی کے ساتھ

☆

بڑا بول مت بولیو، سمے بڑا بلوان
دو، دو کوڑی میں بکا، سب کا سوا بھیمان

☆

سوگندھی ہوں میں وہی، وہی مرے حالات
میرے حصے میں سدا، لنگڑی لولی رات

☆

سرمایہ جتنا بڑھے، بڑھتی جائے پیاس
سولہ آنے سچ کہے، پرویز اختر بات

◀◀ ● ▶▶

25-Qazi Sarai, Po- Chaudpur,
Distt- Bijnor. U.P

بغداد میں ایک نانبائی تھا، وہ بہت اچھے نان کلچے لگاتا تھا اور دور دور سے دنیا اس کے گرم گرم نان خریدنے کے لیے آتی تھی۔ کچھ لوگ بعض اوقات اسے کھوٹا سکہ دے کر چلے جاتے جیسے یہاں ہمارے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ وہ نانبائی کھوٹا سکہ لینے کے بعد اسے جانچنے اور آنچنے کے بعد اسے اپنے 'گلّے' (پیسوں والی صندوقچی) میں ڈال لیتا تھا۔ کبھی واپس نہیں کرتا تھا اور کسی کو آواز دے کر نہیں کہتا تھا کہ تم نے مجھے کھوٹا سکہ دیا ہے۔ بے ایمان آدمی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس بلکہ محبت سے وہ سکہ بھی رکھ لیتا تھا۔ جب اس نانبائی کا آخری وقت آیا تو اس نے پکار کر اللہ سے کہا (دیکھئے! یہ بھی دعا کا ایک انداز ہے) ''اے اللہ! تو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ میں تیرے بندوں سے کھوٹے سکے لے کر انہیں اعلیٰ درجے کے خوشبودار گرم گرم صحت مند نان دیتا رہا اور وہ لے کر جاتے رہے۔ آج میں تیرے پاس جھوٹی اور کھوٹی عبادت لے کر آرہا ہوں، وہ اس طرح سے نہیں جیسی تو چاہتا ہے۔ میری تجھ سے یہ درخواست ہے کہ جس طرح سے میں نے تیری مخلوق کو معاف کیا تو بھی مجھے معاف کردے۔ میرے پاس اصل عبادت نہیں ہے۔''

بزرگ بیان کرتے ہیں کہ کسی نے اس کو خواب میں دیکھا تو وہ اونچے مقام پر فائز تھا اور اللہ نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا وہ متمنی تھا۔

اشفاق احمد (زاویہ)

● انٹرویو
● راشد اشرف/فرزانہ اعجاز

۱.....آپ کی پیدائش کہاں کی ہے، اور آپکے اطراف ادبی اور سماجی ماحول کیسا تھا؟

پیدائش کراچی کی ہے۔ 70 کی دہائی میں ادبی ماحول کے بارے میں اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت پنگوڑے میں تھا اور پنگوڑے کے اطراف کا ماحول ہمیشہ انتہائی غیر ادبی ہوتا ہے۔

۲.....آپ نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کہاں حاصل کی؟ اور تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ سے علمی استفادہ کیا؟

اوائل عمری ہی میں والدین کا بسلسلہ روزگار تبادلہ حیدرآباد سندھ میں ہوگیا تھا جہاں والد ایک بینک سے وابستہ تھے جبکہ والدہ تدریس کے شعبے سے منسلک تھیں اور چند برس قبل پروفیسر آف فزکس کے عہدے سے سبکدوش ہوئی ہیں۔ ابتدائی تعلیم انٹر تک حیدرآباد ہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد "اعلیٰ تعلیم" کے حصول کے لیے حیدرآباد سے کراچی کا رخ کیا جہاں سے این ای ڈی یونیورسٹی سے کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ اردو میں لکھنے کا آغاز سولہ برس کی عمر میں کیا۔ یہ بھی گویا ایک المیہ ہی ہے اس لیے کہ بچے عموماً ڈھائی تین برس کی عمر میں ہی لکھنا شروع کردیتے ہیں۔

تعلیمی زندگی میں اپنے اساتذہ کا احترام راقم کے دل میں شروع ہی سے تھا (اساتذہ منجانب راقم اپنے دلوں میں کتنی قدر و احترام رکھتے تھے، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے) خاص کر پبلک اسکول حیدرآباد میں اردو کے استاد سے راقم کو دلی عقیدت تھی۔ ان کا نام نعیم الرحمٰن جوہر تھا، نعیم صاحب پہلے ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ انٹر کی کلاس کے آخری دن نعیم صاحب نے اپنے تمام طالب علموں کے سامنے اپنی داستان حیات بیان کی۔ تمام طالب علم ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی باتیں سننے میں محو تھے۔ قبول اسلام سے قبل نعیم الرحمٰن جوہر، نربھرے رام جوہر تھے، ان کے والد نے انہیں گیتا کے ساتھ ساتھ بائبل اور قران کریم کی تعلیم بھی دی جس کی بنیاد پر آگے چل کر وہ اختیاری طور پر نربھرے رام سے نعیم الرحمٰن ہوئے۔

۳.....راشد صاحب۔ بتائیے کہ اس وقت اردو زبان اور اردو ادب کی ترقی کی کیا صورت حال ہے؟ اور کون سی صنف زیادہ ترقی کررہی ہے؟

اس وقت اردو زبان اور اردو ادب کی ترقی کی صورت حال بیک وقت مایوس کن اور خوش کن ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انٹرنیٹ کی آمد اور لوگوں کی کثیر تعداد کے اس سے استفادے کے بعد اردو لکھنے کا رجحان کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ ''کٹ اینڈ پیسٹ'' کا دور دورہ ہے۔ اکثر کہتا ہوں کہ اگر

پاکستان میں اگر ''گوگل سرچ انجن'' کی سہولت بند کردی جائے تو یقین کیجیے کہ اردو کے آدھے اخبار راتوں رات دم توڑ جائیں گے، آدھی صحافت کا صفایا ہوجائے۔ غالباً ہند میں بھی معاملہ مختلف نہ ہوگا۔ دوسری جانب امید افزاء پہلو یہ ہے کہ اس صورت حال میں بھی نئے لکھنے والے تواتر کے ساتھ سامنے آرہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں حالیہ چند برسوں میں خودنوشت لکھنے کے رجحان میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اس صنف ادب کو کئی لکھنے والوں نے درخور اعتنا جانا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے کئی لکھنے والوں نے اس انداز سے خودنوشت لکھی ہے کہ اپنے قاری کو ''درگور'' کردیا ہے (یہاں جی چاہ رہا کہ درخور اور درگور کے استعمال کی جانب اسی انداز سے قارئین کی توجہ مبذول کراؤں جیسے محترم بشیر مشاعروں میں بدر ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر سامعین کی توجہ اپنے اشعار کی جانب کرانے میں یدطولی رکھتے ہیں).....

خاکہ نگاری، سفرنامہ اور تنقید میں بھی کثیر تعداد میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔

رہا سوال شاعری کا تو اس سلسلے میں خامہ بگوش کا وہ بیان راقم کی نظر میں ہمیشہ تازہ رہے گا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "عہد میر میں دلی میں پانچ ہزار شاعر تھے، آج لاہور کے تھانہ انارکلی کی حدود میں اس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔''

اردو زبان و ادب میں شاعری ایک 'سنگین' مسئلے کا رخ اختیار کرتی جارہی ہے۔ حالیہ چند دہائیوں میں ایسے شعراء کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جو محض اپنا کلام شائع کرانے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس عمل کے دوران شاعری کے معیار کو یکسر نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے شعری مجموعوں کی کثیر تعداد میں اشاعت کے بارے میں کہا تھا:

''میں کسی طرح معاصر ادب کا نقاد نہیں لیکن میرے پاس شعری مجموعے جس کثیر تعداد میں آتے ہیں، میں ان سے سراسیمہ ہوگیا ہوں۔ اکتوبر نومبر 1986 میں چھ ہفتوں کے لیے میں حیدرآباد (دکن) سے باہر گیا۔ اس عرصے میں سات شعری مجموعے وصول ہوئے جن میں پانچ کے خالق ایسے تھے جن کا نام میں نے پہلی بار ان مجموعوں کے طفیل سنا۔ اگر کسی ہفتے کوئی شعری مجموعہ نہ آئے تو میں اسے مبارک جانتا ہوں۔ ایک شامت اعمال ہفتے میں تین مجموعے وصول ہوئے۔ اگر مجھ بے بصیرت کا یہ حال ہے تو جو حضرات اردو کے نامور مبصر اور دیدہ ور نقاد ہیں، ان کے ہاں تو شعری مجموعوں کی ایسی باڑھ آتی ہوگی کہ گھر میں ان کے بیٹھنے اٹھنے کو ایک جگہ بھی نہ بچتی ہوگی۔''

۴.....کیا کسی زبان کی ترقی محض اس بات پر منحصر ہے کہ اسکو سرکاری تحفظ حاصل ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو زبان اور ادب کے تحفظ اور ترقی کے کیا کیا اسباب ہوسکتے ہیں؟

کسی زبان کی ترقی ہرگز ہرگز محض اس بات پر منحصر نہیں ہے کہ اس کو سرکاری تحفظ حاصل ہو۔ اردو زبان میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی بھرپور قوت ہے۔ یہ تمام تر نامساعد و ناموافق حالات کے باوجود

بھی اپنا راستہ بنا رہی ہے۔ ان حالات میں سرکار عوام کو تحفظ دے لے، وہی بہت بڑی بات ہوگی، ایسی صورت میں عوام خود خوشی خوشی زبان کو تحفظ دے لیں گے۔

۵.....آپکی دلچسپی اردو کی کتابیں جمع کرنے میں ہے اور ان میں سے اکثر کتب کو۔کمپیوٹر پر منتقل کرنے کا محنت طلب کام کرنے کا خیال کیوں کر آیا؟

انٹرنیٹ پر راقم تادم تحریر پونے تین سو نادر و نایاب کتابیں پیش کرچکا ہے اور ان تمام کتابوں کے دائرہ مطالعہ یا ''ریڈرشپ کا'' ریکارڈ حیران کن ہے۔ اب تک پوری دنیا میں ایک لاکھ سے زائد افراد ان کتابوں کو پڑھ چکے ہیں جبکہ ڈاؤن لوڈ کرنے والوں کی تعداد علاحدہ ہے۔ اس کام کو سرانجام دینے کے پس پردہ صرف ایک ہی سوچ تھی اور وہ یہ کہ کسی بھی عمدہ و دلچسپ کتاب کو کسی فرد واحد کی ذاتی جاگیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ہر خاص و عام کی دسترس میں ہونا چاہیے۔

ایک امریکی اور ایک برطانوی آپس میں گفتگو کررہے تھے۔ برطانوی نے اپنی دوبین سے ساحل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا"وہ دیکھو! سوفٹ دورکس قدر حسین لڑکی کھڑی ہے"

امریکی نے جواب دیا''وہ تو ٹھیک ہے مگر سوفٹ دور کھڑی حسینہ کس کام کی؟''

سو کوئی اہم اور تاریخی کتاب اگر کسی صاحب کے کتب خانے میں برسوں سے پڑی ہے اور (معاف کیجیے گا) وہ اگر اس پر پھن کاڑھے بیٹھے ہیں تو اس کا دوسروں کو کیا فائدہ۔

اس کام کو کیے جانے کے پس پردہ اردو زبان کی ترویج کے ساتھ ساتھ یہ سوچ بھی کارفرما تھی کہ اردو کی وہ کتابیں پیش کی جائیں جو ماضی کی گرد میں کہیں چھپ کر نظروں اور ذہنوں سے اوجھل ہوگئی تھیں اور جو فی زمانہ کسی تحقیق کے کام میں مدد و معاون ثابت ہوسکتی ہیں مزید یہ کہ دنیا کے ایسے حصوں میں قیام پذیر لوگ ان سے استفادہ کرسکیں جہاں اردو کی کتابیں پہنچا تو کجا، وہ اردو بولنے کو بھی ترس جاتے ہیں۔

بیرون ممالک میں مقیم ایسے ہزارہا لوگ ہیں جنہوں نے مذکورہ کتابوں میں شامل فیروز سنز سے سن ستر کی دہائی میں شائع ہوئے بچوں کے ڈیڑھ سو سے زائد ناولوں کو اپنے بچوں کو اردو سکھانے کی غرض سے ڈاؤن لوڈ کیا ہے۔ راقم کے ذاتی ای میل میں اس سلسلے میں سینکڑوں ای میلز آچکی ہیں، لوگوں نے انہیں خود پڑھا ہے، اپنے بچوں کو پڑھوایا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ انٹرنیٹ پر درج ذیل لنک کی مدد سے مذکورہ تمام کتب تک بہ آسانی رسائی حاصل کی جاسکتی ہے:

http://www.scribd.com/zest70pk/documents

اس بات کا ذکر اہم ہے کہ ان میں زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جن کو شائع ہوئے چالیس سے پچاس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ راقم کا ای میل پتہ یہ ہے، اگر کسی صاحب کو اس سلسلے میں کسی دقت کا سامنا ہو تو براہ راست رابطہ کرسکتے ہیں:zest70pk@gmail.com

۶.....اس مشکل کام کرنے میں کیا کوئی دوسرا بھی آپکا مددگار ہے یا آپ اکیلے ہی چلے ہیں جانب۔اردوادب۔؟

واضح رہے کہ ان کتب کو اسکین کر کے انٹرنیٹ پر پیش کرنے کے سلسلے میں میں راقم اکیلا ہی کام کرتا رہا ہے اور ایک اندازے کے مطابق تادم تحریر ایک لاکھ سے زائد اوراق اس سلسلے میں اسکین کر کے پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہ دوانے کا سودا ہے، اور اس کام سے کسی مالی فائدے کی امید سے راقم کوسوں دور ہے۔ کتابیں ہر ''عام وخاص'' کے لیے ہیں اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ جب تلک ساغر چلے گا، چلائیں گے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کتابوں یا مطلوبہ مواد کی لوگوں کو فراہمی کے پس منظر میں مدد کا جذبہ کارفرما ہے اور اس سلسلے میں راقم، مشفق خواجہ مرحوم، سید معراج جامی اور عقیل عباس جعفری جیسے لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی حقیر سی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیشہ بنا کسی غرض، لوگوں کی مدد کی اور کر رہے ہیں۔

۷.....دنیا کے ہر کونے سے آپ کو کتابیں موصول ہوتی ہیں، آپ کا کیا تاثر ہے کہ دنیا کے الگ الگ حصوں میں رہنے والے، اردو والے، اور انکی نگارشات ایک جیسی ہیں یا ان میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اور یہ کہ خصوصاً برصغیر ہندو پاک میں اردو زبان کا کیا مستقبل نظر آتا ہے۔ اور دونوں ملکوں میں لکھے جانے والے ادب اور طباعت میں کیا کیا نمایاں فرق نظر آتا ہے؟

یہ بات درست ہے کہ راقم الحروف کو دنیا کے ہر کونے سے کتابیں موصول ہوتی ہیں۔ خاص کر ہندوستان سے جہاں سے ہر طرح کی چیز، ہر طرح کا سامان پاکستان آتا ہے سوائے کتابوں اور جرائد کے۔

دنیا کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والوں کی نگارشات ہرگز ہرگز ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ ان میں تنوع ہوتا ہے، ہر علاقے اور خطے کا رنگ نمایاں ہوتا ہے، ہر تحریر کا الگ الگ مزہ ہوتا ہے۔ خاص کر خودنوشتوں کے معاملے میں تو بیک وقت کئی 'ذائقے' محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ہاں البتہ پاک و ہند سے شائع ہونے والی خودنوشتوں میں ایک قدر مشترک ضرور ہے۔ برصغیر کے نامساعد حالات میں لوگوں کا آگے بڑھنا، زیست کرنا، اس میں درپیش مصائب کا بیان اور ہمت اور عزم سے ان سے نبرد آزما ہونے کا احوال۔ یہ قاری کو ہمت اور حوصلہ دیتا ہے۔

حالیہ دنوں میں راقم نے دہلی سے شائع ہوئی ایک ایسی ہی خودنوشت " پگڈنڈیاں " کا مطالعہ کیا اور مصنفہ "بچت کور" کے دکھ کو اپنے دل میں محسوس کیا۔ اسی طرح خاکہ نگاری کی صنف میں بے شمار لوگوں نے اہم سنگ میل قائم کیے ہیں، درجنوں معیاری مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ منٹو، شورش کاشمیری، چراغ حسن حسرت، نصر اللہ خاں، ماہر القادری، اسلم فرخی، غرضیکہ کس کس کا نام لوں اور کس کا نہیں۔ لیکن حال ہی میں ہندوستانی فلمی صنعت سے وابستہ میرے محترم کرما فرما جاوید صدیقی کے شخصی خاکوں کا مجموعہ

''روشندان' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے مطالعے کے بعد راقم کا یہ ماننا ہے کہ خاکہ نگاری کی تیزی سے ماند پڑتی صنف ادب میں گویا اس کتاب نے ایک نئی روح پھونک دی ہے اور اس کی رگوں نیا خون دوڑا دیا ہے۔ ہر حساس دل رکھنے والے کو اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔

''پگڈنڈیاں'' ہو یا ''روشندان''، دونوں میں حالات حالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مجبور انسانوں کی داستانیں موجود ہیں۔ یہ اس خطے کی قسمت ہے جسے برصغیر پاک و ہند کہا جاتا ہے۔ یہاں کی اکثریت کو نان وجویں کے لیے سنگلاخ پتھروں کا کلیجہ چیرنا پڑتا ہے۔ اپنا آپ داؤ پر لگانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے اور وہ بھی سب کے نصیب کا حصہ نہیں بنتا۔

راقم کی نظر میں برصغیر ہندو پاک میں اردو زبان کا مستقبل تمام تر ناموافق حالات کے باوجود پائدار ہے۔ خاص کر ہندوستان میں جب تک "اردو" زبان میں فلم بنتی رہے گی، اردو آگے بڑھتی رہے گی۔ یقین کیجیے کہ جب تک چھوٹے چھوٹے اداکار بچے ہندوستان میں بنی "چلر پارٹی" جیسی فلموں میں بے عیب، ش قاف کا خیال رکھتے ہوئے اردو (ان مقامات کو چھوڑ کر جہاں بمبئیا اردو بولی گئی ہے) بولتے رہیں گے، اردو آگے بڑھتی رہے گی۔ جب تک رچی مہتا جیسے لوگ ''عمل'' جیسی فلموں کو پیش کرتے رہیں گے اور نصیر الدین شاہ جیسے عظیم اداکار مذکورہ فلم میں بے عیب اور بامحاورہ اردو بولتے رہیں گے، اردو کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ گلزار صاحب جب تک بامحاورہ مکالمے لکھتے رہیں گے، وہاں اردو پیش قدمی کرتی رہے گی۔ یہاں میں ہندوستانی آرٹ فلموں کا ذکر قصداً نہیں کرنا چاہتا کہ وہ میری انتہائی دلچسپی کی چیز ہیں جن پر تفصیلی گفتگو کا یہ متحمل یہ انٹرویو نہیں ہوسکتا۔ لیکن بہرحال اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ ان فلموں میں سے بہتیری ایسی ہیں جن میں اردو زبان کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور دیکھنے والوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب ملی ہے۔ پاکستان کہنے کو اردو کا گڑھ سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں یہ حال ہے کہ انگریزی دان طبقہ اردو کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پاکستان میں انگریزی بولیے، رکے ہوئے کام ہوجائیں گے، سامنے والا مرعوب ہوجائے گا۔ یہاں ایسے مناظر دیکھتے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے۔

ہند میں انگریزی بولنا باعث فخر نہیں سمجھا جاتا جبکہ یہاں اس کے برعکس ہے۔

ادھر یہاں کے ٹی وی چینلز نے وہ ادھم مچایا ہے کہ الامان الحفیظ۔ سب سے زیادہ بگاڑ یہی لوگ پیدا کر رہے ہیں۔ خبریں پڑھنے مرد وخواتین سارا دن غلط اردو بولتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنہوں نے کبھی اردو کی کوئی کتاب کھول کر بھی نہ دیکھی ہوگی۔ محترم آصف جیلانی کی بات دوہرا رہا ہوں کہ لفظ ''حوالہ'' پاکستان میڈیا کے اعصاب پر سوار ہوگیا ہے۔ ایک ایک جملے میں چار چار مرتبہ اس لفظ کو دوہرایا جاتا ہے۔ سب سے بڑا چینل ہونے کے دعوے دار ٹی وی چینل پر ایک میک اپ میں لتھڑی ہوئی خبریں پڑھنے والی خاتون کا قصہ تو محمود شام صاحب نے راقم سے بیان کیا تھا۔ پاکستان میں 2009 میں آنے والے

سیلاب کے دنوں میں کیے گئے ایک براہ راست پروگرام کے دوران وہ ناظرین سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے فرمارہی تھیں کہ ''آگے بڑھیے! ہم آپ کی دست درازیوں کے منتظر ہیں''۔اب کوئی اس سے پوچھتا کہ بی بی! تمہاری درخواست کے جواب میں یہاں تو پروانوں کی قطار لگ جائے گی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ جو عورت مذکورہ بالا فقرے کے مفہوم اور اس کے 'نتائج' سے نابلد تھی، اسے وائس آف امریکہ نے اپنے پروگرام میں بطور میزبان لے لیا تھا۔

دونوں ملکوں میں شائع ہونے والی کتابوں کی طباعت میں واضح فرق ہے۔ یہ فرق صاف نظر آتا ہے۔ راقم کو ایک ہندوستانی ناشر نے حال ہی میں بتایا تھا کہ ہند میں سرکار اردو زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کو مالی معاونت فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سے آنے والے رسائل کی قیمت ناقابل یقین حد تک کم ہوتی ہے، اتنی قیمت میں پاکستان میں رسالے کا سرورق ہی بنتا ہوگا۔ یہی حال کتابوں کا ہے۔ ہند سے شائع ہونے والی کتابوں کا کاغذ نہایت عمدہ اور معیاری ہوتا ہے جبکہ یہاں بڑے بڑے نامی گرامی ناشرین کا یہ حال ہے کہ وہ "میٹ" کاغذ (ایک سالخوردہ نظر آنے والا ٹیلا ملگجا سا شرمناک کاغذ جسے دیکھ دل بیٹھ جاتا ہے) کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ حال ہی میں نامور ادیب و براڈ کاسٹر رضا علی عابدی کی کتاب ''کتابیں اپنے آباء

کی'' شائع ہوئی ہے اس قدر عمدہ اور دلچسپ و تاریخی کتاب کی طباعت کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اس نوعیت کی کئی مثالیں ہیں۔ کتابیں اپنے آباء کی ''آباء'' ہی کے زمانے میں شائع ہوئی کوئی کتاب جان پڑتی ہے۔

۸.....آپ کو خود ادب کی کون سی صنف زیادہ پسند ہے اور آپ کس صنف میں اظہار خیال کرنا پسند کرتے ہیں؟

خودنوشت، خاکہ اور سفرنامہ۔ راقم الحروف کے خیال سے یہ تینوں اصناف ادب محض اس کی نہیں بلکہ اکثریت کی پسندیدہ ہوتی ہیں۔ پاکستانی ادیبوں کے تحریر کردہ ہندوستان کے سفرناموں سے شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ 2011 میں فرزند ابن صفی جناب احمد صفی دلی گئے تو راقم نے انہیں لذت کام و دہن کی آزمائش کے لیے کریم ہوٹل کا نام تجویز کیا اور نتیجہ حسب حال نکلا۔ کریم ہوٹل کے کھانے کھا کر ان کا وزن اور واپسی پر اس کے بیان سے ہماری اشتہا، دونوں میں قابل ذکر اضافہ ہوا تھا۔ اسی طرح اور کئی مثالیں بھی ہیں۔

خودنوشت آپ بیتی راقم کی دلچسپی کا ایک خاص موضوع ہے اور اس صنف ادب میں کچھ کام بھی کیا ہے۔ پاک و ہند سے شائع ہونے والی خودنوشت آپ بیتیوں کی فہرست پر راقم گزشتہ چار برس سے کام کر رہا ہے، یہ تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور امکان ہے کہ کسی موقر (یا غیر موقر) ادبی جریدے میں شائع ہوگی۔ اسی طرح ابن صفی پر دو کتابیں لکھنے کے بعد اب اردو خودنوشتوں پر ایک جامع کتاب لکھنے کا ارادہ ہے لیکن کیا

کیجیے کہ راقم کسی ''قدر ناشناس'' کی تگڑی سی ''زر پرستی'' کا طلبگار ہے اور ذاتی طور پر سوچتا ہے کہ اگر اس کے بجائے ملکہ شراوت پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوتا تو ناشرین کی قطار لگ چکی ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ قطار میں موجود ناشرین کی اکثریت میں 'نا' اور 'شر'، دونوں عناصر کا غلبہ ہوتا۔ لیکن صاحب، کیا کیجیے کہ اگلے وقتوں میں زور شرافت پر ہوتا تھا، اب ''شراوت'' پر ہے۔

خیر یار زندہ صحبت باقی بلکہ ناشر زندہ شراوت باقی.....!

رہا سوال اظہار خیال کرنے والی بات کا تو کتابوں بالخصوص خودنوشتوں پر تبصرے ہی عرصہ چار برسوں سے دلچسپی کا موضوع رہے ہیں جو پاک و ہند کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ راقم اس کوشش کو اپنے باعث فخر نہیں سمجھتا، یوں سمجھ لیجیے کہ دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۹.....کمپیوٹر کی ایجاد نے۔ اردو والوں کو۔ بہت قریب، کر دیا ہے، یہ اچھی علامت ہے یا تصادم کی؟

اس بات میں دوسری کوئی رائے نہیں ہو سکتی کہ کمپیوٹر کی ایجاد نے اردو والوں کو قریب کر دیا ہے۔ دنیا بھر میں ایسے سماجی رابطوں کی ویب سائٹس اور متفرق فورمز کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جہاں نئی کتابوں کی اشاعت کی اطلاعات، شاعری، نثری مضامین سبھی کچھ ایک پلک جھپکتے میں ای میل باکس میں پہنچ جاتا ہے، لوگ اسے باقاعدگی سے دیکھتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے کتابوں کی فروخت میں نمایاں طور پر اضافہ ہوا ہے۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ راقم الحروف کی، بارے نئی کتابوں کی اشاعت، پیش کی جانے والی خبروں کے ردعمل میں لوگ اردو بازار کراچی کی سب سے بڑی دو دکانوں میں متعلقہ کتاب کے حصول کے لیے راقم کی "مدلل" رائے و تعارف کے احترام میں راقم کا نام لیتے پہنچے۔ البتہ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہ مل سکا کہ زر کثیر صرف کر کے کتاب خریدنے اور اسے پڑھنے کے بعد وہی لوگ راقم الحروف کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ سچ پوچھیے تو طبیعت میں پائی جانے والی درویشی اور متاثرین کے متوقع ردعمل کے سبب کبھی ہمیں اس کی تفصیلات جاننے کا شوق بھی نہ ہوا۔

بہرحال یہ صحت مندانہ رجحان ہے، حوصلہ افزاء بات ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اردو ٹائپنگ یعنی یونی کوڈ (یا ان پیج) کے استعمال میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور راقم کے ذاتی علم میں ایسے کئی بزرگ ہیں جو اسی برس سے زیادہ کی عمر میں مہارت سے اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ، پروفیسر اطہر صدیقی، آصف جیلانی..... کتنے ہی ان جیسے مزید نامور لوگ ہیں جو مذکورہ طرز تحریر میں مہارت رکھتے ہیں۔

اس شعبے میں کئی خاموش مجاہد صلے کی تمنا کی پروا کیے بغیر چپ چاپ اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں کئی نام ہیں جیسے فرخ منظور، محمد وارث اور اسی طرح ہند میں اعجاز عبید ہیں جنہوں نے یونی کوڈ میں متفرق موضوعات پر ہزار ہا برقی کتابوں کی دستیابی کو ممکن بنایا ہے۔ پاکستان میں ایک صاحب شرجیل نامی نے شکاریات پر ایک عمدہ ویب سائٹ بنائی ہے۔ اعجاز عبید صاحب کو پاکستان سے بھی کئی لوگوں کا تعاون حاصل

ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ ان تمام لوگوں کی ستائش کرسکوں۔ اردو محفل، اردو ویب، اردو سخن وغیرہ کئی ایسی سائٹس ہیں جہاں اراکین اردو میں لکھتے ہیں اور تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

حال ہی میں ریختہ کے نام سے ہند میں ایک اردو ویب سائٹ کا آغاز کیا گیا ہے جہاں پرانی کتابیں دستیاب ہیں۔ یہ نہایت کارآمد ویب سائٹ ہے جو تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔

راقم الحروف نے بھی اس سلسلے میں کچھ ٹوٹا پھوٹا کام حسب توفیق واستطاعت کیا ہے اور تادم تحریر متفرق موضوعات پر 282 کتابیں اپ لوڈ کی ہیں۔ ان میں پچانوے فیصد کتابیں ایسی ہیں جن کی اشاعت کو چالیس سے پچاس اور بعض کو ساٹھ برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان میں خودنوشتیں بھی ہیں، سفرنامے بھی اور خاکوں کے مجموعے بھی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین کی اکثریت اس دنیا سے جا چکی ہے بصورت دیگر وہ کاپی رائٹ کی اس خلاف ورزی کی صورت میں راقم پر یقیناً" نالش کردیتے۔

پاک وہند سے جب کبھی بھی کوئی رابطہ کرکے یہ اطلاع دیتا ہے کہ راقم کی اپ لوڈ کی ہوئی فلاں کتاب اس کے ایم فل یا پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں کارآمد ثابت ہوئی ہے تو یقین کیجیے کہ یہ خاکسار کے لیے ازحد باعث طمانیت وانبساط ہوتا ہے۔

۱۰.....آخیر میں ان ادیبوں اور شاعروں کے نام بتایئے؟ جو آپکو زیادہ پسند ہیں اور ایسے کچھ اشعار سنایئے جو آپ کے دل کے قریب آ گئے۔

یہ سوال دلچسپ ہے۔ اوائل عمری ہی سے بچوں کے ناول لکھنے اور ترجمہ کرنے والے ادیب میرے دل کے قریب رہے تھے۔ یہ مجھے ایک ایسی دنیا میں لے جاتے تھے جو ایک طلسماتی دنیا تھی۔ یہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے تھے، ذہنوں کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ یہ وہ خاموش مجاہد تھے جن کے اوپر تاحال کوئی تحقیق نہ ہوئی، کوئی مقالہ نہ لکھا گیا، اور تو اور ان میں سے اکثر کا ذکر بعد از مرگ وفیات کی کتابوں میں بھی نہ آیا۔ وہ قلم کی مزدوری کرتے، کسی صلے کی تمنا کے حصول کے بنا، خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن مجھ ایسے لاکھوں پڑھنے والوں کے ذہن وقلب میں وہ آج بھی پوری آب وتاب سے زندہ ہیں۔ ان میں مقبول جہانگیر ہیں، سلیم احمد صدیقی، زبیدہ سلطانہ، جبار توقیر، محمد یونس حسرت ہیں۔ راز یوسفی، سعید لخت، سعید احمد سعید، ابوضیاء اقبال ہیں۔

ان میں سید ذاکر اعجاز، شوکت ہاشمی، قمر نقوی، فرخندہ لودھی، عزیز اثری، ذوالفقار احمد تابش، سیف الدین حسام جیسے قلمکار شامل ہیں۔ یہ میرے ہیرو ہیں اور میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں۔

اور پھر اے حمید مرحوم کو تو کسی طور نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ کچھ وقت گزرا اور چھٹی جماعت میں پہنچا تو وقت سے قبل ہی ابن صفی مرحوم کو جا پکڑا اور ان کی تحریر کے سحر میں ایسا مبتلا ہوا کہ آگے چل کر ان پر باقاعدہ تحقیق کر ڈالی، اور ان پر دو عدد کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ مختصر الفاظ میں کہنا چاہوں گا

کہ ابن صفی، اے حمید اور محمد خالد اختر سے میں نے محبت کی ہے۔ ان میں اے حمید مرحوم سے لاہور میں ان کی قیام گاہ پر ملاقات کرنے کا بھی موقع ملا تھا۔ آج بھی ان تینوں ادیبوں کی کوئی بھی کتاب ہاتھ میں تھام کر دنیا ومافیہا، بلکہ کراچی کے حالات کے تناظر میں "مافیا" کہیں تو بہتر ہوگا، سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔

ان مصنفین کی برسہابرس پرانی تحریر کردہ کتابوں کو دیکھ کر آج بھی میری وہی کیفیت ہوتی ہے جسے محمد خالد اختر نے ایک مرتبہ اپنی پسندیدہ کتابوں کو ایک زمانے بعد اپنے عزیز از جان دوست، مشہور مزاح نگار شفیق الرحمٰن کے گھر میں ایک ڈبے میں رکھا دیکھ کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

''چھ سبز چھوٹی سی کتابیں۔ کیسے خوبصورت، مسرت بخش essays وہ لکھتا تھا اور ملنے میں وہ کتنا شفیق، ہنس مکھ، خوش گفتار رفیق ہوگا۔ اب میں نے اس کی کتابیں سالوں کے بعد دیکھیں۔ ایک پھانس سی میرے حلق تک آئی اور میں نے انہیں بھیگی ہوئی آنکھوں سے، احترام سے اس گوشے سے اٹھایا۔ اپنے ہاتھ سے بار بار تھپکا۔ ایلفا، پیارے ایلفا۔ تم نے ہمیں ہماری جوانی میں کیا کچھ نہیں دیا۔ تمہارے جیسے essays، زندگی کے حزن، اس کی شادمانی اور خوبصورتی سے دمکتے ہوئے، اب کون لکھ سکے گا''۔

رہا سوال اشعار کی پسندیدگی کا، تو چند پسند کے اشعار یہ ہیں لیکن خدارا اس سے خاکسار کے ذہنی رجحان، رویوں وغیرہ کا اندازہ نہ لگایا جائے جیسے ماہرینِ تحریر شناسی، تحریر دیکھ کر اور دست شناس ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے بعد الل ٹپ اندازے لگاتے ہیں کہ فلاں شخص نے اب تک کی زندگی میں اتنے قتل اور اتنے عشق کیے ہیں اور مزید اتنے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے:

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

دل کو ہم سمجھا کے لائے کوئے جاناں سے حسن
دل ہمیں سمجھا بجھا کر، کوئے جاناں لے چلا

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں مرے ہے
لیکن وہ مرے خواب، مرے خواب، مرے خواب

کھلا اک عمر میں کار ہوس میں کچھ نہیں رکھا
پھر اس کے بعد میں نے دسترس میں کچھ نہیں رکھا

جمال یار میں رنگوں کا امتزاج تو دیکھ
سفید جھوٹ ہیں ظالم کے سرخ ہونٹوں پر

◀◀ ● ▶▶

اردو سہ ماہی 'ثالث' کی رسم اجرا.....ایک رپورٹ

اردو سہ ماہی ''ثالث'' کی رسم اجرا مورخہ ۷ ستمبر ۲۰۱۳ء کو اقبال ریسرچ سینٹر، کنکر باغ، پٹنہ میں اردو کے مشہور ادیب و شاعر ڈاکٹر منظر اعجاز کی صدارت میں خاتون فکشن رائٹر نوشابہ خاتون کے دست مبارک سے انجام پذیر ہوئی۔ تقریب کے آغاز میں رسالہ ہذا کے مدیر اعزازی ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر صفدر امام قادری (سابق صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ) نے رسالے کو اپنی نیک خواہشات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ یوں تو فی زمانہ اردو کے کئی چھوٹے بڑے رسالے نکل رہے ہیں لیکن انہیں یقین ہے کہ ''ثالث'' بہت جلد ان کے درمیان اپنا ایک منفرد مقام بنالے گا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے کئی قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔ جناب خورشید اکبر (مدیر اعزازی، آمد، پٹنہ) نے اپنے تجربات کی روشنی میں فرمایا کہ مدیر ایک ذمہ دار شخص ہوتا ہے اور اسے مشتملات کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ جناب پرویز عالم (لائبریرین، بہار گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ) نے کہا کہ رسالے کی اشاعت کے بعد سب سے بڑا مرحلہ اسے قارئین تک پہنچانا ہوتا ہے اور رسالہ جتنی جلد لوگوں تک پہنچ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ صدر مجلس ڈاکٹر منظر اعجاز نے رسالے کے مدیر ثالث آفاق صالح کو مبارکباد پیش کی اور رسالے کے استحکام کے لئے چند مفید مشوروں سے نوازا۔ اس موقع پر پروفیسر حسن احمد دانش نے بھی اپنے خیالات پیش کئے اور مدیر ثالث کو مبارکباد پیش کی۔

جناب ظفر صدیقی نے منظوم تہنیت پیش کی۔

حلاوت، روشنی خوشبو رسالے — دلوں پر کرتے ہیں جادو رسالے
وہ تہذیب و تکلم کی علامت — جو پڑھتے ہیں سدا اردو رسالے
(ظفر صدیقی)

آخر میں رسالے کے مدیر ثالث آفاق صالح نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ فی زمانہ کسی اردو رسالے کے اجرا گھاٹے کا سودا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ادب کی خدمت کرنا ان کا شوق ہے اور یہ کام وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی بات اقبال حسن آزاد کے اس شعر پر ختم کی:

نہ کچھ خرید سکا اور کچھ نہ بیچ سکا — میں آگے بڑھ گیا دل کی دکان ہوتے ہوئے

اس خوبصورت اور کامیاب پروگرام کی نظامت جناب قوس صدیقی نے بحسن و خوبی انجام دئے۔

☆☆☆

'ثالث' پر تبصرے

(۱)

● حقانی القاسمی

سہ ماہی 'ثالث' کا پہلا شمارہ ریاست بہار کے ضلع مونگیر سے شائع ہوا ہے، جو اسطوری و تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ کہتے ہیں کہ مہابھارت میں بھی اس شہر کا ذکر موجود ہے اور ہیونگ سانگ نے بھی اپنے سفر نامہ میں اس کی بابت لکھا ہے۔ آئین اکبری میں بھی اس کے حوالے ملتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی ادب نواز صاحب زادی اور شاعرہ زیب النساء بیگم کے استاد ملا محمد سید المعروف اشرف کا مزار بھی اسی علاقہ میں واقع ہے۔ تاریخ میں اس شہر کے اور بھی درخشاں نقوش تلاش کیے جا سکتے ہیں ہیں، مگر ہماری نسل تو مونگیر کو بنگال کے نواب میر قاسم کے قلعہ کی وجہ سے ہی جانتی ہے۔ شخصیتوں کی طرح شہروں میں بھی کشش ہوتی ہے اس کے آثار و باقیات سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس شہر میں بھی کچھ ایسے تاریخی مقامات ضرور ہوں گے جن سے ہماری نسل ناواقف ہے۔ ثالث میں اگر اس شہر کی ثقافت اور تاریخ کے حوالے سے کچھ اشارے ہوتے تو شاید ان افراد کو جنھیں تاریخ سے زیادہ دلچسپی ہے، خاص طور پر ماضی کی تاریخ سے تو انھیں ثالث میں ایک مقناطیسیت سی محسوس ہوتی۔ بہر حال تمہید سے قطع نظر زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان سہ ماہی 'ثالث' کا نقش اور کافی بہتر نظر آ رہا ہے۔ فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تخلیق مرکوز رسالہ ہوگا۔ تخلیق کو اس میں ترجیحی حیثیت دی گئی ہے۔ آج کے دور میں جب تخلیق ثانوی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے اور تنقید کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے تو ایسے میں اس فہرست کو ایک احتجاجیہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ افسانہ کے تحت ۱۵ تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ علی اکبر ناطق، محمد حامد سراج، عامر ابراہیم، عمر احمد بنگش، وحید احمد قمر، نور العین ساحرہ، منیر احمد فردوس، نعیم بیگ، فرح ندیم، تبسم فاطمہ، محمد نعیم دیپال پوری، ناصر علی وارثی، علیم اللہ علیم، فرخندہ رضوی، شاہین کاظمی ان سب کے افسانے سیاسی، سماجی منظر نامے اور مسائل سے متعلق ہیں، ان میں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ Webzines سے لی گئی لگتی ہیں۔ لیکن یہ تمام افسانے ایک نئی لہر کا اشاریہ ہیں، موضوع اور اسلوب کی سطح پر بھی تبدیلی کا پتہ دیتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ اس باب میں زیادہ تر افسانہ یا تو پاکستانی ہیں یا پاکستان نژاد تارکین وطن ہیں۔ ہندوستان سے صرف ایک یا دو کی

نمائندگی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیران دراصل افسانے کے بدلتے عالمی رویے اور رجحانات سے قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں یا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں افسانہ کمزور پڑتی صنف ہے۔

تنقید کے باب میں صرف تین مضامین کی شمولت ہے۔صفدر امام قادری نے ظفر کمالی کی رباعیوں کے حوالے سے تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا مضمون لکھا ہے۔صفدر کے ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی سوال یا ایسا اشارہ ضرور ہوتا ہے جو منجمد ذہنوں کو متحرک کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔شبنم افروز نے اصغر گونڈوی کی صوفیانہ شاعری کے حوالے سے عمدہ مضمون لکھا ہے۔انہوں نے مجنوں گورکھپوری، سلام سندیلوی کے مفید اور معلوماتی اقتباسات سے اپنے مضمون کو متوازن اور مدلل کیا ہے۔شبنم نے مجنوں کی وہ رائے لکھی ہے جس سے انہوں نے اصغر کو تصوف کا شاعر ماننے سے انکار کیا ہے۔دوسری طرف انھوں نے سلام سندیلوی کے حوالے سے یہ لکھا ہے:

''مجنوں صاحب کا قول کہ اصغر کی شاعری میں حافظ کی مستی، خیام کی تیکھی حکیمانہ لاادریت یا رومی کی عرفانیت نہیں ہے، سراسر غلط ہے۔البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصغر نے فارسی شعرا کی کورانہ تقلید نہیں کی ہے بلکہ ان کی ندرت پسند طبیعت نے تصوف کے لیے اپنی نئی راہ تلاش کی ہے۔مگر بہر حال یہ نئی راہ تصوف کی ہی طرف لے جاتی ہے۔''

شبنم نے صرف ان ہی اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ شعری شواہد کے ذریعہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں کہ اصغر گونڈوی کی شاعری میں تصوف کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور وہ صرف رسمی طور پر نہیں، بلکہ عملی طور پر بھی صوفی تھے۔انھوں نے شعری استشہاد کے ذریعہ اپنے موضوع اور موقف کو تقویت پہنچائی ہے اور بقا، بے خودی، مشاہدہ کے علاوہ تصوف کی دیگر اصطلاحات کا ان کی شاعری میں سراغ لگاتے ہوئے اپنے مضمون میں یہ لکھا ہے:

'ان کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سارے مضامین اور اصطلاحات کو شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔تجلی، ازل، شریعت، طریقت، وادیٔ طلب، وادیٔ استغنا، وادیٔ حیرت، مراقبہ، محادثہ، مسامرہ، شوق، حضور وغیب، احسان، وجد، بسط، قبض، صحو، سکر، تجرید، تفرید، تلوین، تمکین، انابت، اثبات، محو، رضا، دعا، سکوت، لقا، تعذر اور یک بینی وغیرہ کے رنگ ان کی شاعری کا خاص حصہ ہیں۔'

اسلم بدر نے نیاز اختر کی کہانیوں کے اشاریے کے عنوان سے بہت اچھا مضمون تحریر کیا ہے اردو والوں کی عام روش اور روایت سے ہٹ کر ان کی تحریر ہوتی ہے اس لیے ان کی تحریروں کے بین السطور میں آگہی کے بہت سے ایسے اشاریے ہوتے ہیں جن سے باضابطہ اردو والوں کو شاید ہی واقفیت ہو۔اس مضمون میں بھی انھوں نے اپنی اسی علمیت کا ثبوت دیا ہے۔نیاز اختر کی کہانیوں کی تفہیم کے لیے جو تمہیدی

جملے لکھے ہیں، وہ بہت ہی فکر انگیز اور معنی خیز ہیں۔بنیادی طور پر وہ سائنس ذہن ومزاج رکھتے ہیں اسی لیے وہ کسی بھی تخلیق کو سائنٹفک انداز میں پرکھتے ہیں۔ان کے معروضی طرز فکر کی ایک مثال یہ اقتباس بھی ہے:

''صنعتی ترقی کی بے سمت و بے مہار بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ماحولیاتی آلودگی کے سبب کچھ حیوانی نسلوں (بشمول پرندوں) کا عنقا ہو جانا، نئی نئی بیماریوں کا پھیلنا، موسموں کے مزاج کا بدلنا اور سنامی جیسے حادثات تو چھوٹے چھوٹے وقوعے ہیں۔ماہرین فلکیات و ماحولیات کا ماننا ہے کہ اگر زمین پر کنکریٹ اور چمنیوں کے جنگل یوں ہی اگتے رہے اور چمنیاں یوں ہی بے لاگ اور بے روک ٹوک دھواں اگلتی رہیں تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری زمین کو ایک بار پھر طوفان نوح کا سامنا کرنا پڑے۔اس کی دو وجہیں ہوں گی۔ گلوبل وارمنگ (global warming) اور اثیری تہو میں سوراخ (depletion in ozone layer)۔گلوبل وارمنگ کی بڑی وجہ تو ہمیں معلوم ہے کہ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں ہے (جس میں گرد وغبار اور کاربن ڈائی آکسائڈ گیس شامل ہیں) اس سے نہ صرف ہوا میں، سانس لینے کے لیے ضروری آکسیجن کا تناسب بگڑ رہا ہے، بلکہ اس سے بھی اہم یہ کہ غبار اور دھوئیں کی دبیز تہیں سورج کی ان کارآمد اور مفید شعاعوں کے آگے چلمن ہو جاتی ہیں، جن کی زمین پر بسنے والے ہر جاندار کو ضرورت ہے۔ نتیجہ بیماریاں، مہاماریاں، موت۔

اوزون کی تہیں زمین کی سطح سے تقریباً ۳۰ میل کی بلندی پر ہیں اور زمین کے چاروں طرف ماسک کی صورت، سورج کی زہریلی شعاعوں (Ultra Violet Rays) کو چھان کر، مفید شعاعیں زمین تک اتارنے میں ہمہ دم مصروف عمل ہیں۔مگر ہم ہیں کہ اس ماسک میں سوراخ کرنے میں مصروف ہیں۔کارخانوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں میں ایسے کچھ کیمیائی عناصر بھی ہوتے ہیں جن سے اوزون کی تہوں میں سوراخ ہو رہے ہیں۔ان سوراخوں سے سورج کی زہریلی شعاعیں براہ راست زمینی سطح تک اتر رہی ہیں۔ان شعاعوں کے اثر سے بھی عالم حیوانات ونباتات کی دائروی زندگی میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔مگر یہ سب بھی چھوٹے چھوٹے وقوعے ہیں، بڑا وقوعہ یہ کہ ان شعاعوں کے زیر اثر آہستہ آہستہ شمالی اور جنوبی قطبین میں کھڑے ہوئے برف کے عظیم پہاڑ اور جمی ہوئی فرف کے مہیب سمندر پگھل رہے ہیں۔زمینی سمندروں کی سطح رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی ہے۔اگر آلودگی پر لگام نہیں کسی گئی تو اثیری تہوں میں دریچے اور دروازے کھل جائیں گے۔تب زمین کو غرقاب ہونے سے کون روک سکے گا.....آنے والی آبی قیامت کا منظر نامہ آپ کے سامنے ہے۔صنعت کار بیدار ہوں یا نہ ہوں، ایک کہانی کار بیدار ہے۔''

اسلم بدر نے نیاز اختر کی کہانیوں کا تجزیہ بھی آج کے سائنسی اور صنعتی مسائل کی روشنی میں کیا ہے اور اس طرح تجزیے کو ایک نیا زاویہ مل گیا ہے۔ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''گدھ کا تھیم تو فضائی آلودگی ہے 'افعی' کا تھیم 'آبی آلودگی' کا مسئلہ اٹھاتا ہے۔ناگفتہ بہ حالات

کی سفا کی اک اندازہ اس سے لگائیے کہ حالات کے خلاف اٹھنے والی آواز کو بھی صنعتی مافیا ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے سے باز نہیں آتے۔

'رنتھی' کے تھیم کو بھی میں 'آلودگی' سے ہی تعبیر کروں گا۔ مگر اس کی آلودگی کا تعلق آب وہوا سے نہیں بلکہ انسانی اقدار سے ہے، سماج اور تہذیب سے، جس کی حد درجہ تنزلی وپستی کے اسباب ہیں۔ لالچ، ہوس، کرپشن، گندی سیاست۔ ہمارے ملک میں چھوٹی بڑی صنعتیں اکائیوں کی بھرمار تو ہو ہی رہی ہیں۔ علاج ومعالجہ کے لیے 'میڈیکل سنٹر' 'نرسنگ ہوم' 'کلینک' اور پانچ ستارہ جیسے 'پرائیوٹ ہسپتال' بھی اب نفع بخش 'بزنس سنٹر' ہو کر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی مشین بن چکے ہیں۔ جہاں ڈکٹروں کا اٹھایا ہوا Hippocratic Oath (انسانی خدمت کا عہد نامہ بقراط) ہسپتال کے احاطے سے دور کھڑا سسکیاں لیتا دکھائی دیتا ہے اور اندر Hypocracy کا تنڈو جاری ہے۔''

اسلم بدر کے اس تجزیے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نئے عہد میں افسانوں نے اپنے موضوعات بدلے ہیں اور انسان کو درپیش نئے مسائل سے روبرو کرایا ہے افسانہ کے موضوعی افق کو وسعت دینے والوں میں زیادہ تر وہ فنکار ہیں جن کا تعلق شاید سماجی اور سائنسی علوم سے ہے۔

ثالث میں نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ دونوں میں مدیر کا حسن انتخاب نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑا اچھا گوشہ مہدی علی کا ہے جن کا تعلق محلّہ اسانند بھاگلپور سے تھا اور جنھوں نے پٹنہ یونیورسیٹی سے انگریزی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈی جے کالج مونگیر میں انگریزی کے لکچرر تھے۔ یہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ فکشن نگار اور بہار قانون ساز کونسل کے سابق چیئر مین پروفیسر جابر حسین کے خسر محترم بھی ہیں۔ ان کے بارے میں واقفیت بہت کم لوگوں کو ہوگی کہ وہ انگریزی ادب کے استاد تھے مگر اردو شعر وادب کا شستہ اور شائستہ مذاق رکھتے تھے۔ رنگ حنا، برگ حنا، وسیلہ نجات ان کی تصانیف ہیں۔ اس گوشہ میں پروفیسر جابر حسین، شفیع مشہدی، ڈاکٹر سہیل، اقبال حسن آزاد نے مضامین تحریر کئے ہیں اور اپنی یادوں اور ان کے فن کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔ وہ یقیناً غزل کے رموز سے واقف فن کار تھے۔ مگر ہماری نسل مہدی علی سے کم ہی واقف ہے۔ یہ اتنے اچھے شاعر تھے کہ ان کے حوالے سے بہزاد فاطمی نے لکھا ہے کہ:

''پروفیسر مہدی علی کی کلاسکی شاعری معتبر اور صالح روایتوں کی امین ہے۔ شاعری، ادب وثقافت ان کی وراثت میں شامل ہے۔ مہدی علی کو زندگی جس رنگ اور جس کیفیت میں ملی اس کا اظہار ان کی غزلوں میں ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنے سفینہ غزل کو بحر حیات کے تموج سے دور نہیں رکھا۔ مہدی صاحب صنف سخن کے مخصوص مزاج سے اچھی طرح باخبر ہیں اور اس لیے نھوں نے اپنی خاندانی وراثت و روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں ذاتی فکر وفن سے گرانقدر اضافے کیے ہیں۔ ان کے یہاں لب ولہجے کی متانت وشائستگی بھی ہے اور رفعت خیال بھی، عصری آگہی کا شعور بھی ہے اور سلیقہ سخن آرائی بھی۔ ناقدانہ

بصیرت بھی ہے اور جذبات کی حرارت بھی۔ الفاظ کا حسن کارانہ استعمال بھی ہے اور ندرت کلام بھی۔''

یہ گوشہ بہت ہی قیمتی ہے۔ ایسی شخصیتوں سے روشناس کرانے کا عمل جاری رہنا چاہیے کہ ہمارے یہاں اپنے بزرگوں کو فراموش کرنے کا سلسلہ سا چل پڑا ہے۔ رسالہ کا مہمان اداریہ مشرف عالم ذوقی نے لکھا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ تخلیقی کائنات میں بڑی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ انھوں نے نئے عہد میں کچھ اچھے افسانہ نگاروں کے نام بھی گنوائے ہیں اور کچھ نوجوان اور نئے قلم کاروں کی تخلیقی صلاحیتوں اور توانائیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ ورنہ آج کل اردو کے زیادہ تر فن کار Self-Indulgent ہوتے ہیں یا Monomania کے مریض۔ انھیں ادب کے آسمان پر اپنے سوا کوئی اور ستارہ نظر ہی نہیں آتا۔ رسالے کے مدیران اقبال حسن آزاد، ثالث آفاق صالح اور نظام الدین قاسمی مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے کساد بازاری کے اس دور میں ایک ادبی رسالہ نکالنے کی جرأت کی۔ خدا کرے اس رسالہ اشاعتی تسلسل قائم رہے۔ 'ثالث' کا یہ شمارہ شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر بہار سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ رابطہ کے لئے 09430667003۔

◀◀ ● ▶▶

بشکریہ، عالمی سہارا، دہلی
۲۶/اکتوبر ۲۰۱۳ء

(۲)

● سلمیٰ جیلانی

میں سوچتا رہتا ہوں دماغوں میں نہیں جو
وہ کونسا ہے پھول کہ باغوں میں نہیں جو

یوں تو یہ نصیر احمد ناصر صاحب کی اس غزل کا پہلا شعر ہے جو ادبی جریدے ثالث کے پہلے شمارے کی زینت ہے مجھے یہ مجلّہ اس شعر کی مجسم تفسیر نظر آیا، یعنی ایک ایسا نادر پھول جس کی خوشبو بیک وقت دنیا کے سترہ ملکوں میں پھیل رہی ہو جناب اقبال حسن آزاد سے میرا تعارف فیس بک کے عالمی افسانہ فورم کے ذریعے ہوا اگرچہ ان کی تخلیقات کو باقاعدہ طور پر نہیں پڑھا لیکن ایک ہی افسانے کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوا کہ وہ اردو ادب کے نمایاں ناموں میں سے ایک ہیں۔ اسی فورم کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ثالث نامی ادبی جریدے کے اجراء کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے کہ اس میگزین کی کچھ جھلک ان کے فیس بک پیج کے ذریعے دیکھنے کو مل جائے، اور ایک بلاگ پر جناب محمد حامد سراج کا افسانہ پانچ روپے کا متروک نوٹ بھی پڑھنے کو مل گیا جس سے اس مجلّے کے اعلیٰ معیار کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا مطالعہ ایک دلچسپ مشغلہ ہوگا۔ مجھے اس بات کی قطعی امید نہ تھی کہ دنیا کے اس دور دراز خطے تک اس کی ترسیل ہوگی

لیکن کل صبح جب دروازے پر دستک ہوئی اور کوریئر سروس والے نے ایک کتاب میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے دستخط طلب کئے تو ایک خوش گوار حیرت نے مجھے گھیر لیا۔ یہ اقبال حسن آزاد صاحب کے میگزین 'ثالث' کا پہلا شمارہ تھا جو اس وقت میرے زیر مطالعہ ہے۔ مدتوں ہوئیں اردو کے کسی ادبی میگزین کو کتابی شکل میں پڑھے ہوئے۔ اب تو بس جو کچھ کمپیوٹر پر پڑھنے کو مل جاتا ہے اسی پر گزارہ ہے۔ لیکن اس میں وہ لطف کہاں جو برآمدے میں بیٹھ کر بہار کے موسم کا نظارہ کرتے ہوئے اردو افسانوں اور نظموں کو پڑھنے میں ہے۔ یاد رہے یہاں آج کل بہار اپنے عروج پر ہے یعنی نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے باسی باقی دنیا سے الٹ موسموں کو برتتے ہیں۔ خیر قصہ مختصر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ ایک عرصے بعد میں اپنی پرانی خواہش یعنی بستر پر دراز ہو کر اردو کی کسی کتاب کا مطالعہ کر سکوں گی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کیوں کیا وہاں کتابیں نہیں ہوتیں یا کم از کم انگریزی میں تو ضرور ہوتی ہونگی تو اس کے لئے عرض ہے کہ جو مزہ اپنی زبان میں ادب کا مطالعہ کرنے میں ہے وہ کسی اور زبان میں کہاں؟ میں اس میگزین کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ یہ ایک عہد ساز مجلّہ ثابت ہوگا کیونکہ ابھی ایسا کہنا قبل از وقت ہوگا لیکن پھر بھی جس پائے کا ادبی مواد اس میں شامل کیا گیا ہے اگر اس معیار کو آگے بھی برقرار رکھا گیا تو پوری امید ہے کہ اردو ادب کے عالمی افق پر جگمگانے والا یہ نیا ستارہ آگے چل کر اور بھی تابندہ ہوگا۔ یوں تو اس مجلّے کے اجزائے ترکیبی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اپنے ٹائٹل پر لکھے اس جملے کا بھرپور حق ادا کیا ہے یعنی 'ثالث' واقعی زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان ہے۔ اس سلسلے میں ایک تجویز میری طرف سے بھی پیش خدمت ہے۔ اگر اردو ڈرامے پر بھی کچھ حصہ مختص کیا جائے اور جناب اقبال حسن خان صاحب کے تربیتی مضامین اس میں شامل ہوں تو 'ثالث' اور بھی ہمہ جہت ہو جائے گا۔ آخر میں یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ اس دور پرآشوب میں جب ہر طرف اپنے مفادات کی جنگ جاری ہے، ایک ایسا محنت طلب کام، جس میں بظاہر مالی فائدے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اردو ادب کے لئے کوئی نہایت مخلص اور محبت بھرا دل رکھنے والا انسان ہی کر سکتا ہے اور اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ اقبال حسن آزاد صاحب اور ان کے جواں سال صاحب زادے ثالث آفاق نے نا صرف ایک معیاری ادبی جریدے کے اجراء کا بیڑا اٹھایا بلکہ اسے سترہ ممالک کے باذوق قارئین تک کتابی شکل میں پہنچا کر اسے بلاشبہ اردو کے عالمی میگزین کا شرف عطا کیا جس کے لئے میری طرف سے ثالث کی پوری ٹیم کو بہت داد اور دلی دعائیں، اس کے ساتھ ہی جن ساتھیوں کی تخلیقات اس مجلّے میں شامل ہیں ان کو بھی بہت مبارک باد اور بہت سی دعائیں۔ خدا تعالیٰ نہ صرف اس میگزین بلکہ پورے اردو ادب کو کامیابیوں کے نئے افق نئی بلندیاں عطا کرے آمین۔

◀◀ ● ▶▶

(۳)

● علی حیدر ملک

کتابی سلسلوں میں ایک اور سلسلے کا اضافہ ہو گیا ہے اور یہ اضافہ ہے سہ ماہی 'ثالث'.....جس کے مدیر ثالث آفاق صالح، مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد اور نائب مدیر نظام الدین قاسمی ہیں۔ مندرجات میں مختلف اصناف کی نگارشات شامل ہیں، جن میں افسانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ افسانہ نگاروں میں علی اکبر ناطق اور حامد سراج کے نام جانے پہچانے ہیں۔ بقیہ نام نسبتاً نئے ہیں۔ غزلوں کے حصے میں عرفان ستار اور نصیر احمد ناصر نام کے نام نمایاں ہیں۔ علی اکبر ناطق، احمد سہیل اور تبسم فاطمہ کی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک گوشہ مہدی علی مرحوم (۱۹۳۱ء تا ۲۰۰۷ء) کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر 'ثالث' ایک اچھا کتابی سلسلہ ہے۔ بشکریہ 'اخبار جہاں'، کراچی (۲۸ اکتوبر تا ۳ نومبر ۲۰۱۳)

(۴)

● ڈاکٹر افشاں ملک

'ثالث' کا پہلا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اپنے تاثرات قلم بند کرنے سے پہلے میں اس رسالے کے مدیران محترم اقبال حسن آزاد، ثالث آفاق صالح اور محترم نظام الدین قاسمی کو مبارکباد پیش کرتی ہوں کہ انہوں نے اپنی عملی کاوشوں سے یہ ادبی اور معیاری رسالہ اردو دنیا میں پیش کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان میں اردو رسائل شائع نہیں ہو رہے ہیں بہت سے ادبی رسائل بازار میں موجود ہیں لیکن کوئی کسی لابی سے وابستہ ہے اور کوئی کسی خاص علاقے سے..... پھر معیاری ادب کا بھی معاملہ اپنی جگہ ہے۔ جان پہچان کے لوگوں کی تخلیقات معیاری نہ بھی ہوں تو شائع ہو جاتی ہیں، دوستی اور اقربا پروری یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

'ثالث' کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوا کہ یقیناً اب ایک ایسا اردو رسالہ اردو کی ادبی دنیا میں منظرِ عام پر آیا ہے جس کا نہ کوئی گروپ ہے نہ لابی اور نہ یہ کسی خاص علاقے کے ادب یا ادیبوں سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کے ساتھ ہی دنیا کے ڈیڑھ درجن سے زیادہ ممالک میں اردو ادب کے قارئین کے ہاتھوں میں 'ثالث' پہنچ چکا ہے۔ سرورق پر لکھا ہوا جملہ 'زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان' اندرونی صفحات پر شائع تخلیقات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پہلے شمارے سے ہی اردو ادب کا قاری اور قلم کار اس کے ادبی اور معیاری ہونے کا گواہ بن جائے گا اور یہ رسالہ بہت جلد عالمی اردو دنیا میں اپنی ایک شناخت قائم کر لے گا۔

اداریہ میں پروفیسر لطف الرحمٰن کی رحلت کی خبر پڑھ کر بہت رنج ہوا۔ اللہ پروفیسر مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ مدیر 'ثالث' کا یہ اعلان کہ اگلے شمارے میں پروفیسر مرحوم پر گوشہ شائع کیا جائیگا بزرگ ادیب کو خراج عقیدت ہے۔

مہمان اداریہ مشرف عالم ذوقی نے 'قصّہ ہے، کہانی ہے، پہیلی ہے.....' کے عنوان سے لکھا ہے۔
مشرف عالم ذوقی خود ایک بڑے فکشن نگار ادیب ہیں۔اس اداریہ میں انہوں نے کہانی کی کہانی بیان کرتے ہوئے اس کے سفر کی داستان بہت دلچسپ انداز میں رقم کی ہے اور پچھلے بارہ تیرہ سالوں کی فکشن کی تخلیقی دنیا میں کہانی کے بدلتے مزاج کو بھی انہوں نے اس اداریہ میں بہت سی مثالوں اور حوالوں سے بیان کیا ہے۔انہیں کہانی کے نئے منظرنامے میں بس مٹھی بھر نام ہی دکھائی دے رہے ہیں جو نئے فلسفوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔چند ناموں کا ذکر بھی انہوں نے اپنے اس اداریے میں کیا ہے..... بہت کچھ حقیقت بیانی کے ساتھ ہی اختلاف کی گنجائش بھی بہرحال موجود ہے۔

جدید ٹیکنالوجی کی بدولت آج دنیا گلوبل ولیج میں بدل چکی ہے، فاصلے سمٹ گئے ہیں دنیا بھر کے لوگ انٹرنیٹ کے ذریعہ ایک دوسرے سے صرف ایک 'کلک' کے فاصلے پر ہیں غیر ملکی اور دیگر زبانوں کا ادب بھی اب ادب کے شائقین کی دسترس میں ہے تو ایسے وقت میں تخلیق کار کے سامنے بھی چیلینجز ہیں۔اس کو بھی اپنے ذہن کے دریچے کھلے رکھنے ہوں گے۔تخلیق کی دنیا میں نئے آسمانوں کی تلاش ہی اسے استحکام عطا کریگی، کچھ منفرد ہوگا تبھی بھیڑ میں آواز سنائی دے گی۔مزید یہ کہ آج کا قاری بھی تیزی سے بدلتی ہوئی تکنیکی دنیا کا باسی ہے اور اس کی آنکھیں دنیا کے منظرنامے کو بخوبی دیکھ رہی ہیں تو ایسے میں ادبی منظرنامہ بھی اس کے سامنے ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب کے میدان میں قاری ہی تخلیق کا پہلا ناقد ہے.....اب قاری دوستوں اور جان پہچان والوں کے تبصرے اور تنقید پڑھ کر اپنی رائے نہیں دیتا وہ تخلیق کو اپنی فہم سے جانچتا پرکھتا ہے اور تب اسے پسند یا مسترد کرتا ہے۔ایک تنقید نگار پر تاثر حاوی ہوسکتا ہے، وہ جذبات کا شکار بھی ہوسکتا ہے لیکن صرف قاری ہی وہ آزاد اکائی ہے جو تمام تعصّبات سے پاک ہو کر فن پارے کی تفہیم کرتا ہے تو وہ یہ حق بھی رکھتا ہے کہ وہ اپنی پسند کا ادب پڑھے۔یہ بھی ممکن ہے کہ وہ منٹو اور پریم چند جیسی سپاٹ بیانیہ والی کہانیاں ہی پڑھنا چاہتا ہو۔علامتی اور تجریدی کہانیاں اور ابہام اسے پسند نہ ہو۔بیشک آج کا دور گلوبل ایشوز پر کہانیاں لکھنے کا دور ہے لیکن کیا ان موضوعات کے علاوہ دوسرے موضوعات پر لکھی گئی کہانیوں کو قاری مسترد کردے گا؟ وہ ادب کا حصہ بن سکیں گی یا نہیں....اس ادیب کی کوئی شناخت قائم ہوگی یا نہیں یہ تو وقت ہی بتائیگا.....!!!

شمارے کی تخلیقات کا آغاز حمد اور نعتیہ کلام سے ہوتا ہے۔سبھی نعوت معیاری ہیں اور رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے شعراء کرام کی محبت اور عقیدت کی ترجمانی کرتے ہوئے نعت کے مسلمہ اصولوں کو بھی پورا کرتی ہیں۔نشتر امروہوی کی نعت کا یہ شعر مجھے بے اختیار مجبور کر رہا ہے کہ میں اسے یہاں درج کردوں:

جہاں میں کتنے رسول آئے مگر نہ آیا عظیم تم سا
ندیم تم سا، فہیم تم سا، حکیم تم سا، علیم تم سا

افسانوی ادب کے حوالے سے اس شمارے میں ملکی اور غیر ملکی، نئے اور کہنہ مشق افسانہ نگاروں کے ۱۵ افسانے شائع کئے گئے ہیں جن میں چار افسانے خواتین افسانہ نگاروں کے ہیں۔

پہلا افسانہ علی اکبر ناطق کا 'جیرے کی روانگی' ہے۔یہ ایک معیاری افسانہ ہے جس میں مرکزی کردار 'جیرا' ہے اور دوسرا اہم کردار 'پیر مودے' کا ہے۔افسانہ گاؤں میں رہنے والے لوگوں کے توہمات اور کورانہ عقیدوں کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔جیرے کا کردار افسانے میں گاؤں کے لوگوں کو من گڑھت کہانیاں اور قصّے سنا سنا کر انعام واکرام پاتا ہے۔ڈھونگی پیر مودے کو گاؤں کے لوگ بہت بڑا جلالی پیر مانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ پیر کی آواز خدا کی آواز ہے اور وہ اپنے جلال سے کسی کو بھی ختم یا برباد کرسکتا ہے اس لئے اپنی ہر پریشانی کا حل انہیں اپنے پیر میں نظر آتا ہے چاہے وہ دریا میں پانی کا نہ ہونا ہو چاہے کھیتوں میں فصل کا نہ اُگنا ہو۔ان کو پیر کی بات خدا کی بات لگتی ہے۔ایک بار پیر مودے گاؤں آتا ہے اور جیرے سے قصہ سن کر اتنا خوش ہو جاتا ہے کہ اس کو منہ مانگا انعام دینے کی بات کر دیتا ہے۔ادھر جیرا بھی بہت چالاک ہے۔موقع مناسب جان کر پیر مودے سے یہ کہہ کر کہ ''حضور آپ تو اپنی کرامات سے دوسری گھوڑی بنالیں گے۔میں گدھے کی سواری سے عاجز ہو گیا ہوں اگر دیں تو اپنی سفید گھوڑی دے دیں۔'' جیرا گھوڑی لے کر پیر کے جلال کو دعوت دے کر گاؤں سے چلا جاتا ہے۔پیر مودے اسے اپنی بے عزتی سمجھتا ہے اور ایک سال کے بعد جب جیرا گاؤں واپس آتا ہے تبھی پیر مودے بھی اتفاقاً آجاتا ہے۔گاؤں کے لوگوں کا اپنے اوپر اندھے اعتماد کا فائدہ اٹھا کر ان ہی لوگوں سے جیرے کا قتل کروا دیتا ہے یہ کہہ کر کہ دریا جیرے کی قربانی مانگ رہا ہے.....اس طرح کے ڈھونگی پیر معاشرے میں آج بھی موجود ہیں اور ہر زمانے میں اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔اندھے اعتماد و جہالت کی وجہ سے معصوم عوام اپنے ہاتھوں سے انجانے میں نہ جانے کتنے ہی بے ضرر 'جیروں' کو اسی طرح کے نام نہاد پیروں کی باتوں میں آکر قتل کرتے رہیں گے۔کردار نگاری میں افسانہ نگار عروج پر ہے۔جیرے جیسے کردار اب تو معاشرے میں خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔دو تین دہائیاں پہلے تک بھی ایسے کردار موجود تھے اور ان کی روزی روٹی کا ذریعہ ان کی لن ترانیاں اور چٹخارے دار باتیں اور قصّے ہی ہوا کرتے تھے۔معاشرے سے اس طرح کے کردار چن کر افسانہ نگار نے بہت پر اثر افسانہ لکھا ہے۔یہ افسانہ پڑھتے ہوئے مجھے احمد ندیم قاسمی کی یاد آئی۔انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں اسی طرح کے کردار پیش کئے ہیں۔

دوسرا افسانہ 'پانچ روپے کا متروک نو' محمد حامد سراج کا ہے۔یہ افسانہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو حالات سے سمجھوتے کر کر کے تھک سی گئی ہے اور اپنے بیمار خاوند کے علاج اور اپنا گھر چلانے کے لیے وہ اپنا جسم بیچنا چاہتی ہے۔اسے پیسہ کمانے کا یہ ذریعہ بہت آسان اور اچھا لگتا ہے۔

افسانہ نگار نے کمالِ ہنر سے عورت کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے۔اس افسانے کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ مرکزی کردار اپنی مرضی سے خوشی خوشی اپنے جسم کا سودا کرتی ہے حالانکہ یہ فیصلہ وہ مجبوری میں کرتی ہے لیکن وہ اس کام کو برا نہیں سمجھتی اور اپنی مرضی اور پسند کا مرد ڈھونڈتی ہے۔افسانے کا انجام بہت ہی چونکانے والا ہے۔ایک گاہک کا دیا ہوا پانچ روپے کا متروک نوٹ دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آجاتا ہے اور درد کی ایک لہر اس کے وجود کو چھلنی کر دیتی ہے وہ شدّت کرب سے وہیں ڈھیر ہو جاتی ہے۔قاری پر بھی کردار کی اس کیفیت سے اداسی چھا جاتی ہے افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا افسانہ 'منزل' عامر ابراہیم کا ہے۔یہ ایک مکمل علامتی افسانہ ہے اور میرا ایماندارانہ تبصرہ یہ ہے کہ یہ افسانہ مجھ پر کھل نہیں سکا سو اس افسانے پر کوئی رائے دینا افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

افسانہ 'پہلی صف' عمر بنگش کی تخلیق ہے۔موضوع کے اعتبار سے یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو مسلم معاشرے کے اس طبقے یا ان افراد کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک طرف پورے طور سے مذہبی فرائض انجام دیتے ہیں اور دوسری طرف باقاعدگی سے حرام کاری اور گناہ کے کاموں میں ملوث رہتے ہیں۔ اپنے رعب اور دبدبے سے اللہ کے گھروں میں بھی اپنی اجارہ داری قائم کرتے ہیں۔افسانہ نگار نے اتنے اہم موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے فنّی دروبست کا پورا خیال رکھا ہے۔افسانے کا عنوان پہلی صف بہت موزوں اور انجام آنکھیں کھول دینے والا اور سبق آموز ہے۔

وحید احمد قمر کا افسانہ 'پکڑ' ایک ایسے دہشت گرد نوجوان کی کہانی ہے جسکے والد اور تین بھائیوں کی ایک بم دھماکے میں موت ہو جاتی ہے اور اس صدمے سے اس کی ماں کی بھی دل کا دورہ پڑ جانے سے موت ہو جاتی ہے۔ایک دہشت گرد تنظیم کا سربراہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمدردی دکھاتا ہے اور یہ کہہ کر کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے والد کو کس نے مارا ہے اور اسے ان لوگوں سے بدلہ لینا چاہئے اپنی تنظیم میں شامل کر کے اسے بھی دہشت گرد بنا دیتا ہے اور ایک دن اسے نماز پڑھ رہے لوگوں پر گولی چلانے کے لئے دوسرے دہشت گردوں کے ساتھ بھیج دیتا ہے لیکن یہ نوجوان نمازیوں پر گولی نہیں چلاتا کیوں کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہے، اسے لگتا ہے کہ اسکی اس حرکت سے خدا ناراض ہوگا اور اس کی ''پکڑ'' ہوگی۔افسانہ نگار نے عنوان سے بہت مہارت سے کام لیا ہے۔ایک طرف اس نوجوان کو ان انسانوں کی جان لینے کے نتیجے میں خدا کی 'پکڑ' یعنی عذاب کا خوف ہے۔دوسری طرف وہ سارے دہشت گرد جو بے گناہوں کو مار کر خوش ہو رہے تھے ان کی ہاتھوں ہاتھ ایسی 'پکڑ' ہوئی کہ جس عمارت میں بیٹھے ہوئے اس معصوم نوجوان کا مذاق اڑا رہے تھے وہ عمارت زلزلے کی زد میں آکر زمیں دوز ہو جاتی ہے اور ان سب کو اپنے سینے میں دفن کر لیتی ہے۔یہ 'پکڑ' بہت زبردست ہے۔افسانے کی بنت

بہت عمدہ زبان و بیان سادہ ہے، بہت روانی سے لکھا ہوا یہ افسانہ فنّی اعتبار سے ایک کامیاب اور اصلاحی افسانہ ہے۔

'یو ڈیم سالا' نعیم بیگ صاحب کا مختصر اور پر اثر افسانہ ہے۔افسانے کے کردار انڈو پاک کے دو نوجوان ہیں جو ایک تیسرے ملک دبئی میں روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں ایک جیسے حالات سے دوچار ہیں۔ جب ایک جگہ ملتے ہیں تو باتوں باتوں میں افسانے کے کردار اشوک کو منظور علی (دوسرا کردار) کے بھوکے ہونے کا پتہ چلتا ہے وہ بے چین ہو کر بے ساختہ ''یو ڈیم سالا! کل رات سے بھوکا پیاسا ہے اور بولتا نہیں ہے'' کہتا ہوا اس کو گلے لگا لیتا ہے۔افسانے کا یہ جملہ اس پیار و محبت کا عکّاس ہے جو سرحد و مذہب سے پرے صرف دلوں میں بستی ہے۔افسانہ نگار نے انسانیت، بھائی چارے اور اخوت کے جذبے کو ابھار کر معاشرے اور تمام دنیا کے لوگوں کو محبت کا ایک آفاقی پیغام دیا ہے۔یہ افسانہ افسانہ نگار کے تخلیقی اور فکری زاویہ نظر کا بہترین عکّاس ہے۔

'عبدل کی قسمت' فرخ ندیم کا ایک بہترین افسانہ ہے جو انگریز حکومت کے تحت غلام ملک کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔مرکزی کردار عبدل اس غلام معاشرے کے افراد کی ترجمانی کرتا ہے جس نے برسوں انگریزوں کے ظلم و جبر سہے ہیں، افسانے کا کردار عبدل جو انگریز افسر کے گھر نوکری کرتا ہے دولت اور اچھی زندگی کے لالچ میں ہر طرح کے سمجھوتے کرنے کو تیّار ہو جاتا ہے۔'دس مربعہ زمین اور نوکری میں ترقی' افسانے کا وہ جملہ ہے جو اس افسانے کی جان ہے۔پورا افسانہ اس ایک جملے سے کھل کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔عبدل کی قسمت بدلنے تک کے سفر کو منظر نگاری اور جزیات نگاری کے ذریعہ افسانہ نگار نے کمال ہنر سے طے کیا ہے۔بہت دھیرے سے ایک ناکام محبت کا اشارہ بھی افسانے میں روح پھونکنے کا کام کرتا ہے۔انگریز کا دیا لالچ عبدل کی قسمت کے ستارے کو چمکا دیتا ہے اور اس کی محبوبہ 'سگاں' کی محبت کے ستارے کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔افسانہ حسّاس قاری کے دل میں دکھ کی ایک لہر چھوڑ کر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

'خوابوں سے ڈرا ہوا آدمی' منیر فردوس کا افسانہ ہے۔مرکزی کردار ایک ہی خواب بار بار دیکھتا ہے جس سے وہ پریشان ہو جاتا ہے اور اس خواب کی تعبیر جاننے کے لئے وہ ایک مذہبی رہنما کے پاس جا کر اپنا خواب بیان کر کے رہنمائی چاہتا ہے۔دراصل یہ افسانہ ایسے نام نہاد مذہبی رہنماؤں کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے جو اپنے محدود علم، گھٹیا ذہنیت اور شاطرانہ چالوں سے معاشرے کے ایسے سادہ دل لوگوں کو بھٹکاتے ہیں جو اپنے ذاتی، سماجی، معاشرتی یا ذہنی مسائل کا جب خود کوئی فیصلہ نہیں لے پاتے تو اپنی الجھن اور پریشانیوں کے حل کے لئے بڑے یقین سے ان رہنماؤں کی مدد لیتے ہیں اور ان کی کہی ہوئی باتوں پر یہ سوچ کر عمل کرتے ہیں کہ حکم عدولی کی صورت میں ان کا ایمان خطرے

میں پڑجائیگا۔ ہر بار نا مراد اور ناکام ہوتے ہیں لیکن پھر ایسے ہی رہنماؤں سے رجوع کرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے خواب کے حوالے سے کردار کی ذہنی کیفیت کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔ افسانے کا اختتام قاری کے لئے ایک سوال بھی چھوڑ جاتا ہے!

'ایک بات ذراسی' محبت نعیم دیپال پور کی تخلیق ہے۔ عام سی زندگی، عام سے کرداروں کو لے کر لکھا گیا یہ ایک بہت خوبصورت نفسیاتی افسانہ ہے۔ ازدواجی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں اور جھڑپوں کی وجہ سے ایک شوہر کا بیوی پر غصّہ ہو جانا، بے ارادہ ہاتھ اُٹھا دینا پھر اپنی غلطی کا احساس ہوجانے پر اتنی پشیمانی ایسی جھنجھلاہٹ اور اس حد تک غصہ کہ 'میاں صاحب، سچّی کہوں!.....جی چاہتا ہے کسی کو مار دوں!!!' مرکزی کردار کی نفسیاتی باریکیوں کو بڑی چابکدستی سے مکالموں کی شکل دی گئی ہے۔ افسانے کا اختتام جن کلمات پر ہوا ہے وہ الفاظ کردار کے اس غصے کا اظہار ہیں جو دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے بس یوں ہی بولے گئے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے منفی کلمات قاری کے ذہن میں منفی تاثر پیدا نہیں کرتے۔ افسانہ نگار نے 'ایک ذراسی بات' کو لے کر مہارت سے ایک خوبصورت سا افسانہ لکھ دیا ہے۔ افسانے میں پنجابی بول چال کی کے الفاظ کا استعمال بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

علیم اللہ علیم کا افسانہ 'معرفت' ایک بے حد منفرد افسانہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اور مرکزی خیال کے اعتبار سے بھی۔ 'صفر' اور 'ایک' کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کئی مراحل سے گزرتا ہوا مرکزی کردار کئی بار خدا کے وجود سے انکاری ہوتا ہے اور کئی بار بہت شدّت سے خدا کے وجود کو محسوس کرتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی اور ریاضی کے فارمولوں سے 'صفر' اور 'ایک' کے فلسفے کو سلجھا کر یہ کردار آخر کار 'ایک' کی حقیقت تک پہنچ کر خدا کی وحدانیت کو سمجھ لیتا ہے۔ یقین کی ڈور تھامی تو معرفت کا زینہ بھی نظر آ گیا۔ افسانے کا عنوان بہت اچھا اور افسانے سے انصاف کرتا ہوا ہے۔

'وصال یا'' ناصر علی وارثی کا بارہ صفحات پر مشتمل ایک طویل افسانہ ہے۔ اس افسانے کا جتنا حجم ہے اتنا بڑا نہ موضوع ہے اور نہ واقعات کو بیان کرنے کے لئے اتنی تفصیل ضروری تھی۔ بہر حال افسانہ نگار کا اپنا طریقہ تخلیق ہے۔ افسانے میں تجسس کا فقدان ہے، کردار نگاری بھی جاندار نہیں ہے۔ محبت کی اس طویل داستان کا انجام بھی مجھے غیر فطری لگا کہ محبوبہ کے والدین اپنی بیٹی کی موت کا غم بھلا کر اس کے عاشق کی شادی خود کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں کیا؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ افسانہ نگار اس طرح کوئی پیغام دینا چاہتا ہو معاشرے کو۔

خواتین افسانہ نگاروں میں فرخندہ رضوی کا افسانہ 'دیوار' خاندانی رسم و رواج میں جکڑی ہوئی اس مجبور عورت کی کہانی ہے جس کی اپنی نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی سوچ۔ خاموش رہ کر دوسروں کے فیصلوں پر سر جھکانا اسکا مقدّر رہے۔ اس کے ''ٹھکانے'' اس کی مرضی کے بغیر طے کئے جاتے ہیں اور مرضی کے

بغیر ہی بدل بھی دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ موضوع پرانا ہے لیکن آج بھی حسّاس فنکار خاص طور پر خواتین افسانہ نگاروں کا پسندیدہ ہے۔ فرخندہ رضوی نے موضوع سے بخوبی انصاف کیا ہے۔

نورالعین ساحرہ کا افسانہ 'شبانہ کا شوہر' کا موضوع بھی بہت اہم ہے۔ یہ معاشرے کی اس عورت کی زندگی کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے جہاں عورت کا اکیلے زندگی گزارنا اس کے لیے کسی مصیبت سے کم نہیں۔ یہ عورت چاہے غیر شادی شدہ ہو، بیوہ ہو یا طلاق شدہ اس کو اپنے ذاتی مسائل سے نبرد آزما ہونے میں کوئی دشواری نہیں لیکن ہمارا معاشرہ اس کی کسی طرح کی مدد کرنے کے بجائے مسائل ہی کھڑے کرتا ہے۔ ہمارہ سماج آج بھی عورت کو ایک آزاد اکائی کی طرح قبول نہیں کر پایا ہے اس کے کردار پر ہمیشہ سوالیہ نشان لگتے رہتے ہیں۔ بہت اہم موضوع کا انتخاب کر کے نورالعین نے بڑی خوبصورتی سے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے۔ بیان کی سادگی نے افسانے کو خوبصورت بنا دیا ہے۔

'میاں جی' شاہین کاظمی کا افسانہ ہے شاہین کاظمی کو افسانہ لکھنے کا فن بخوبی آتا ہے۔ اندازِ بیان عمدہ، زبان سادہ اور سلیس ہے۔ افسانے کا اختتام ایک نفسیاتی پہلو پر ہوتا ہے۔

اس شمارے میں خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں میں موضوع کے اعتبار سے سب سے منفرد افسانہ تبسم فاطمہ کا 'جرم' ہے۔ تبسم ایک ہمہ جہت فنکارہ ہونے کے ساتھ ہی کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ جنسی موضوع پر لکھا گیا یہ افسانہ اتنا جنسی نہیں ہے جتنا نفسیاتی ہے بلکہ یوں کہہ لیں کہ جنسی نفسیات پر لکھا ہوا یہ ایک زبردست افسانہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ میاں بیوی کے ان جنسی رشتوں کو سامنے لاتا ہے جہاں ایک عورت اپنے شوہر کے ایسے رویّوں سے خوش نہیں ہے جن میں ان کا جنسی رشتہ بھی صرف ایک میکانکی عمل ہے، نہ جذبات کی گرمی ہے نہ احساس کی تازگی سب کچھ وقت اور لمحوں میں قید کر کے ازدواجی زندگی جیسے کسی فریم میں فٹ ہو کر جینے کا نام ہو وہ اپنے ازدواجی رشتے کو شوہر کی مرضی اور اسکے سرد رویّوں کے ساتھ قبول نہیں کرنا چاہتی۔ نفسیات پر گرفت، تعمیق مطالعہ اور افسانہ لکھنے کا فن بلاشبہ تبسم فاطمہ کو منفرد افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔

افسانوں کے انتخاب کے لئے مدیر 'ثالث' مبارکباد کے مستحق ہیں!

غیر ملکی ادب کے حوالے سے اس شمارے میں پریم چند کے ہم عصر سوویت روس کے انقلابی ادیب میکسم گورکی کی تخلیق کا اردو ترجمہ 'میدانوں میں' پڑھ کر لطف آیا۔ اس ضمن میں میری درخواست ہے کہ غیر ملکی ادیبوں کی نگارشات ترجمہ نگار کے نام کے ساتھ اگر شائع ہوں تو معلومات میں اضافہ ہوگا!

موجودہ عہد میں ہندوستان کے ناول نگاروں میں مشرّف عالم ذوقی اپنی ایک واضح شناخت قائم کر چکے ہیں۔ وہ ایک بڑے فکشن نگار ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں ان کے ایک ناول 'اڑنے دو ذرا' کا ایک باب شامل کیا گیا ہے۔ یہ ناول قسط وار شائع ہوگا ایسا کوئی

اشارہ تو نہیں دیا گیا ہے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو بہت سے اردو ادب کے قارئین یہ ناول پڑھ سکیں گے ۔مشرّف عالم ذوقی کے ناول اردو کے ایک بڑے حلقے کی پسند ہیں اس میں تو شک کی گنجائش ہے ہی نہیں اور ان کی ایک منفرد شناخت ہے اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

صفدر امام قادری کا مضمون 'ظفر کمالی کی رباعیاں'' شمارے میں شامل ہے ۔نہایت عرق ریزی سے لکھا ہوا یہ مضمون ظفر کمالی کے فنی اوصاف پر بہت طویل تجزیاتی مضمون ہے ۔صفدر امام قادری نے ظفر کمالی کی گونہ گوں ادبی صلاحیتوں اور تخلیقی جولانیوں کا بھرپور احاطہ کیا ہے اور اردو ادب کی مختلف اصناف میں ظفر کمالی کی تخلیقات اور خصوصی طور پر رباعی گو شاعر کی حیثیت سے ان کے کلام کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا ہے ۔صفدر امام قادری کی یہ شکایت درست اور جائز ہے کہ نہ صرف ناقدین ادب نے ان کو نظر انداز کیا بلکہ کسی اکیڈمی یا ادارے نے بھی ان کی نہ کبھی مالی اعانت کی اور نہ کسی انعام کا مستحق سمجھا۔

فنکاروں سے بے اعتنائی کوئی نئی بات نہیں ہے، کئی بڑے ادیب و شاعر ہر دور میں گروپ بازی کا شکار ہوئے اور گوشہ نشین ہو کر اس دنیا سے چلے گئے ۔ہاں کئی ایسے خوش نصیب بھی گزرے جن کو بعد از مرگ پہچانا اور سراہا گیا یہاں تک کہ حکومتوں نے بھی ان پر دو چار سیمینار کر کے اپنا فرض پورا کیا۔ہم سب کو ادیبوں اور فنکاروں کے تئیں اپنے اس غیر ذمّہ دارانہ رویّہ پر غور کر کے اس کا تدارک کرنا ہوگا۔

'اصغر گونڈوی: حیات اور صوفیانہ شاعری' شبنم افروز کا مضمون ہے ۔اردو غزل کی تاریخ میں اصغر گونڈوی کا مقام اور اس کی نوعیت متعین کرنا ذرا مشکل کام ہے ۔ان کی شاعری کا نسب نامہ مومن اور غالب سے ملتا ہے لیکن ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہ خود کسی کے مقلد تھے اور نہ آج تک کوئی ان کی تقلید کر سکا۔

شبنم افروز نے اس مضمون میں اصغر گونڈوی کے احوال و کوائف کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے ان کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے واقفیت ہوتی ہے ۔ان کی تخلیقات کا محققانہ انداز میں جائزہ لے کر مثالوں اور مختصر حواشی کے ساتھ اصغر گونڈوی کو صوفی شاعر تسلیم کرنے میں ناقدین کی آراء کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

'نیاز اختر کی کہانیوں کے اشاریئے' اسلم بدر کا مضمون ہے جس میں نیاز اختر کی کہانیوں کے مختصر جائزے کے ساتھ ان کے فن پر روشنی ڈالی ہے ۔اپنے محدود مطالعے کی وجہ سے میں نے نیاز اختر کی کوئی کہانی نہیں پڑھی ہے تو میرے خیال میں تبصرے پر تبصرہ کرنا یا کچھ بھی کہنا یا لکھنا دیانت داری نہیں ہے۔

شعری تخلیقات کا انتخاب بھی بہت چھان پھٹک کر کیا گیا ہے ۔ملک اور بیرون ملک کے شاعر

اور شاعرات کا کلام شمارے کی زینت ہے ۔غزلیں اور نظمیں دونوں ہی بہت معیاری ہیں ۔جن شعرا کا کلام شمارے میں شامل ہے وہ فکری اعتبار سے بلند اور احساسات کی لطافتوں کا حامل ہے، اظہار و بیان اعلیٰ اور الفاظ کا دروبست عمدہ ہے جمالیاتی رنگ بھی خوب ہے ۔الگ الگ سب کے کلام پر تبصرہ اس مضمون میں ممکن نہیں ہے حالانکہ شمارے کے اس شعری انتخاب کو میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا اور سراہا ہے۔

تبسّم فاطمہ اور مسرّت زماں کی نظمیں مجھے بہت اچھی لگیں۔

آخری حصّے میں مہدی علی پر گوشہ شائع کیا گیا ہے ۔ان کی ادبی خدمات، فکر و فن اور شخصیت پر کئی محترم ادیبوں کے مظامین شامل ہیں ۔ان میں پروفیسر جابر حسین کا 'غزل اور مہدی علی'، شفیع مہدی کا 'مہدی علی: ایک بہترین دوست'، ڈاکٹر سہیل کا 'ورق در ورق' اور اقبال حسن آزاد کا مضمون 'مہدی ہے جس کا نا'' گوشے میں شامل ہیں ۔خوبصورت یادوں کے حوالے سے اقبال حسن آزاد کا مضمون بہت جامع اور مفصّل ہے ۔آخر میں مہدی علی کا معیاری غزلیہ کلام شامل ہے۔

محترم اقبال حسن آزاد نے اپنی تمام ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک خالص ادبی اور معیاری رسالہ'' ثالث'' کی شکل میں اردو کی ادبی دنیا میں پیش کر کے جو عملی قدم اٹھایا ہے اس کے لئے میں ان کو دلی مبارکباد دیتی ہوں۔

◀◀ ● ▶▶

(۵)

● رضی شہاب

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان 'ثالث' کا پہلا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے ۔اس سہ ماہی رسالے کے مدیر ثالث آفاق صالح ہیں جبکہ مدیر اعزازی کے فرائض معروف افسانہ نگار اقبال حسن آزاد انجام دے رہے ہیں ۔اس شمارے کو افسانے، غیر ملکی ادب، ناول کا ایک باب، تنقید، غزلیں، نظمیں، گوشہ مہدی علی اور مکتوبات کے زمرے میں تقسیم کر کے مرتب کیا گیا ہے ۔اداریہ بہت مختصر سا ہے، ساتھ ہی پروفیسر لطف الرحمٰن کی وفات پر ملال پر ادارے کی طرف سے ایک مختصر تعزیتی نوٹ بھی شائع کیا گیا ہے ۔'قصہ ہے، کہانی ہے، پہیلی ہے...' کے عنوان سے مشرف عالم ذوقی کا مہمان اداریہ ہے جو چشم کشا اور راحت افزا ہے ۔نئی کہانی، نیا ادب، نئے تخلیق کار اور نئے منظر نامے کو انہوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔شمیم فاروقی اور محمد شفیع الرحمٰن شفیع نے حمد خداوندی کے نذرانے پیش کئے ہیں جبکہ نشتر امروہوی اور منظور قاضی نے نعت پاک سے 'ثالث' کے صفحات کو مبارک بنا دیا ہے۔

کل پندرہ افسانے اس شمارے میں شامل کئے گئے ہیں ۔علی اکبر ناطق، محمد حامد سراج، نور العین ساحرہ، منیر احمد فردوس، نعیم بیگ، فرخ ندیم اور فرخندہ رضوی کے علاوہ متعدد نئے اور پرانے لکھنے والوں کو

اس صف میں جگہ دی گئی ہے۔غیر ملکی ادب کے زمرے میں مشہور افسانہ نگار میکسم گورکی کی تخلیق 'میدانوں میں' کے عنوان سے شامل ہے، جس کے مترجم کا نام مذکور نہیں ہے۔مشرف عالم ذوقی کے ناول 'اڑنے دو ذرا' کا ایک باب ثالث کے بیس سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔تنقید کے زمرے میں تین مضامین کی شمولیت ہے۔'ظفر کمالی کی رباعیاں' صفدر امام قادری کا ایک مکمل اور لائق مطالعہ مضمون ہے۔شبنم افروز کا بارہ صفحات پر مشتمل مضمون 'اصغر گونڈوی: حیات اور صوفیانہ شاعری' بہت عمدہ ہے اور اصغر گونڈوی کی مکمل شخصیت اور ان کی صوفیانہ شاعری کے مختلف عناصر کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔جبکہ اسلم بدر نے 'نیاز اختر کی کہانیوں کے اشاریئے' کے عنوان سے ایک لائق تحسین کوشش کی ہے۔گیارہ شخصیات کی غزلیں اور چھ قلم کاروں کی نظموں کو 'ثالث' کے پہلے شمارے میں جگہ دی گئی ہے۔جن میں نصیر احمد ناصر، عرفان ستار، ساجد حمید، معراج رسول، علی اکبر ناطق، احمد سہیل، مسرت زماں، کے بی فراق اور تبسم فاطمہ وغیرہ کے علاوہ کئی اہم نام شامل ہیں۔

رسالے میں ایک گوشہ پروفیسر مہدی علی کے نام سے شامل ہے۔جس میں ان کے احوال وکوائف کے علاوہ، شفیع مشہدی، پروفیسر جابر حسین، ڈاکٹر سہیل اور اقبال حسن آزاد کے مضامین پروفیسر مرحوم کی زندگی سے جڑی ہوئی سچائیوں اور ان کی شخصیت کے دیگر عناصر کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔آخر میں ان کی چند غزلیں بھی قارئین کی نذر کی گئی ہیں۔واضح رہے کہ اس گوشے کے تمام مضامین اردو فورم مونگیر کے مجلّے 'ورق در ورق' میں شائع ہو چکے ہیں۔

نوجوان ثالث آفاق کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ پہلا شمارہ خوب ہے۔کہنہ مشق شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناقدین کی فہرست میں نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دی گئی ہے جو ایک قابل ستائش اور دانشمندانہ عمل ہے۔تنقیدی مضامین میں مزید اضافہ کیا جانا مناسب ہوگا تاہم یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ مضامین کس معیار کے ہیں؟ ورنہ دو چار معیاری مضامین ہی کافی ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

اقبال حسن آزاد کے اولین افسانوی مجموعے

قطرہ قطرہ احساس

کا دوسرا ایڈیشن

عنقریب منظر عام پر

رابطہ: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، مونگیر

تبصرے

نام کتاب: بنجر میدان (حوان زُلفو کے ناول 'پیڈرو پرامو' کا اردو ترجمہ)

مترجم: احمد مشتاق

ملنے کا پتہ: Asif farkhi, B/155, Block-5 Gulshan Iqbal Karanchi

مبصر: حمید شاہد

پرسوں مجھے آصف فرخی کی طرف سے حوان زلفو کے ناول 'پیڈرو پرامو' کا احمد مشتاق کا کیا ہوا ترجمہ 'بنجر میدان' ملا اور کل کا سارا دن اس نے گرفتار رکھا۔میکسیکو کا یہ فکشن نگار اردو دنیا کے لیے نیا نہیں ہے قبل ازیں حوان زُلفو کے افسانے 'ہم اتنے قریب' اور 'لوو ینا' کو بالترتیب آصف فرخی اور اسد محمد خان نے اردو میں ڈھالے تھے تاہم حوان زُلفو کا یہ ناول یوں بہت اہم ہو جاتا ہے کہ اس میں زندگی کو بہت گہرائی میں اور موثر اختصار کے ساتھ دیکھنے کے لیے بیانیہ کو مختلف کر لیا گیا ہے۔آپ اسے سادہ بیانیہ نہیں کہہ سکتے. میں اسے پیچ دار تو کہہ سکتا ہوں مگر یہ ایسے پیچ ہیں کہ پڑھتے ہوئے اور آگے بڑھتے ہوئے اوازوں اور یادوں کو تصویروں میں ڈھالنا شروع کر دیتے ہیں۔یہاں موت اور زندگی کے بیچ لکیر فنا ہو جاتی ہے۔ماضی اور حال میں ادل بدل سے ایک ایسی فضا متشکل ہوتی ہے کہ جس کا جادو قاری کو گرفتار رکھتا ہے۔بتایا گیا ہے کہ اس ناول سے گارسیا مارکیز اتنا متاثر ہوا کہ اس کے بعض حصے اسے حفظ ہو گئے تھے۔ٹکڑوں میں کہی ہوئی کہانی، محض کہانی کے ٹکڑے نہیں ہیں، بلکہ بیانیہ کو بدل دینے کا ایسا قرینہ ہے جس سے بالآخر کہانی مکمل ہو جاتی ہے اور اپنی تاثیر میں کسی سوگنا اضافہ بھی کر لیتی ہے۔اس بیانیہ کی تشکیل میں مصنف نے یادوں میں پڑی اوازوں، منظروں اور باتوں کو واقعات میں ڈھالا ہے۔اصوات کا تصویریں بننا اور واقعہ کا مکمل ہونا محض ٹھوس واقعیت نگاری کا شاخسانہ نہیں ہے کہ یہاں موت کی گود میں سو جانے والے بھی بیانیہ میں اپنا حصہ ڈال کر واپس جا سکتے ہیں۔یوں کہ یہ غیر حقیقی کردار حقیقت کی نئی تشریح اور کہانی کی گہری معنویت کے علاقوں سے شناسائی کے امکانات پیدا کر دیتے ہیں۔

اس ناول کا ترجمہ جناب احمد مشتاق نے کیا ہے۔ترجمہ کے لئے یہ آسان ناول نہ تھا، تاہم ان تمام مشکلات کے باوجود، جو بیانیہ میں جا بہ جا رکھ دی گئی ہیں، احمد مشتاق نے اسے اردو میں ڈھال دیا ہے۔غزل کے بہت عمدہ اور بڑے شاعر کا یہ کام بھی اس لحاظ سے بڑا ہے کہ یہ اردو والوں پر بیانیہ کے کچھ اور

امکانات کھول سکتا ہے۔ آصف فرخی نے کتاب کے آغاز میں اس ناول کا بہت بھرپور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کے مضمون کا عنوان ہے 'شہر مردہ کا ایک ناول'..... یہ مردہ شہر 'کو مالا' ہے جس کے ذکر سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار، ناول کے آغاز میں اپنی مرتی ہوئی ماں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھا ہے۔ مرنے سے پہلے اس کی ماں یہ وعدہ لے لیتی ہے کہ وہ 'کو مالا' جائے گا، اپنے باپ سے کچھ زیادہ لینے کے لئے نہیں بلکہ اتنا کہ جتنا اس کا حق تھا.....اور ان تمام برسوں کی قیمت بھی جن میں اس کے باپ نے اپنی بیوی اور بیٹے کو ذہن سے نکالے رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگتا ہے کہانی کی اور اس شہر مردہ کی گرفت قاری کے دھیان پر مضبوطی سے قائم ہو جاتی ہے۔ دیہی زندگی کا منظر اس اثر انگیزی میں اور اضافہ کرتا ہے۔ مٹی کی مہک اور بارشوں کا برسنا، پرندوں کا اُڑنا اور ان سب کے بیچ ان کرداروں سے ملاقات جن سے 'شہر مردہ' سے باہر بلکہ اس بیانیہ سے باہر ملاقات ممکن ہی نہیں ہے، اس کا بیانیہ بہت گھنا اور گھمبر ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار کے انجام کو پہنچنے پر بہ ظاہر ناول کی کہانی مکمل ہو جاتی ہے اپنے رخنے پاٹتے ہوئے مگر اس کے بعد کہانی کا بہاؤ اہم نہیں رہتا بلکہ اس کا بیانیہ اور اس میں بھرا ہوا بھید اہم ہو جاتا ہے اور اسی بھید کو کھوجنے کے لئے آپ اس ناول کو ایک بار پھر سے پڑھنا چاہیں گے۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: نئی پرانی کتابیں
مصنف: صفدر امام قادری
مبصر: پیغام آفاقی

رابطہ مصنف: 202'Abu Plaza، Ashok Rajpath، Patna-800006

صفدر امام قادری کے تبصروں پر مشتمل اس کتاب 'نئی پرانی کتابیں' کے چھپنے کی خبر میں نے جب سے دیکھی تھی تب سے اس کتاب کو پڑھنے کی خواہش میرے دل میں جاگی تھی کیونکہ میں ان کے مزاج کو جانتا ہوں اور دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں تحریروں میں اردو کی بے جا مروت کی روایت نے اس کو دھندلا تو نہیں کر دیا ہے۔ فی الحال ابھی صرف چند مضامین ہی پڑھ پایا ہوں لیکن جتنے مضامین پڑھے ہیں وہ ضرب کلیم کا اثر رکھتے ہیں۔ اردو ادب کو پرائیوٹ کھیل کود کا میدان بنا کر کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں نے جس طرح اپنے ذاتی مفاد اور بے بنیاد نام ونمود کے مزے لوٹنے کے لئے اکثر بے روک ٹوک غلط فہمیوں کے رنگین کیچڑ کی ہولی کھیلی ہے اس کی انہوں نے جس حق گوئی کے ساتھ دھلائی کی ہے اس سے میری نظر میں ان کے لئے ایک مخصوص طرح کا قابل احترام مقام پیدا ہو گیا ہے جو علم کی اس فضیلت کے احترام سے ذرا مختلف اور برتر ہے جو صرف علم کی بنیاد پر صاحب علم حضرات کے لئے ہمارے دلوں میں ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس عہد نے بھی اردو ادب میں ایک ایسے صاحب نظر کو پیدا کر رکھا ہے کہ جس کے قلم سے دروغ گو

خوف کھائیں گے اور ادبی تماشے اپنے صحیح تناظر میں یعنی تماشے کے طور پر ہی دیکھے جا سکیں گے۔ صلاح الدین پرویز اور مشرف عالم ذوقی جیسے شوقین لوگ اور ان کو استعمال کرنے والے ادبی رہنما پیسے اور نیٹ ورکنگ اور سازشوں کے ذریعہ اردو ادب کے قارئین کے درمیان غلط فہمیاں پھیلا کر ان کو بے چینی کی جس اذیت میں مبتلا کرتے رہتے ہیں اس اذیت کا صفدر امام قادری نے اپنی خوشگوار جراحی اور سچ کی ٹکیا سے ازالہ کر کے بڑی راحت پہنچائی ہے۔ جو مضامین میں نے ابھی تک پڑھے ہیں ان میں ان کی تحریروں اور ان کے ذہن اور ادبی دیانت داری اور سنجیدگی کا جو پہلو ابھر کر آیا ہے وہ پوری کتاب میں موجود اور برقرار ہوگی اس کا مجھے یقین ہے اور بجا طور پر ہونا چاہئے۔ یوں یہ کتاب کتابوں کی بھیڑ میں الماریوں اور مصنف کی فہرست تصانیف کی زینت بننے والی مزید ایک کتاب نہیں بلکہ ایک ایسی کتاب ہے جو اردو ادب کی گذشتہ دہوں کی تاریخ کو صحیح تناظر میں دیکھنے میں مدد کرنے والی ایک ایسی ناگزیر کتاب ہے جس کے مضامین کا لکھا جانا اور ان کا کتابی شکل میں شائع ہونا ضروری تھا- میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کے ہر قاری کو اس کتاب کو ایک نظر دیکھ لینا چاہئے- یہ مضامین صحت مند ادبی اور تخلیقی صحافت کی روایت کو مضبوط کرتے ہیں-

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: بقلم خود
مصنف: عبدالصمد
مبصر: اقبال حسن آزاد
رابطہ مصنف:

212-A,Rajnigandha Apartment,Sadaqat Ashram,Patna-800010

عبدالصمد کا ادبی سفر کم وبیش چار دہائیوں پر محیط ہے۔ موصوف ایک زبردست لکھاری ہیں اور ان کے قلم کی روشنائی کبھی خشک نہیں ہوتی۔ اب تک ان کے کئی افسانوی مجموعے اور ناول شائع ہو کر قبول عام کی سند پا چکے ہیں جن میں 'بارہ رنگوں والا کمرہ'، 'سیاہ کاغذ کی دھجیاں' 'میوزیکل چیئر' (افسانے) اور 'دو گز زمین'، 'مہاتما'، 'خوابوں کا سویرا'، 'مہاساگر'، 'دھمک'، 'بکھرے اوراق' (ناول) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

عبدالصمد کے افسانوں کو پڑھتے وقت سب سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک ایک لفظ کو بہت سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر استعمال کرتے ہیں نہ کہیں کم نہ کہیں زیادہ۔ ان کے یہاں آمد کم ہے اور آورد زیادہ ہے۔ گرچہ 'آمد' اور 'آورد' جیسی اصطلاحات کا استعمال عام طور پر شاعری کے لئے ہوتا ہے لیکن ادب کی دیگر اصناف میں بھی ان کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ افسانے لکھتے نہیں ہیں بناتے ہیں.....جیسے کوئی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ ان کے یہاں پلاٹ کی تشکیل پر خاص طور سے دھیان دیا جاتا ہے۔ آمد کم ہے اور آورد زیادہ ہے اس لئے ان کے بیشتر افسانے اپنی بنت میں بالکل پرفیکٹ

ہوتے ہیں۔

'بقلم خود' ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے جس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں:

(۱) بقلم خود (۲) سفر تمام (۳) مراتھن (۴) انتقام (۵) تحلیل (۶) عملی انسان (۷) توسیع (۸) خول (۹) بیمار (۱۰) بھوت (۱۱) واپسی (۱۲) لو

ان میں سے بیشتر افسانے میں مختلف رسائل میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں اور ان پر اپنی کُج مُج رائے بھی دے چکا ہوں۔ بظاہر ان کے افسانوں کے موضوعات عام سے ہوتے ہیں مگر ان کے قلم سے نکل کر وہ خاص ہو جاتے ہیں۔ ایک سیدھے سادے پلاٹ پر وہ نہایت فنکاری اور کاریگری کے ساتھ افسانہ تحریر کرتے ہیں۔ ماضی کی یادیں، آپسی نفاق، دولت کی چکاچوند میں رشتوں کی ناقدری، پیرانہ سالی کی بے بسی، جنسی ناآسودگی اور کجروی کی تصویریں۔ ان موضوعات پر تقریباً ہر اچھے افسانہ نگار نے افسانے تحریر کئے ہیں لیکن عبدالصمد کا انداز سب سے جداگانہ ہے۔ عبدالصمد اکثر مکالموں اور جملوں کو ادھورا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ انہیں قاری کی ذہانت پر پورا پورا بھروسہ ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ عبدالصمد کے افسانوں کی گہرائی اور گیرائی کو صرف ایک ذہین قاری ہی پا سکتا ہے ورنہ ایک عام قاری کے لئے یہ عام سے ہی افسانے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: یو۔ڈیم۔سالا

مصنف: نعیم بیگ

مبصر: امتیاز پراچہ

رابطہ مصنف: 8-Nayab Homes, Airport Road, Lahore Cantt ,Pakistan

نعیم بیگ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ملک سے دور رہتے ہوئے گزارا ہے اور ان کی ۱۵ سے زائد کہانیاں اور مضمون اس مجموعے میں شامل ہیں اور ''یو۔ڈیم۔سالا'' ان کے انہی تجربات کا نچوڑ ہے۔ وہ جہاں جہاں رہے بہ حیثیت ایک اجنبی جو دیکھا سو لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے اپنی غیر موجودگی میں اپنے ملک میں جو ہوتے دیکھا اسے بھی ضبطِ تحریر میں لائے۔ فاصلوں پر محیط دوریاں انہیں اپنے ملک سے جدا نہ کر سکیں۔ کہانیوں کا دائرہ پاکستان کے دیہات سے شروع ہوتا ہوا بین الاقوامی شہروں لندن اور دبئی تک پھیلا ہوا ہے۔

بیگ عالمی افلاس و غربت پر اپنی آواز بلند کرتے ہیں، معاشروں کے اندر تشدد آمیز رویوں سے لے کر سیاسی اور سماجی حالات میں گھرے ہوئے تنہائیوں اور انسانی مایوسیوں سے آلودہ مسائل پر اپنے قلم کی نوک سے نشتر چلاتے ہیں۔ ''اپنی مٹی'' ان کہانیوں میں سب سے نمایاں کہانی ہے جس میں بلوچستان میں

جاری بدامنی میں دو نوجوان خواتین کو آمنے سامنے لا کھڑا کر دیتے ہیں جنہوں نے اس زبوں حال انسانی جانوں سے کھیلتی آگ پر مبنی بدامنی میں اپنے پیاروں کو کھو دیا تھا۔ اس پسِ منظر میں وہ اس المیہ اور اسکے اندر پیدا ہوتی نفرت کو انتہائی چابک دستی سے اپنے قلم سے سامنے لے آئے ہیں۔

'ستار بھائی' ایک اور کہانی اس مجموعے کا فخر ہے جو اپنی مضبوط بنیادوں پر کھڑی ایک ہاکر کی معاشی بدحالی کی تصویر بناتی ہے جہاں وہ اپنی بیٹی کی شادی کے اخراجات کے غم میں ایک جرم کی داستان میں کردار ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور دہشت گردوں کے ہاتھوں جرم پر مجبور ہوتے ہوئے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے رقم لے بیٹھتا ہے۔

پہلی کہانی جس کے عنوان پر اس کتاب کا ٹائٹل رکھا گیا ہے پاکستان اور انڈیا کے غربت کے مارے دو اجنبی نوجوانوں کا ایک انوکھا ملاپ ہے دونوں مفلسی اور بھوک کا شکار ہیں دونوں اپنے اپنے ملکوں کو معاشی بدحالی کی بنیاد پر چھوڑ کر آتے ہیں اور پھر آسودگی کی تلاش میں عالمی بھوک کا شکار ہو جاتے ہیں۔

'آخری لمحہ' ایک اور کہانی ہے جو ایک دھوکے باز طوائف کی ہے جو اسکی محبت میں گرفتار ایک دلال کی اپنے ہی ایک دوسرے دھوکہ باز ساتھی سے جان بچاتے ہوئے اپنی گولی کا شکار ہو جاتی ہے۔

ایک اور کہانی 'پیلا اسکول' میں مصنف نے اپنی بھرپور تحریر سے معاشرے کے اندر سرائیت کرتی ہوئی نئی ٹیکنالوجی کی افادیت پر ایک گہرے فکر کا انداز اپنایا ہے اور اس خوف کی لہر کو روشنی سے معمور کیا ہے جس میں نئی ٹیکنالوجی کو ایک ضرورت کے تحت آگے لانا انتہائی ضروری ہے۔

'ریزہ چین' ایک اور کہانی ہے جو اپنے اندر ایک آفاقی اور فطری تصور کو ودیعت دیتے ہوئے ایک ایسے دولت مند شخص کے خوف کا اظہار ہے جو اپنی بڑی رقم کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک خاصی بڑی رقم ایک فقیر کو دے دیتا ہے۔ اگرچہ یہ کہانی بہت عمدگی سے لکھی گئی ہے تاہم اسکا انجام ایک بے تال کا سر نظر آتا ہے۔

'محبت آشنا' ایک اور داستان جس میں مرکزی کردار کو ایک خوبصورت لیکن ناگہانی طریقہ سے آسمان سے گری دولت مل جاتی ہے لیکن ایک نئے طریقے سے۔

اس مجموعے میں کردار اور کہانیاں متنوع اور وسیع کینوس پر پھیلی ہیں جہاں مارشل لاء قانون کی بات کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی کا رومان پروری کا انداز، اور پھر اسکول کے بچوں کا ایک وین میں حادثاتی طور پر آگ لگ جانے سے جل کر مر جانے تک کی دلخراش کہانیاں اس کا حصہ ہیں۔

بہرحال اس افسانوی مجموعے میں کہانیاں آپ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہیں اپنی فکری شروعات کے ساتھ ساتھ گو مکمل لیکن کہیں کہیں انتہائی مختصر، دلچسپ اور چونکا دینے والے انجام کے ساتھ کبھی اچانک ختم ہو جاتی ہیں۔ تاہم یہ کہانیاں دورِ حاضر کی عکاس ہیں اور انتہائی خوبصورتی کے ساتھ مصنف کی فکری اور تفہیمی سوچ کا مظہر ہیں بلکہ حساس انسانی نفسیات کے مسائل کو جس طرح کردار نگاری کے

ذریعے پیش کیا گیا ہے اور اپنی نظیر میں زندہ، فطری اور معقولیت کی درجہ پر فائز حقیقی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

تاہم اس کے ساتھ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں سے کچھ کہانیاں بہت مختصر رہی ہیں اور یوں لگتا ہے کی جلدی میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن شاید یہ ایک جرأت مندانہ اقدام ہی ماننا ہوگا کہ آج کے مصروف ترین اور تیز تر دور میں ایسی مختصر کہانیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ بھی کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان میں سے بعض کہانیوں میں کافی گنجائش تھی جہاں ان کو فطری انداز دینے کے واسطے مزید طویل لکھنا ضروری تھا اور بجائے اس کے کہ وہ بیانیہ میں نظر آتیں انہیں اپنے کرداروں سے یقین کی حد تک لے جانا ضروری تھا۔

(انگریزی سے ترجمہ: سلیم شہاب)

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: لیمی نیٹیڈ گرل

مصنف: ڈاکٹر اختر آزاد

مبصر: اقبال حسن آزاد

رابطہ مصنف: 38 Azad Nagar Jamshedpur Jharkhand

ڈاکٹر اختر آزاد زبان اردو کے ایک اہم فکشن نگار ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی۔ اردو میں اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) 'بابل کے مینار' (۲۰۰۰ء) 'ایک سمپورن انسان کی گاتھا' (۲۰۰۵ء) (۳) 'سونامی کو آنے دو' (۲۰۱۱ء)۔ علاوہ ازیں ہندی میں بھی ایک مجموعہ 'ہم کہاں جائیں.....؟' (۲۰۰۷ء) منظر عام پر آ چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک تنقیدی کتاب 'منظر کاظمی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ' (۲۰۰۷ء) بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ موصوف کا ادبی سفر زور و شور سے جاری ہے اور ان کی کئی تصنیفات جلد ہی قارئین کی خدمت میں پیش ہونے کے لئے کتابت و طباعت کے مرحلے طے کر رہی ہیں۔

'لیمی نیٹیڈ گرل' آج کے معاشرے کی داستان ہے۔ اس میں ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو خود کو ہر طرح سے ماڈرن سمجھتی ہے اور اپنی کم سن بچی کو ریٹیلیٹی شو کا حصہ بنانا چاہتی ہے تاکہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دولت اور شہرت حاصل کر لی جائے۔ اس کا شوہر ڈاکٹر ڈاکٹر کپل مشرقی اقدار کا حامل ایک شریف شخص ہے۔ اسے جب اپنی بیوی کے ارادوں کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ کسی طور پر بھی اپنے عزائم سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ تب مجبور ہو کر وہ اپنے سسرال والوں سے رجوع کرتا ہے مگر وہاں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے کیونکہ آج ہر شخص ٹی وی اور فلم کے چکا چوند میں اندھا ہو رہا ہے۔ آخر شوبھا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے اور ایک چھوٹی سی بچی 'پریتی' ریٹیلیٹی شو کا حصہ بن کر 'لیمینیٹیڈ گرل' کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ گھر کی دہلیز پھلانگ کر اسٹیج تک پہنچنے کے عمل میں پریتی وہ سب کچھ جان لیتی ہے جسے

جاننے سمجھنے اور برتنے کے لئے سن بلوغت کی ضرورت ہوتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، عزت، شہرت سب اس کے غلام بن جاتے ہیں مگر وہ اپنے گھر پر کام کرنے والے ایک غریب نوجوان سے عشق کر بیٹھتی ہے جسے ڈاکٹر کپل پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنا دیتے ہیں۔ اسی دوران ایک دولتمند پیر فرتوت اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ شوبھا اس موقع کو غنیمت جانتی ہے اور بوڑھے کی دولت ہڑپ کرنے کے لئے اس کی شادی پریتی کے ساتھ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن عین منگنی کے روز پریتی اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے اور اس کا باپ ڈاکٹر کپل اس معاملے میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ بوڑھے کو جب اس کا علم ہوتا ہے تو وہ شوبھا کو گھر سے باہر پھینکوا دیتا ہے جہاں پریتی کا ڈرائیور اسے لینے کے لئے موجود ہوتا ہے۔

ناول کے اختتام پر مصنف نے دو الگ الگ انجام دیئے ہیں۔ بقول مصنف پہلا کلائمکس ذہین قارئین کے لئے ہے اور دوسرا عام قارئین کے لئے۔ پہلا انجام تو یہ ہے کہ ڈرائیور اسے گاڑی کی چابی دے کر چلا جاتا ہے اور دوسرا انجام یہ ہے کہ وہ واپس اپنے شوہر اور بیٹی کے پاس چلی جاتی ہے۔

ناول کی زبان نہایت منجھی ہوئی، چست اور درست ہے۔ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلا ناول ہے جو میری نظروں سے گزرا۔ کہانی کی بنت، کرداروں کی پیشکش، واقعات کا اُتار چڑھاؤ..... یہ سبھی چیزیں مل کر ناول کو نہایت دلسپ اور لائق مطالعہ بناتی ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: ہم تماشا

مصنف: شفیق زادہ

مبصر: اقبال حسن آزاد

رابطہ مصنف: humtamasha@gmail.com

اردو میں مزاحیہ ادب کی روایت بہت پرانی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ 'الملح فی الکلام کالملح فی الطعام.....' یعنی کلام میں ظرافت کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو کھانے میں نمک کو۔

'ہم تماشا' جناب شفیق زادہ کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس قسم کی تحریریں مرزا فرحت اللہ بیگ اور پطرس بخاری وغیرہ لکھا کرتے تھے۔ اس وقت اس قسم کی ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریروں کو بھی مضمون ہی کہا جاتا تھا۔ سب سے علی اکبر قاصد کے مجموعے پر مقدمہ لکھتے ہوئے پروفیسر اختر اورینوی نے اس طرز کی نگارشات کو انشائیے کا عنوان دیا لیکن شفیق زادہ کی شگفتہ و شاداب تحریروں کو ہم انشائیہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ گرچہ ان میں کہیں کہیں افسانوی رنگ بھی جھلکتا ہے مگر یہ افسانے کی تعریف پر بھی پورے نہیں اُترتے لہذا مصنف نے انہیں 'گدگدی' سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی اپنے مقدمے میں یوں رقم طراز ہیں:

'زیر نظر کتاب کی تحریریں اپنی نوعیت میں افسانے ہیں، انشائیے ہیں، خاکے ہیں یا

مضامین.....اس کا فیصلہ تو ناقدین فن ہی کریں گے کہ یہ ان کا شعبہ ہے اور انہیں ہی شوبھا ہے۔ میں تو انہیں ننانوے فی صد سن کر اور بعد ازاں 'Fill in the blanks' کے طور پر ایک فی صد پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ہنستی، مسکراتی اور بقول (مصنف) گدگداتی تحریریں ہیں۔ جو لوگ ان میں فلسفہ، اخلاق اعلیٰ، اقدار بالا، فکر کی گہرائی اور ذکر کی گیرائی تلاش کریں گے، انہیں شاید مایوسی ہو، اس لئے کہ کلام میں (خواہ شعری ہو یا نثری) یہ 'عناصر خمسہ' بسا اوقات آورد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔، جبکہ شفیق زادہ آمد کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ان میں کہیں کہیں تسلسل کی کمی کا احساس تو ہوا لیکن مصنف کی تازہ کاری اور شگفتہ نگاری نے ذہن کو بھٹکنے نہیں دیا۔'

مجھے بھی ڈاکٹر معین قریشی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے۔ یہ دراصل ہنسنے ہنسانے کے لئے لکھی گئیں دلچسپ تحریریں ہیں جو ایک تھکے ہوئے ذہن کو تر و تازہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب میں کل پانچ گدگدیاں ہیں: 'پیارے میاں'، 'کاٹھ کا اُلّو'، 'بی کار ریگ اور ننھی'، 'ٹیکسی ابوظہبی' اور 'چہار درویشیں'۔ ان میں سب سے کامیاب گدگدی 'ٹیکسی ابوظہبی' ہے جس میں دو مختلف ٹیکسی ڈرائیوروں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دونوں پاکستانی ہیں لیکن دونوں کے رویئے الگ الگ ہیں۔ پہلا ناخواندہ ہے، اجڈ ہے، گنوار ہے جب کہ دوسرا پڑھا لکھا اور مہذب ہے۔ لیکن جب پہلے ڈرائیور کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ٹیکسی کے مسافر اس کے ہم وطن ہیں تو وہ چونک پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ: 'تم کریچی خواہ کا اے؟.....تم تو امارا ملک کا اے۔ تم سے کرایہ باڑا کیسے لیوے گا؟؟' اتنا کہہ کر اس نے کرایہ واپس کر دیا جبکہ دوسرا ڈرائیور نے شائستگی کے ساتھ کرایہ وصول کر لیا۔

'ہم تماشا' ایک اچھی کتاب ہے جو تھکے تھکے اور بوجھل لمحوں میں آپ کی رفیق بن سکتی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام رسالہ: روشنائی

جلد: ۱۴، شمارہ: ۵۵ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء)

مدیر: احمد زین الدین

رابطہ: A-8,Nadeem Corner, Block-N, North Nazimabad Karachi

'روشنائی' کراچی (پاکستان) سے شائع ہونے والا ایک مشہور و معروف ادبی رسالہ ہے۔ زیر نظر شمارے میں رسالے کے مدیر جناب احمد زین الدین نے اردو مصنفین کی زبوں حالی اور پبلشروں کی من مانی کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی کتاب کی اشاعت میں جتنے بھی مرحلے آتے ہیں اور اس میں جن جن لوگوں کی محنت شامل ہوتی ہے، سبھوں کو اس کی اُجرت ملتی ہے، لیکن بے چارے مصنف ہی کو، جو ان تمام کاموں کا بنیاد گزار ہے، اسے ہی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

'گلہائے عقیدت' کے تحت جمیل عظیم آبادی کی ایک حمد اور ایک نعت شامل ہیں۔ تنقیدی حصے میں سید

محمد ابوالخیر کشفی، سید انتخاب علی کمال، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر مشتاق اعظمی اور ڈاکٹر محمد تاتار خاں کے مضامین شامل ہیں۔ خواجہ جاوید اختر ایک مشہور و مقبول نوجوان شاعر تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر عشرت بیتاب نے مرحوم پر ایک اچھا مضمون قلم بند کیا ہے۔ خصوصی مطالعے کے تحت اقبال مجید نے انجم بارہ بنکوی کی غزلوں کے مجموعے 'انا کے زخم' پر ایک بصیرت افروز مضمون تحریر کیا ہے اور نجم الحسن رضوی نے اے۔ خیام کے افسانوی مجموعے 'سراب منزل' پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظموں کا حصہ نہایت وقیع ہے جس میں زہرہ نگاہ، ستیہ پال آنند، عبد اللہ جاوید، ڈاکٹر سہیل احمد زیدی، ارمان نجمی، فیصل ہاشمی، میر ظفر حسن، عاصم شہنواز شبلی، سلیمان خمار، حیات نظامی اور کرامت بخاری کی نظمیں شامل ہیں۔ افسانوی حصے میں حسن منظر، رشید امجد، شموئل احمد، یٰسین احمد اور سید سعید نقوی کے افسانے شامل ہیں جبکہ غزلوں میں کاوش عمر، حباب ہاشمی، عادل منصوری، شاعر صدیقی، عادل حیات، یوسف راہی، سہیل احمد زیدی، باقر نقوی، راحت حسین، ڈاکٹر ہربنس تصور، شگفتہ طلعت سیما، سید ابوالحسنات حقی، صدیق فتح پوری، اختر لکھنوی، پریز مظفر اور مشرف حسین محضر کی غزلیں شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بیباک صحافی، کامیاب سیاست داں اور بے مثل انشاء پرداز تھے۔ زیر نظر شمارے میں ان کا ایک افسانہ 'قربانی' شامل ہے۔ زیر نظر شمارے میں ایک گوشہ 'آئندہ' کے سابق مدیر محمود واجد مرحوم پر ہے اور خوب ہے۔ اس گوشے میں سید محمد ابو الخیر کشفی، جیلانی کامران، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر انور سدید، صبا اکرام، نجم الحسن رضوی، شفیق احمد شفیق، سائرہ غلام نبی اور خواجہ منظر حسن منظر کے مضامین شامل ہیں۔ ساتھ ہی محمود واجد کے نمونۂ تحریر کے طور پر مرحوم کا ایک مضمون 'جدید اردو نظموں میں ارضیت کے بعض عناصر'، دو افسانے 'متروک آدمی' اور 'سمتوں کا المیہ' اور ایک آزاد نظم 'لمحہ لمحہ زندگی' شامل ہیں۔ اس گوشے کے علاوہ ایک مختصر گوشہ بشیر موجد پر بھی ہے جس میں واصل ہاشمی اور محمود حسن رومی کے مضامین اور صاحب گوشہ کی تحریروں کے نمونے شامل ہیں۔ ایک جداگانہ مضمون 'پاک فوج کی سبز کتاب' (فصیح الدین اشرف) بھی شائع کیا گیا ہے۔ ایک باب بنگلہ دیش میں اردو ادب کے سلسلے میں قائم کیا گیا ہے جس میں انور فرہاد، ارشد کاکوی اور شمیم زمانوی کے مضامین شامل ہیں۔ ایک دیگر باب ترجمہ، انشائیہ، طنز و مزاح کے عنوان سے ہے جس میں سلیم آغا قزلباش کا انشائیہ 'بلبلہ' سمرسٹ ماہم کا شگفتہ افسانہ ''مفلس کی جیب' (ترجمہ: نجیب عمر) اور 'مظفر حنفی کی خوش خیالیاں/حاضر جوابیاں' (پرویز مظفر) شامل ہیں۔ 'کتب بینی' کے عنوان سے ایک باب تبصروں پر مشتمل ہے جس میں اے۔ خیام، صبا اکرام، انور فرہاد، درد چاپدانوی اور بشیر موجد نے مختلف کتابوں پر تبصرے کئے ہیں۔ 'جہان ادب' کے تحت ادبی خبریں اور وفیات شامل ہیں۔ اور آخر میں قارئین کے خطوط ہیں۔

یہ ایک قابل قدر رسالہ ہے اور اس کا مطالعہ ہر ادب نواز کے لئے لازم ہے۔

◀◀ ● ▶▶

مکتوبات

● 'ثالث' بھیجنے کا شکریہ۔مشمولات دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔آپ نے بڑی کاوش سے اچھی تخلیقات یکجا کی ہیں۔خاص طور پر گوشۂ مہدی دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔فی زمانہ کون کس کو یاد کرتا ہے۔آپ نے گوشہ شائع کر کے حق رفاقت ادا کر دیا ہے۔سارے مہدی نواز، جن میں خاکسار بھی ہے، آپ کے شکر گذار ہیں۔ہمیں اُمید ہے کہ جس حوصلے اور عزم کے ساتھ آپ نے 'ثالث' شائع کیا ہے وہ اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔میں اس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں اور ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔(جو میرے بس میں ہے)

پس نوشت: مونگیر کا ذکر آتا ہے تو میں ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہوں۔ہمارے مخلصین کے چہرے سامنے آجاتے ہیں۔بیشتر تو ساتھ چھوڑ گئے، جو باقی ہیں رب العزت انہیں خوش وخرم اور باصحت رکھے۔(آمین)

شفیع مشہدی (پٹنہ)

● زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان سہ ماہی 'ثالث' نظر نواز ہوا۔مدیر عزیز ثالث آفاق صالح کو خصوصی دعائیں۔اپنے نام کی طرح خوبصورت رسالہ کے اجراء پر ڈھیر ساری دعائیں۔مشمولات سبھی اچھے ہیں۔مہمان اداریہ میں مشرف عالم ذوقی نے متاثر کیا۔واقعی آئندہ کہانی کا بدلتا ہوا منظر نامہ کیا ہوگا، اس کا فیصلہ تو قاری کی پسند و ناپسند پر ہے مگر اس میں کہانی کار کا بھی تو اہم رول ہو گا۔شاید اسی لئے تو کہانی کا نیا منظر نامہ مٹھی بھر ناموں کے ساتھ نئے فلسفوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔'ثالث' چونکہ ایک کہانی کار کے ہاتھوں ترتیب پا رہا ہے اس لئے مجھے قوی امید ہے کہ افسانوی معیار کو اس میں ملحوظ خاطر رکھا جائے گا اور کسی قسم کی جھوٹہ بازی یا دوستداری کی پروانہ کی جائے گی۔افسانے کے فن کو پروان چڑھانا ایک افسانہ نگار کا اولین فرض ہونا چاہیے۔خاص طور سے ایسے دور میں جب اچھے افسانے انگلیوں پر شمار ہو رہے ہیں۔

'مہدی ہے جس کا نام' (اقبال حسن آزاد) افسانوی انداز میں لکھا گیا ایک جاندار خاکہ ہے۔ویسے 'گوشۂ مہدی علی' کے دیگر مضامین بھی معلوماتی ہیں اور اس ممتاز و مقبول استاد و شاعر کی یادگار

تصویریں ہیں۔بہت سارے اہم لکھنے والوں کو آپ نے جمع کر لیا ہے۔سچی بات یہ ہے کہ ابھی سب کچھ نہیں پڑھ پائی ہوں۔فرخندہ رضوی کی 'دیوار' سے گزری ہوں۔اسلم بدر کے 'نیاز اختر کی کہانیوں کے اشاریئے' دیکھ سکی ہوں۔اور بھی اچھی تخلیقات ہیں۔میں پڑھ کر بھرپور رائے دوں گی انشاءاللہ تعالیٰ آگے بھی۔غالب کے اس مصرع کے مصداق: ع

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

'ثالث' خوب سے خوب تر کی طرف جائے گا۔

ڈاکٹر قمر جہاں (بھاگلپور)

● 'ثالث' مجھے کل ہی ملا ہے۔تخلیقات کے انتخاب میں معیار اور عالمی نمائندگی کا بحسن وخوبی خیال تو رکھا ہی گیا ہے، پرانے، نئے اور بالکل نو وارد تخلیق کاروں کی نمائندگی نے ایک خوبصورت فضا قائم کی ہے۔لیکن اداریہ اور مہمان اداریہ نے مایوس کیا۔اس شمارے میں اداریہ بھرپور ہونا چاہئے تھا جو نہیں ہے۔مہمان اداریہ کسی ایسی پختہ ذہن اور باخبر شخصیت سے لکھوانا چاہئے تھا جس کی اردو کے سنجیدہ اور نیم سنجیدہ دونوں طرح کے ادب سے واقفیت ہو۔مشرف عالم ذوقی کے اس مہمان اداریئے کو دیکھ کر صاف ظاہر ہے کہ یا تو مہمان مدیر کو اردو میں لکھے جا رہے سنجیدہ ادب سے دلچسپی ہی نہیں ہے یا پھر وہ سنجیدہ ادب کو پڑھتے ہی نہیں یا سنجیدہ ادب ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔آخر اس کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ان کی ساری باتیں نیم سنجیدہ ادب کے دائرے میں گھوم رہی ہیں جس میں ان کو توقع یہ ہے کہ صحافت کی طرح ادب بھی واقعات کے شانہ بہ شانہ چلے۔اس وقت اردو میں آرہے اردو فکشن نے پورے ہندوستان میں سیمیناروں اور ایم۔فل، پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی۔لٹ کی سطح پر ریسرچ کا رخ اپنی جانب موڑ لیا ہے۔یہ سنجیدہ تحقیقات جو کچھ بتاتی ہیں یہ اداریہ اس کے بالکل برعکس ایک مایوس کن تصویر پیش کر رہا ہے۔اس وقت اردو سے باہر ہندی اور انگریزی کی سنجیدہ دنیا اردو کی کتابوں کا مطالعہ کر رہی ہے۔تو کیا یہ تصویر اس بات کا نتیجہ ہے کہ سنجیدہ ادب کا یہ دائرہ اس دائرے سے بالکل مختلف ہے جس کا مہمان مدیر نے احتساب کیا ہے۔لیکن اگر ایسا تھا تو اس بات کی وضاحت ضروری تھی۔اس اعتبار سے اداریہ اردو کی موجودہ تخلیقی صورتحال کے بارے میں نامکمل اور گمراہ کن ہے۔امید ہے کہ اگلے شمارے سے اس طرف بھی توجہ دی جائے گی۔میں مجموعی طور پر اس پیش رفت کے لئے 'ثالث' نکالنے والوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔

کچھ ناول جو گذشتہ دس پندرہ برسوں میں آئے ہیں اور سنجیدہ بحث کا موضوع بنے ان میں 'نمک' از اقبال مجید، 'برف آشنا پرندے' از ترنم ریاض، 'مہا ماری' از شموئل احمد، 'اندھیرے پگ' از ثروت النساء خان، 'دویہ بانی' از غضنفر' کہانی کوئی سناؤ متاشا' از صادقہ نواب سحر اور 'پلیتہ' خود خاکسار کا ناول۔یہ سارے ناول آج ہندوستانی معاشرے اور عالمی صورتحال کا آئینہ بن کر اُبھرے

ہیں۔ان میں فنی سطح پر جمہوریت کی جنگ لڑی جارہی ہے۔ پیغام آفاقی (نئی دہلی)

● 'ثالث' کا پہلا شمارہ موصول ہوا۔شکریہ۔رسالے پر ایک نظر ڈالتے ہی اچھا لگا۔ورق گردانی کے بعد افسانے کا حصہ دیگر سیکشن پر حاوی نظر آیا۔ممکن ہے آپ لوگوں کا افسانے کی طرف زیادہ توجہ کا ارادہ ہو۔اچھی بات ہے۔اس کے لئے افسانوں کے ساتھ اردو فکشن اور اس کے لکھاریوں پر مضامین بھی شامل اشاعت ہوں۔اس سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ پرچے کی اس حوالے سے ایک پہچان قائم ہوجائے گی۔چند چیزیں ارسال خدمت ہیں۔ صبا اکرام (کراچی)

● اب جبکہ میری زندگی کی شام ڈھلنے لگی ہے،آپ کا 'ثالث' آ گیا۔بہت خوب ہے۔امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔گو کہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں،زر سالانہ بھیج رہا ہوں۔قبول فرمائیں۔
آپ نے اس شمارے میں پاکستان کے کئی قلم کاروں کی تصاویر دی ہیں جن کی مجھے تلاش تھی۔
۲۰۱۰ء میں بیوی کی ناگہانی موت کے سبب مسلسل آزمائشوں میں ہوں۔کبھی دل پر چوٹ لگتی ہے،کبھی دماغ پر۔پچھلے دنوں چلتی موپیڈ پر اندھیرا چھا جانے سے ٹریفک کے جنجال میں Divider پر گر پڑا۔کافی دیر تک بیہوش رہا۔کان کے رستے خون بہہ گیا ورنہ Coma میں ہوتا۔فی الحال زیر علاج ہوں۔گھر سے نکلنا موقوف!
جانے کیوں برادر مشرف عالم ذوقی کی بے رخی پر مجھے بار بار افسوس ہوتا ہے۔ادب اپنی جگہ مگر انسان دوستی اپنی جگہ۔خدا ان کو ہر حال میں خوش رکھے۔میں تو کچھ گھڑی کا مہمان ہوں۔'شیش' کا شمارہ چھپے گا یا نہیں،اللہ جانے۔لکھنا پہلے ہی بند کر چکا ہوں۔ حسن جمال (جودھپور)

● پرچے میں مصاحبے،تراجم،علمی ادبی تنقید اور جدید ادبی نظریات پر مباحث شروع کریں اس سے پرچے کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا۔اور اردو ادب کا دستاویزی جواز بھی بنے گا۔'ثالث' کا زر رفاقت ارسال کر رہا ہوں۔ احمد سہیل (امریکہ)

● 'ثالث' دستیاب ہوا۔کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔رسالہ شاندار ہے اور آپ نے بہت چھان پھٹک کر ترتیب دیا ہے۔تمام مشمولات معیاری ہیں۔افسانوں میں علی اکبر ناطق کا 'جیرے کی روانگی' نے بطور خاص متاثر کیا۔مشرف عالم ذوقی کے کیا کہنے۔ان کی انفرادیت ہر جگہ اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے۔صفدر امام قادری کا مضمون 'ظفر کمالی کی رباعیاں' بہت محنت اور بہت محبت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔انہیں مبارکباد۔شعری حصے میں عرفان ستّار کی سبھی غزلیں متاثر کن ہیں۔پرویز ساحر کی غزل بھی خوبصورت ہے۔نصیر احمد ناصر،ذوالفقار نقوی اور واقف انصاری بھی پسند آئے۔میں دعا گو ہوں کہ آپ کے پائے استقلال میں کبھی لرزش نہ آئے اور یہ رسالہ زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان بنا رہے۔(آمین) فہیم جوگاپوری (سیوان)

● تعطیلات کے بعد آج کالج کھلا تو 'ثالث' کا شمارہ دستیاب ہوا۔پہلی فرصت میں ہی مکتوبات پہ نظر ڈالی اور متاثر ہوا۔دیدہ زیب سرورق اور معیاری تخلیقات کے حامل اس دستاویزی تحفے کے لے مشکور و ممنون ہوں۔بہار کے دور افتادہ مقام سے اس جریدے کی اشاعت ادبی مجاہدے سے کم نہیں۔ ارشد محمود ہاشمی (گوپال گنج)

● زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان،سہ ماہی اردو 'ثالث' مجھے قریب پندرہ روز قبل موصول ہوا تھا۔ لیکن ذاتی مصروفیت کے باعث نہ آپ کو فون کر سکا اور نہ ہی وصولیابی کی رسید ہی بھیج سکا.....مصروفیت سے فارغ ہوتے ہی پہلی فرصت میں میں نے 'ثالث' کی ورق گردانی کی، فہرست پر نظر ڈالی،اداریہ اور مہمان اداریہ پڑھا اور اس کے بعد جس صنف پر آپ نے سب سے زیادہ فوکس کیا تھا اُسے پڑھنے بیٹھ گیا۔میری مراد افسانے سے ہے۔چار افسانے پڑھ چکا ہوں۔ اس میں سے 'جیرے کی روانگی' اور 'پانچ روپئے کا متروک نوٹ' نے بے حد متاثر کیا۔آپ نے تو عالمی اردو افسانے کی ایک کہکشاں ایسی اپنے یہاں آباد کر دی ہے جو آج کل تعداد کے اعتبار سے کسی بھی رسالے میں دیکھنے کے لئے نہیں ملتی۔پندرہ افسانے،وہ بھی دنیا کے مختلف ملکوں سے۔ اس مناسبت سے آج 'ثالث' کو اردو افسانے کا گلوب کہا جاسکتا ہے۔مضمون میں ایک نیاز اختر کی کہانیوں پر اسلم بدر کی تحریر پڑھ چکا ہوں۔محنت سے لکھا ہوا مضمون ہے۔باقی چیزیں بھی معیاری ہوں گی۔ایسا میرا یقین ہے۔
آخر میں 'ثالث' نام کی مناسبت سے اگر عام مفہوم دیکھا جائے تو 'تیسرا' ہوتا ہے اور یہی تیسرا 'پہلے' اور 'دوسرے' کے درمیان 'پنچ' بن کر فیصلہ بھی صادر کرتا ہے۔یقیناً اردو ادب میں ایک 'ثالث' کی ضرورت تو تھی جو پہلے اور دوسرے کی طرفداری کئے بغیر ادب کو ادب کے نظریئے سے دیکھے اور ایک پارکھ کی طرح اس فن پارے کی قدر و قیمت کا تعیّن کرے۔یہ کام بہت آسان نہیں ہے۔اس کام میں جوکھم بھی ہے۔لیکن یہ آپ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ ادب میں ایک غیر جانب دار 'ثالث' کا رول بخوبی نبھائیں گے۔اور ساتھ ہی ساتھ میری دعا ہے کہ جس طمطراق سے آپ نے اس رسالہ کو شائع کیا ہے،زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان کہا ہے اس مقصد میں اللہ آپ کو کامیابی عطا کرے۔ ڈاکٹر اختر آزاد (جمشید پور)

● 'ثالث' موصول ہوا۔شکریہ۔آپ نے پہلے شمارے میں ہی اچھے ناموں کو یکجا کر لیا ہے۔خاص کر دنیا کی پوری اردو دنیا کو جس طرح اس میں نمائندگی دی گئی ہے،وہ قابل تحسین ہے۔کچھ چیزیں پڑھ سکا ہوں۔دھیرے دھیرے پڑھ پاؤں گا پھر آپ کو تفصیلی خط لکھوں گا انشاءاللہ۔فی الحال آپ کو بہت مبارکباد۔ صغیر رحمانی (بودھ گیا)

● 'ثالث' کا نقشِ اول دیکھ کر اس سے عمدہ اور زندہ ادب کی توقعات کی جاسکتی ہیں۔
(سلیم انصاری، جبلپور)

● جناب صبا اکرام صاحب نے آپ کے پرچے کا ایڈریس دیا تھا اور اپنا کلام بھیجنے کی تاکید بھی کی تھی سو اپنی دو غزلیں اور کتاب کا اشتہار ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے قریبی اشاعت میں شائع کر کے شکریئے کا موقع دیں گے۔ عارف شفیق (کراچی، پاکستان)

● مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ کوئی رسالہ نکال رہے ہیں۔ آج کے حالات میں کسی ادبی رسالے کا اجراء بڑا صبر آزما کام ہے۔ آپ کا عزم قابل ستائش ہے۔ خداوند عالم استقامت عطا فرمائے۔ (آمین) ایس۔ ایم۔ عباس (جونپور)

● سہ ماہی 'ثالث' کا اکتوبر- دسمبر 2013ء شمارہ موصول ہوا۔ یہ کئی لحاظ سے ممتاز ہے اور میرے لئے تو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ پہلا ادبی رسالہ ہے جو پہلی بار گھر کے پتہ پر میرے نام سے وصول کیا گیا۔ پھر اس شمارے میں پہلی بار میرا افسانہ 'پہلی صف' شائع ہوا، اور پھر یہ 'ثالث' کا بھی پہلا شمارہ ہے۔ اب، 'ثالث' پر مزید تبصرہ سوجھ ہی نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ میں بس ایک قاری رہا ہوں۔ ادب سے کہئے بس شغف اور عقیدت رہی۔ ادیبوں کو اچھا جانتا ہوں اور تخلیق کاروں کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ اچھا یوں کہ وہ سلیقہ جانتے ہیں اور عزت اس واسطے کہ تخلیق کرنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ ادب سے تعلق بھی تب کہئے، یا کتب کے ذریعے رہا، لائبریری چلے گئے اور چونکہ نئے دور کے انسان ہیں تو یہ برقی آلات ہمارا ذریعہ ہیں۔ میں چونکہ ادب کے کوچے میں بالکل نیا ہوں تو تکنیکی باتوں سے بالکل بھی واقف نہیں۔ رسالے کے تکنیکی پہلوؤں پر بات کرنے کو کئی فاضل لوگ ہیں۔ میں بس اپنے دل کا حال کہہ سکتا ہوں، سو عرض حال ہے۔ معاملہ یہ ہوا کہ کوئی سال بھر پہلے جب اردو میں قریباً چار سال تک بلاگ (ڈائری کہہ لیجئے) لکھتے لکھتے بور ہو گئے تو سوچا کہ کیوں نہ کچھ سنجیدہ لکھا جائے۔ سلیقے سے کچھ کہا جائے اور بات یوں کہیں کہ لوگوں کو پسند آئے۔ کہانی لکھنے کی سوجھی اور پھر یوں تجربات شروع کر دیئے۔ اس سے پوچھو، وہاں سے جانو، یہ پڑھ لو، وہاں کہانی کی تعریف لکھی ہے۔ آج کوئی محفل سجی ہے جس میں فلاں صاحب خاصے مایہ ناز ادیب ہیں، ارے یہاں تو ادب میلہ سجا ہے تو چلو رنگ دیکھتے ہیں۔ میاں کرداریوں لکھو کہ چلتا پھرتا نظر آئے، ہے ہے یہ کیا کر رہے ہو، ادب بھلا ایسا لکھا جاتا ہے؟ میاں تیار رہو کہ تم نے ادب کی صنف میں ہاتھ ڈالنے کا دعویٰ کیا ہے، یار لوگ تمہاری تحریروں کے چیتھڑے تک باقی نہیں چھوڑنے والے، تم بس دلبرداشتہ مت ہونا۔ قصہ مختصر سال بھر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادب جیسے نشے کی طرح میری نس میں دوڑنے لگا۔ سلیقے سے سنجیدہ لکھنے کی جیسے لت پڑ گئی۔ دس افسانے جن میں سے پہلے

پہل بس تجربات ہیں اور بعد تھوڑی کامیابی کہوں گا، اتنے ہی لکھ سکا اور مزید لکھنے کے لئے سنجیدگی سے خیالات کو جمع کرتا رہتا ہوں۔ سو کہوں تو میں اب رکنے والا نہیں ہوں۔

بات 'ثالث' کی ہو رہی تھی۔ چونکہ میں یہاں وارد ہو چکا ہوں تو بات صرف کتب، لائبریری تک ٹکنے والی نہیں ہے۔ بلاگ تو یہ ہے نہیں کہ بھیا یوں لکھا اور جوں کا توں چھاپ دیا۔ کسی نے واہ واہ کی، دو ایک لعن طعن کر کے نکل گئے اور میں یہاں اگلی کھچڑی پکا رہا ہوں تو کوئی پروا نہیں۔ چونکہ میں نو وارد ہوں تو اس کوچے میں دیکھ بھال کے چلنا ہوگا۔ یہاں ہر شخص مجھ سے بڑھ کر فاضل ہے۔ خیر، چونکہ ہم برقی دور کے باسی ہیں تو رابطے خاصے آسان ہو چکے ہیں۔ ایک دفعہ ایک اشتہار نظر سے گزرا کہ بھارت کے شہر مونگیر سے ایک ادبی رسالہ جاری ہونے جا رہا ہے جس کے لئے نگارشات درکار ہیں۔ خوب سوچا، اپنے خیر خواہ ریاض شاہد صاحب سے باتوں باتوں میں ذکر کر ڈالا اور یوں تذبذب میں اقبال صاحب کو دو افسانے 'پہلی صف' اور 'ناٹکا' اور ایک خاکہ چوکیدار کا ارسال کر دیا۔ ادب بہت عجب شے ہے۔ ایک دھڑکا لگا رہتا ہے۔ میرے بلاگ کے قارئین خوب ہیں۔ ایسا ویسا بھی کہہ دوں تو کوئی بات نہیں۔ فیس بک پر کچھ بھی لکھ ڈالوں تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یقین جانئے کہ علی اکبر ناطق صاحب کے حضور جب 'بوئے حرم' پیش کیا تھا اور اب اقبال صاحب جو باقاعدہ مدیر ہیں ان کے سامنے 'پہلی صف' اور 'ناٹکا' پیش کئے تو خاصہ سہم گیا تھا۔ علی اکبر ناطق نے خوب مشورے دیئے تھے، لتّے بھی لئے، سمجھایا بجھایا بھی اور دوسرے کئی دوستوں نے بڑی نوازش کی تو 'پہلی صف' جیسا لکھ پایا تھا اور اقبال صاحب نے اسے اپنے ادبی رسالے 'ثالث' کے پہلے ہی شمارے میں چھاپنے کا عندیہ دے دیا۔ صاحب بات یہ ہے کہ کسی ادبی رسالے میں چھپ جانے، مدیر کے ڈیسک سے پار ہو جانے اور میرے جیسے ادب کے کوچے میں ایک بے ادب کو گر کوئی اپنے خالص ادبی رسالے میں جگہ دے گا تو یہ میرے لئے امتیاز کی ہی بات ہے کہ نہیں؟

'ثالث' کا پہلا شمارہ موصول ہوا۔ اس کے لئے قریب کوئی تین ماہ انتظار کیا۔ گھر والوں کو دکھایا، فیس بک پر دوستوں سے بانٹا اور اب فرصت سے موقع ملتا ہے تو ہتھ بیگ سے نکالتا ہوں تو ایک ایک باب، افسانہ در افسانہ، مضامین اور غزل، نظموں کو توجہ سے پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ 'پہلی صف' کا جیسے میں نے اپنا قصہ بیان کیا ہے، اس شمارے میں موجود ہر تخلیق کے پیچھے ایسی ہی کوئی کہانی موجود ہے۔ 'ثالث' کو توجہ سے تھامتا ہوں کہ یہ پہلا شمارہ اقبال صاحب کے لئے بھی ان کی زندگی کا خاصہ اہم واقعہ ہے جیسا کہ میرے لئے کسی سنجیدہ ادبی رسالے میں 'پہلی صف' کا چھپنا ہے۔ اقبال صاحب کو تہہ دل سے 'ثالث' کی اشاعت پر مبارکباد اور مجھے؟ میں اپنی اس کامیابی کو اپنے بلاگ 'صلہ عمر' کے تمام قارئین کے نام کرنا چاہوں گا کہ ان کی محبت نے مجھے یوں اس طور کھڑا

ہونے کی جرأت عطا کی ہے۔ عمر احمد بنگش (مانسہرہ، پاکستان)

● سہ ماہی 'ثالث' کا اولین شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں۔ معتبر قلمکاروں کے ساتھ نئے قلمکاروں کو جگہ دے کر آپ نے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ اس سے نئے قلمکاروں کو حوصلہ بھی ملے گا اور زبان وادب کی راہیں بھی کشادہ ہوں گی۔ مشمولات سبھی لائقِ تحسین ہیں۔ اس میں شامل سبھی ادیبوں اور شاعروں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مختصر یہ کہ یہ نقشِ اول کافی پسند آیا۔ اس کی تہذیب وتدوین سے آپ کی صحافتی سوجھ بوجھ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ 'ثالث' جلد ہی ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنالے گا۔ اس معیاری شمارے کی پیش کش کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

'ثالث' کے لئے اپنی چند شعری تخلیقات پیشِ خدمت ہیں۔ پسند آئیں تو شاملِ اشاعت کرلیں۔ عنایت ہوگی۔ سعید رحمانی (کٹک)

● اقبال بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ مجھے آج ہی سہ ماہی 'ثالث' کا پہلا شمارہ ملا ہے۔ زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان 'ثالث' بہت اچھا ٹائٹل بنا ہے۔ اچھا میں اسے ایک میگزین سائز شمارہ سمجھ رہا تھا۔ یہ تو کتابی سائز میں ڈائجسٹ کی طرح ہے۔ بہت اچھا لگا۔ مضامین کے لحاظ سے آپ کا انتخاب بہت اچھا رہا۔ تقریباً ادب کی تمام اصناف شامل ہیں۔ ناول کا بھی خوب تڑکا دیا ہے اُور آل ایک کامیاب کوشش ہے۔ مبارک ہو اور اسی طرح جاری وساری رہے۔ تاہم اداریہ کے سلسلے میں عرض ہے کہ گو ذوقی صاحب نے اپنا فرض خوب نبھایا لیکن جس پائے کا 'ثالث' ہے اس کے لئے انتہائی دل جمعی کے ساتھ سنجیدہ ادب پر گفتگو کرتا ہوا اداریہ اس میگزین کی پہچان ہونا چاہئے۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے رائے دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ طبع نازک پر گراں نہ گزرے گا۔ نعیم بیگ، (لاہور، پاکستان)

● 'ثالث' کا پہلا شمارہ موصول ہوا، شکریہ۔ فطری ردعمل کے تحت ظاہر ہے کہ مجھے کونٹنٹ ہی دیکھنا تھے اور پھر میری پہلی ترجیح افسانہ۔ ماسوائے تین چار کے باقی سارے افسانے پڑھ چکا ہوں۔ واہ، کیا ہی عمدہ انتخاب ہے۔ ٹائٹل یہیں فیس بک پر دیکھا ہوا تھا، مگر رسالے پر اُس کا حسن اور بھی دوچند ہو رہا تھا۔ اور پھر ایک بالکل نیا انداز بھی دیکھنے کو ملا۔ جی ہاں یعنی افسانہ نگار کا پورا پتہ اور ساتھ میں تصویر بھی۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ افسانوں کا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔

مگر یہ کیا! آپ نے اپنا کوئی افسانہ تو دیا ہی نہیں..... کہیں محض اس لئے تو نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے، لو جی مدیر ہیں تو اپنا افسانہ کیوں نہ چھاپیں گے بھلا..... مگر آپ کے اپنے افسانے کا وہاں موجود نہ ہونا میرے خیال میں ایک بہت بڑی کمی ہے، جو کم از کم مجھے تو بہت کھلی ہے۔ افسانوں

میں جناب عامر ابراہیم کا علامتی افسانہ 'منزل' objective اور subjective دنیاؤں کے تضادات اور حقائق پر بہت اہم افسانہ ہے۔ جناب حامد سراج صاحب کا افسانہ 'پانچ روپے کا متروک نوٹ' اچھا افسانہ ہے۔ لیکن اس کا کلائمکس مجھے کچھ غیر منطقی لگا۔ وحید احمد قمر صاحب کا 'پکڑ' ان کے روایتی انداز کا افسانہ رہا۔ نور العین ساحرہ کا 'شبانہ کا شوہر' بہت اچھا افسانہ ہے، جس میں ساحرہ کی گرفت تمام شعبوں پر کافی مضبوط محسوس ہوئی۔ منیر احمد فردوس صاحب نے اپنے افسانہ 'خوابوں سے ڈرا ہوا آدمی' میں اوہام اور اُن کے لامتناہی سلسلے پر بہت اچھا مضمون باندھا ہے۔ جناب نعیم بیگ کا 'یو ڈیم سالا' بھی خوب ہے۔ جناب فرخ ندیم کا 'عبدل کی قسمت' تاریخی تناظر میں لکھا گیا ایک اہم افسانہ ہے۔ محترمہ تبسم فاطمہ کا 'جرم' تمام انتخاب میں بہت ہی منفرد افسانہ ہے، جس میں ازدواجی زندگی کے حوالے سے بدلتے احساس اور نئے ہویدا ہوتے شعوری انکشافات پر عورت کے نقطہ نظر سے بہت بھرپور طور پر لکھا گیا ہے۔ باقی افسانے اور دیگر مضامین، غزلیں اور نظمیں ابھی پڑھنا باقی ہیں۔ مجموعی طور پر پہلا ایڈیشن بہت کمال کا ایڈیشن رہا ہے کہ ہے۔ ہاں اداریہ کچھ مطمئن نہ کرسکا۔ شاید کسی عجلت کی وجہ سے۔ امید ہے اگلے شمارے میں اس طرف خصوصی توجہ رہے گی۔

آخر میں ایک انتہاء مریل قسم کا شکوہ بھی اور وہ یہ کہ میں نے اپنے افسانے کا ٹائیٹل واوین میں دیا تھا، جو کہ ظاہر ہے کسی خاص تاثر کے لئے تھا۔ کاتب نے اُسے اپنی روانی وجولانی میں بغیر واوین کے ہی لکھ دیا ہے۔ مگر خیر!

مطالعہ جاری ہے، 'ثالث' کی کاپی کے لئے آپ کا بہت ممنون ہوں۔ محمد نعیم (دیپالپور، پاکستان)

● 'ثالث' کے توسط سے آپ کی ذرہ نوازی پر ممنون ہوں۔ اس کتاب پر عالمی سہارا میں حقانی القاسمی صاحب کے خوبصورت تبصرہ سے اس کتاب کی اشاعت کا علم ہوا اور ساتھ ہی اسکی اہمیت وافادیت کا عرفان بھی۔

رسالہ دیکھ کر آپ کی عرق ریزی کا معترف ہوں۔ مشمولات معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے دعوے کہ 'زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان..... سہ ماہی اردو..... ثالث' کی دلیل بھی ہیں۔ صفدر امام قادری، شبنم افروز اور سلیم بدر کی تنقیدی شعائیں دلوں کو منور کر گئیں۔ افسانوی کائنات سے لے کر شعری جزیروں تک کی سیاحت میں جی خوش ہوا ہے۔ مشرف عالم ذوقی صاحب کی تحریر مسحور کن بھی ہے اور حقائق کا بیاں بھی۔ ویسے ان کی ہر تحریر حقائق کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ آنے والا یہ کتابی سلسلہ خوب سے خوب تر کا عکاس ہوگا۔ عبدالوہاب قاسمی (سیوان)

● لکھنے کے معاملے میں میرا مسئلہ ذرا عجیب سا تو تھا ہی اب پڑھنے کے معاملے میں بھی وہی رفتارِ

بے ڈھنگی پاؤں پسارے ہوئے ہے۔مختلف رسائل و کتب گر چہ وقت ہے دستیاب ہیں لیکن دل ہے کہ مانتا نہیں کے مصداق قرأت کی جانب راغب ہی نہیں ہوتا۔اسے تساہل نہ کہیں تو کیا کہیں اس طرح کی کیفیت بذات خود شاعر ہی نہیں اردو کے لئے بھی نقصان دہ ہے جس کا ادراک ہونے کے باوجود اس کے تدارک کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔اب دیکھئے سہ ماہی 'ثالث' اپنی آب و تاب کے ساتھ زمانہ قبل محبت و شفقت بھرے پیغام کے ساتھ دستیاب ہو گیا تھا لیکن جبلت اس کے بالاستیعاب مطالعے کی اجازت نہیں دے رہے تھی۔

کچھ دنوں سے یہاں برسات کی آمد آمد ہے باہر نکلنا کم ہو رہا ہے۔آج رسائل کے درمیان سے قصداً 'ثالث' کو نکالا اور سرِ ورق سے لے کے پسِ ورق تک کی زیارت کی۔اولاً اس کے نام کے تعلق سے میں حیران رہا کہ آخر کیا سبب ہے کہ اس کا نام 'ثالث' ہی تجویز کیا گیا۔سرسری بات جو ذہن میں آئی وہ تو یہی تھی کی مدیر کے صاحبزادے کے نام ہی اس کے وجہ تسمیہ کا بین سبب ہے لیکن اس بین السطور نے اس امر کی جانب اشارہ کیا 'ثالث' ہی وہ امر واقعی ہے جو دو اشخاص یا اشیاء میں رابطے کا ذریعہ ہوتا ہے۔اس کا فقدان شیرازہ بندی کے عین مخالف قرار پائے گا۔اس لئے شاید ہی اس سے بہتر کوئی نام اور ہو سکتا تھا۔جہاں تک اس کے مشمولات کی بات ہے تو بیشتر حضرات نے اپنے خطوط میں اس پہ روشنی ڈالی ہے اس پہ مزید کچھ کہنا تکرار کے سوا کچھ نہیں ہاں اس کی آفاقیت کو زیرِ قلم نہ لانا انتہائی نامناسب عمل ہوگا کیونکہ رسالہ جہاں ادب کی بیشتر اصناف کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے وہیں زمینی و مکانی قید سے بالاتر ہو کے ہر اس خطے کے ادب کا احاطہ کر رہا ہے جو نسبتاً کم معروف ہیں۔اس کے علاوہ جہاں ادب کے دگجوں کو نمائندگی دی ہے وہیں نو دمیدہ غنچوں کو بھی شامل کر کے انہیں خوب سراہا گیا ہے جو مدیر کی غیر متنازعہ فکر کے ساتھ ساتھ ان کی بالغ نظری و ہمہ جہت شخصیت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔رسالہ اگر اپنے کشید کردہ خطوط پہ قائم رہا تو یقیناً اس کا مستقبل بڑا تابناک ہوگا۔رسالے کی ورق گردانی بتاتی ہے کہ اس کی تیاری میں کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیا گیا ہے اس لئے رسالہ اور صاحبِ رسالہ دونوں کی ہی زندگی ہم سب کے لئے قابلِ غنیمت ہے۔ان کی بقا کے لئے ہم سبھی کو اپنے حصے کی محنت صرف کرنی ہوگی۔خدا حامی و ناصر ہے۔

مسعود حساس (کویت)

● اللہ آپ کا اقبال اور بلند کرے۔'ثالث' آپ کی نوازش کی شکل میں ملا۔حیرت بھری خوشی ہوئی۔محسوس ہوا کہ جب ایک افسانہ نگار رسالہ نکالے گا تو ایسا ہی نکالے گا۔سب سے پہلے مبارکباد قبول فرمائیں۔

اداریہ اور مہمان اداریہ بہت غور سے پڑھا۔اچھا بھی لگا لیکن افسوس اس بات کا ہوا کہ آج میں بھی

کچھ افسانے لکھ لیتا تو میرا بھی ذکر خیر ہوتا۔اب تو عمر آ گئی ہے، کیا لکھوں؟ شاید اب ریٹائرمنٹ لے لینے میں ہی مصلحت ہے۔

افسانے کے معاملے میں آپ نے آپنے ملک پر بھروسہ نہیں کیا۔۲۲۴ صفحے کے رسالے میں ایک ساتھ ۱۵ افسانے پڑھنے کو مل جائے تو یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ترجمہ اور ناول کا ایک الگ تحفہ ہے۔'جیرے کی روانگی' میں وہی ہوا ہے جو ہوتا آیا ہے۔سچائی کو دبانے کا رواج تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔علی اکبر ناطق نے اسے خوبصورتی سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔'پانچ روپے کا متروک نوٹ' بھی اپنی اہمیت جتا گیا۔یہی ہے زندگی کا سچ۔کب اور زندگی کا کون سا سچ لفافے میں بند ہو کر سامنے آ جائے، کہا نہیں جا سکتا۔حامد سراج اس سچ سے واقف ہیں۔ہمیں بھی اس سے سبق لینا چاہئے۔'منزل' میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے۔آج کے زمانے کی سچائی اس میں بیان کی گئی ہے۔عامر ابراہیم نے اپنے انداز میں اپنی بات کہہ دی۔یہ بڑی بات ہے۔'پہلی صف' کے لوگ دراصل آخری صف میں جگہ پانے کے لائق نہیں ہیں۔عمر بنگش نے وہی دکھایا جو آج دنیا میں ہو رہا ہے۔'پکڑ' میں وحید احمد قمر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے زندگی خون خرابہ کا نام نہیں ہے لیکن انتقام کی دیوانگی کیا کرتی ہے وہ یہاں دیکھنے کو ملا۔شبانہ کے درد کو نور العین ساحرہ نے باریکی سے محسوس کیا ہے۔آج کے دور میں عورت کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔اپنی حفاظت کے لئے اسے کیا کیا سوانگ بھرنا پڑتا ہے۔

تبسم فاطمہ نے ایسی داستان بیان کی ہے جس سے آئے دن لوگوں کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔زندگی کے تانے بانے اس طرح حالات کے اسیر ہوتے ہیں کہ زندگی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔'اُڑنے دو ذرا' مشرف عالم ذوقی کے ناول کا ایک باب ہے جس میں ایک ماڈرن باپ کی کردار نگاری غضب کی ہے، جو خود کو بیٹے کے زمانے کی تہذیب کا حصہ بنانا چاہتا ہے اور بیٹے کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ناول کا ابھی سے ہی انتظار ہے۔

مضامین کم ہیں لیکن سبھی عمدہ ہیں۔صفدر امام قادری کا مضمون خاص طور پر پسند آیا۔منظوم حصہ آپ کے ستھرے ذوق کی ترجمانی کرتا ہے۔'گوشہ مہدی علی' بھی پسند آیا۔میں نے بھی ان کے مجموعے 'برگ حنا' پر مضمون لکھا تھا۔مجھے معلوم ہوتا تو وہ میں آپ کو بھیج دیتا۔

آج کے دور میں رسالہ نکالنا ایک کار جنوں ہے۔بس، 'اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے'۔'ثالث' آپ کو اس کار جنوں کے دریا سے پار اُتارتا رہے۔میرا ہر طرح کا تعاون آپ کے ساتھ ہے۔اتنے خوبصورت اور معیاری رسالے کے لئے ایک بار پھر مبارکباد قبول فرمائیں۔

مشتاق احمد نوری (پٹنہ)

● 'ثالث' کا پہلا شمارہ موصول ہوا، شکریہ! مشرف عالم ذوقی کا مہمان اداریہ کمال کا ہے۔قصہ کہانی

پہیلی موصوف ہر رمز سے آشنا ہیں اور فکشن کے حوالے سے کب کہاں کیا لکھا گیا ہے اس پر بھی موصوف کی گہری نظر ہے۔ حمد نعت پاک سب دل سے نکلی ہیں، سبحان اللہ۔ آپ چوں کہ مجموعی طور پر فکشن رائٹر ہیں سو 'ثالث' میں فکشن پر زیادہ فوکس ہے۔ ماشاء اللہ پندرہ افسانے شامل ہیں 'جیرے کے روانگی' میں نے علی اکبر ناطق کی یہ پہلی کہانی پڑھی ہے۔ بھائی یہ تو کمال کے قصہ گو ہیں۔ کیا شاندار کہانی لکھی ہے۔ جیرے کا کردار بہت عمدہ ہے لیکن اس کہانی کا توانا کردار مودے شاہ ہے۔ یہ کہانی زماں و مکاں سے پرے ہر عہد کی سیاست کی عمدہ تصویر کشی کرتی ہے۔ کہانی کا گراف بھی بہت بڑا ہے۔ یہ کہانی ہمیشہ یاد رہے گی۔

محمد حامد سراج صاحب کی کہانی 'پانچ روپے کا متروک نوٹ' بڑے سادہ انداز میں لکھی گئی بڑی پر اثر کہانی ہے۔ کہانی کے تانے بانے بھی چابک دستی سے بنے گئے ہیں۔

'منزل' بہت اچھی کہانی ہے۔ عامر ابراہیم صاحب کو مبارکباد۔ آج ہر آدمی اپنے خوابوں کو چونچ مار کر ہی جی رہا ہے۔ عمر احمد بنگش کی کہانی 'پہلی صف' بھی عمدہ کہانی ہے۔ کہانی پن بھرپور ہے۔ اکبر خان اور ان کی کشمکش زبردست ہے اور آخر میں مولوی صاحب کے بیان نے طنز کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اختتام کا کیا کہنا۔ 'پکڑ' وحید احمد قمر نے بڑی دردمندی سے رقم کیا ہے۔ دہشت گروں کے گروہ میں عظیم جیسا معصوم بھی پھنس جاتا ہے، اللہ خیر۔ نورالعین ساحرہ کا افسانہ 'شبانہ کا شوہر' بہت خوبصورتی سے لکھا گیا افسانہ ہے۔ افسانہ کا حاصل 'مجھے شاید شوہر کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس دنیا کو ہے۔ اکیلی عورت کے سنتے ہی ہوس میں لپٹی ہمدردیاں بانٹنے چلے آتے ہیں۔' اسی جملے سے پورے افسانے کا دروبست ہوا ہے۔

منیر احمد فردوس کا 'خوابوں سے ڈرا ہوا آدمی' بھی بہت عمدہ افسانہ ہے۔ حالات حاضرہ کی صحیح عکاسی کرتا ہے اور انجام تو بہت ہی خوب ہے۔ نعیم بیگ صاحب کا 'یوڈیم سالا' بہت مختصر اور بہت ہی پر اثر افسانہ ہے۔ ایک درد بھری زندہ کہانی۔ بہت بہت مبارک باد۔ فرخ ندیم کی 'عبدل کی قسمت' لاجواب ہے۔ 'جرم' تبسم فاطمہ کی ایک اچھی نفسیاتی کہانی ہے۔ محمد نعیم دیپالپوری کی 'اک بات ذرا سی' بھی بہت متاثر کرتی ہے۔ 'وصال یار' اس شمارے کی سب سے کمزور کہانی ہے۔ 'معرفت' اوسط درجے میں آئے گی۔ فرخندہ لودھی کی 'دیوار' بہت ہی عمدہ کہانی ہے اور شاہین کاظمی کی 'میاں جی' بھی یاد رہ جانے والی کہانی ہے۔

غیر ملکی ادب میں میکسم گورکی کی کہانی 'میدانوں میں' آج بھی اپنا اثر رکھتی ہے۔ اچھے ادب کی یہی پہچان ہے کہ خواہ کتنا ہی عرصہ گذر جائے اس کے اثر میں کمی نہیں آتی۔ مضامین اچھے ہیں۔ عرفان ستار، نصیر احمد ناصر اور ساجد حمید کی غزلیں بہت عمدہ ہیں۔

اک خواب نیند کا تھا سبب جو نہیں رہا
اس کا قلق ہے ایسا کہ میں سو نہیں رہا

ہر ہر شعر پر شجاع خاور مرحوم کا گمان ہوتا ہے۔ ایسا اور اتنی مماثلت میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔ عرفان ستار صاحب کو بہت بہت مبارکباد۔

علی اکبر ناطق کی 'رت جگے' کیا اچھی نظم ہے۔ محمد حامد سراج صاحب کی اس بات سے اتفاق ہے کہ علی اکبر ناطق افسانے اور نظم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ بہر حال اتنی کم قیمت میں اتنا اچھا اور اتنا سارا فکشن پڑھوانے پر آپ کا انتہائی شکریہ۔ پرویز اختر (بجنور)

● آپ نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ اتنی جلدی آپ نے جواب سے نوازا ہے۔ اللہ آپ کو سدا خوش و خرم رکھے، آمین۔ جبکہ صبا اکرام صاحب ہی کے کہنے پر میں نے ۳۰ ستمبر ۲۰۱۳ء کو 'نیا ادب' کے نام خط لکھا تھا اور اپنی تخلیقات بھی ارسال کی تھیں۔ مگر انہوں نے رسید تک دینی گوارا نہ کی۔ ان کی طرف سے بھی تا ہنوز کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ میں آپ کے احساس ذمہ داری کی دل سے قدر کرتا ہوں۔

● 'ثالث' نمبر ا پڑھ رہا ہوں۔ افسانوں کا حصہ کافی بڑا ہے جب کہ عام رسالوں میں حصۂ نظم کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اچھی بات ہے کسی نے یہ روایت تو توڑ دی۔ پاکستانی افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھ لئے۔ سبھی افسانے بہت خوب ہیں خاص کر 'پکڑ' نے کافی متاثر کیا۔ ایسا خوبصورت رسالہ نکالنے کے لئے دلی مبارک باد۔ دیپک بدکی (غازی آباد)

میری طرف سے دیگر تمام لواحقین اور رفیقان 'ثالث' کی خدمت میں سلام عرض کریں نوازش ہوگی۔ اپنا خیال رکھیں۔ سدا نغمہ برلب رہیں۔ شفیق احمد شفیق (کراچی، پاکستان)

● اپنی تخلیقات 'ثالث' کے لئے ان پیج فائل کی صورت بھیج رہی ہوں۔ میری یہ غزلیں اور نظم غیر مطبوعہ ہیں اور اس سے پہلے کہیں اور شائع نہیں ہوئی ہیں۔ تصویر کے لئے معذرت چاہوں گی۔ فوزیہ اختر (کولکاتا)

● رسالہ 'ثالث' نظر نواز ہوا۔ آپ کی ادارتی استعداد پہلے ہی شمارے میں روشن نظر آتی ہے۔ ترتیب و تہذیب کی طرفگی سے شمارہ منوّر ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا مہمان اداریہ خوب ہے۔ افسانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ علی اکبر ناطق کا افسانہ 'جیرے کی روانگی' تمام افسانوں پر سبقت لے جاتا ہے۔ ترتیب میں اسے اول مقام دے کر آپ نے میرٹ کو فوقیت دی ہے۔ شعری حصے میں عرفان ستّار اور نصیر احمد ناصر کے اشعار دل کو چھوتے ہیں۔ مضامین بھی اچھے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حُسین (مونگیر)

◀◀ ● ▶▶

وفیات

معراج فیض آبادی:

اردو کے مشہور شاعر 72 سالہ معراج فیض آبادی لکھنؤ میں رحلت کر گئے۔ وہ ایک مدت سے کینسر کی بیماری کے سبب صاحبِ فراش تھے۔

سید معراج الحق المعروف معراج فیض آبادی 1941ء میں فیض آباد کے معروف قصبے کولا شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ جامعہ لکھنؤ سے 1962 میں انہوں نے بی ایس سی کی ڈگری لی۔ سُنّی وقف بورڈ میں انہوں نے ملازمت کی اور 2003ء میں وہ اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ معراج فیض آبادی اُردو مشاعروں کے مقبول ہی نہیں بلکہ ایک وقار کے حامل شاعر تھے۔ وہ چھوٹے سے گاؤں سے نکلے اور ادب کی دنیا کو اپنی شاعری سے روشن کر دیا۔ دنیا بھر کے مشاعروں میں وہ عزت و احترام کے ساتھ بلائے گئے۔ اُن کے پسماندگان میں چار بیٹے سید احمد ندیم، سید محمد راشد، سید احمد فراز اور سید محمد رامش کے ساتھ بیوہ صالحہ خاتون ہیں

☆☆☆

بلراج کومل:

اردو کے مشہور نظم گو شاعر، افسانہ نگار اور مترجم بلراج کومل بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی پیدائش ۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء کو سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوئی تھی۔ ان کا ادبی سفر تقسیم وطن کے ساتھ شروع ہوا۔ اردو ادب کے تئیں ان کے سنجیدہ رویئے کی وجہ سے ان کا شمار صف اول کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ وہ دو بار دہلی اردو اکادمی، دہلی کے ممبر بھی بنائے گئے۔ وہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں مثلاً 'میری نظمیں'، 'رشتۂ دل'، 'اگلا ورق' (شعری مجموعے) 'آنکھیں اور پاؤں' (مختصر افسانے) اور 'ادب کی تلاش' (تنقیدی مضامین)۔ انہیں ان کے شعری مجموعے 'پرندوں بھرا آسمان' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا اور اُتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ اور اس مجموعے کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک افسانوی مجموعہ اور کئی تنقیدی کتابیں شامل ہیں۔

راجندر یادو:

ہندی کے مشہور ادیب راجندر یادو کا مورخہ ۲۸ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۴ برس کے تھے۔ ان کی پیدائش ۲۸ اگست ۱۹۲۹ء کو آگرہ میں ہوئی۔ راجندر یادو کو ادبی دنیا میں موہن راکیش اور کملیشور کے بعد نئی کہانی کی آخری کڑی مانا جاتا تھا۔ انہوں نے ناول بھی لکھا، کہانی بھی اور مضامین بھی۔ ان کی مشہور تصانیف میں 'سارا آکاش (ناول)، اندیکھے انجان پل' اور 'کُلٹا' (کہانیاں) شامل ہیں۔ ان کے ناول 'سارا آکاش' پر ایک فلم بھی بن چکی ہے۔.....

☆☆☆

ظفر عدیم

سینیئر اردو صحافی، شاعر، افسانہ نویس اور ناول نگار ظفر عدیم کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ۶۵ سال کے تھے۔ بہار کے شہر مظفر پور سے صحافت کی ابتدا کرنے والے ظفر عدیم نے تقریباً ۴۰ سال تک اردو ادب و صحافت کی خدمت کی۔ وہ تیج، فلمی ستارے، اخبار نو، ماہنامہ جرائم، بیسویں صدی اور روبی میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ آخر میں روزنامہ قومی آواز سے وابستہ ہو گئے تھے اور اس کے بند ہو جانے تک وہاں اہم ذمہ داری نبھاتے رہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے مثلاً 'بھینی بھینی مہک' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا دیوان 'دیوان ندیم' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انہوں نے کئی ناول بھی لکھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور دیگر کئی رہنماؤں کی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ ان کی تدفین اوکھلا کے بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ہوئی جس میں اردو برادری کی نامور شخصیات موجود تھیں۔

☆☆☆

شکیب ایاز:

اردو کے مشہور شاعر اور ادیب پروفیسر شکیب ایاز بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ نثر میں 'پرویز شاہدی.....ایک مطالعہ'، 'فرید ملت' اور 'دیون راسخ' اور رسالہ 'امانت' کا حضرت عماد الدین قلندر نمبر اور 'صبح نو' کا گوشۂ ثاقب ان کے مرتبۂ علمی کی یادگار ہیں۔ وہ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ ادارہ ان کے غم میں سوگوار ہے۔

☆☆☆